مقالات

پروفیسر عبدالقیوم رحمۃ اللہ علیہ

جلد اوّل

علمی و تحقیقی

ترتیب

ڈاکٹر محمود الحسن عارف ٭ میجر (ر) زبیر قیوم

ناشر

المکتبۃ السلفیۃ

شیش محل روڈ، لاہور ۵۴۰۰۰

مقالات
پروفیسر عبد القیوم رح

ترتیب

ڈاکٹر محمود الحسن عارف ● میجر (ر) زبیر قیوم

جلد اوّل

ناشر
المکتبۃ السلفیۃ
شیش محل روڈ، لاہور ۵۴۰۰۰

131254

ناشر ———— المكتبة السلفية

تاریخ ———— اکتوبر ۱۹۹۷ء

مطبع ———— زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

انتساب

مرحومہ بیگم پروفیسر عبدالقیوم کے نام

(۲۴ دسمبر ۱۹۲۰ء - ۲۱ فروری ۱۹۹۷ء)

جن کی رفاقت نے مرحوم کی اجتماعی و انفرادی

زندگی کو خوشگوار بنایا

مرتب

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عرضِ ناشر

مقالات پروفیسر عبدالقیوم" کی اشاعت مطبوعات "المکتبۃ السلفیۃ" میں الحمدللہ ایک وقیع علمی اضافہ ہے/

محترم پروفیسر صاحب علمی دنیا، خصوصاً حاملین علوم عربیہ و اسلامیہ کے حلقہ میں محتاج تعارف نہیں۔ ان کے سیکڑوں شاگرد تعلیم، تدریس اور تحقیق کے میدان میں مصروف عمل ہیں۔ لاہور میں نصف صدی سے زیادہ انہوں نے تعلیم و تعلم کی زندگی گزاری۔ وہ اصحاب علم کے قدر شناس بھی، علم دوست اور علم پرور بھی تھے۔ طبعاً خلوت گزیں اور گوشہ نشینی کا مزاج رکھتے تھے ان کا حلقہ احباب شاید اتنا زیادہ تو نہ وہ لیکن وہ اصحاب علم و فضل پر ہی مشتمل تھا/

علمی زندگی کے علاوہ ان کی توجہ، محبت اور خدمت کا مرکز کالج کی سرگرمیوں مقالات نویسی کے علاوہ مسجد مبارک تھی۔ جس کی وہ بے لوث خدمت کرتے رہے اور جس کے ماحول کو "انہوں نے"، عام مساجد سے مختلف حتی الامکان علمی اور سنجیدہ رکھا جو بفضلہ تعالیٰ اب بھی ان کا صدقہ جاریہ ہے۔ یہ گرانقدر علمی و تحقیقی مقالات انہوں نے زندگی کے مختلف ادوار میں تحریر فرمائے۔ ایک جلد تو وہ ترتیب دے بھی چکے تھے کہ عمر نے وفا نہ کی۔ اب وہ جلد اور ان کے دیگر بکھرے ہوئے مضامین اور بعض غیر مطبوعہ مقالات ان کے شاگرد محترم ڈاکٹر محمود الحسن عارف اور

پروفیسر صاحب مرحوم کے بیٹے برادرم میجر (ر) زبیر قیوم کے (شوق و تعاون) سے دو جلدوں میں ترتیب دے دیئے ہیں۔ ایک جلد میں علمی و تحقیقی مقالات ہیں اور دوسری میں مضامین و خطبات ہیں/

اس خالص علمی و دینی خدمت کا موقع دینے پر ہم ان کے صاجزادگان خصوصاً میجر (ر) زبیر قیوم کے شکر گزار ہیں۔ اس کی طباعتی اغلاط اور اشاعتی خامیوں سے مطلع کرنے پر ہم اصحاب علم کے ممنون ہوں گے/

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عمل کو محترم پروفیسر صاحب کے اعمال حسنہ میں شامل فرمائے اور مصنف" کے ساتھ مرتبین اور ناشر کے والدین اور اساتذہ کے لئے بھی ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین

احمد شاکر
ناظم
المکتبۃ السلفیۃ - لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اظہارِ تشکر

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ الکریم

یہ میرے اور میرے پورے خاندان کے لئے انتہائی خوشی اور مسرت کا موقع ہے کہ والد مرحوم کی وہ تمام تحریریں جو انہوں نے مختلف رسائل و جرائد کے لئے لکھیں اور جن تحریروں میں ان کی زندگی بھر کے ولولے، جذبے اور ان کے خیالات و افکار کی جولانیاں موجود ہیں، پہلی دفعہ چھپ کر منظر عام پر آ رہی ہیں/

ہماری اِس خوشی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان مقالات کی اشاعت مرحوم کی زندگی کی ایک اہم خواہش تھی جس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ مرحوم نے اپنی زندگی میں اس مجموعہ میں شامل ۱۲ اہم مقالات کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا، اس کی کتابت بھی مکمل ہو چکی تھی، مگر اس کی اشاعت سے قبل آپ کی حیات مستعار کا وقت ختم ہو گیا۔

مقالات کے اس مجموعے میں مرحوم کے نادر اور اچھوتے موضوعات پر مقالات و مضامین شامل ہیں جن کی اہمیت کا حقیقی اندازہ ان کے مطالعے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔

مقالات کے اس مجموعے کو مکمل کرنے میں ہمیں جن اہل علم کا تعاون حاصل رہا ان کا ذکر موجب طوالت ہو گا۔ ہم ان سب کے شکر گزار ہیں۔ خصوصاً ڈاکٹر محمود لحسن عارف صاحب کے، جن کی کاوش سے یہ علمی جواہر پارے آپ تک پہنچ رہے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مقالات کے اس مجموعے کو اہل علم کے استفادے کا ذریعہ بنائے اور اسے والد مرحوم کے درجات میں ترقی کا ذریعہ بنائے----

میجر (ر) زبیر قیوم
بی بی جے، پائپ انڈسٹریز،
۲۳ فسٹ فلور، بلال سنٹر، نکلسن روڈ، لاہور

فہرست عنوانات مقالات پروفیسر عبدالقیومؒ (جلد اول)

(جلد اوّل ختم ہوئی)

مقدمہ

مقالات و صاحبِ مقالات

یوں تو یہ زندگی آنے جانے کا نام ہے۔ یہاں کوئی آرہا ہے اور کوئی جا رہا ہے۔ یہاں آنا آنے والے کی مرضی سے ہوتا ہے اور نہ جانے میں جانے والے کی مرضی کا عمل دخل ہے' مگر پھر بھی کچھ جانے والے ایسے ہوتے ہیں جن کی یادوں کے پھول سدا بہار رہتے ہیں اور دنیا کے چمن میں ان کی مشام انگیز خوشبو سے ایک دنیا معطر رہتی ہے' پروفیسر عبدالقیوم ایسے ہی ایک سدا بہار یادوں کی حامل شخصیت کے حامل تھے' وہ صحیح معنوں میں اقبال کا مرد مومن تھے۔ انہوں نے تمام زندگی ورع و تقویٰ' نیکی و پارسائی' عفت و پاک دامنی اور زہد و توکل کے ساتھ گزاری اور اسی کا دوسروں کو درس دیا۔ انہوں نے ہمیشہ اعلیٰ ترین انسانی اور اخلاقی اقدار و روایات کا علم بلند رکھا اور اپنی روایات و اقدار کو اپنے سینے میں لیے دنیا سے چلے گئے.

۱۔خاندانی پس منظر

پروفیسر صاحب کے اجداد شوپیان (علاقہ جموں و کشمیر) کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد محترم منشی فضل، دین ولد عبداللہ ولد قادر بخش دھار، سے نقل مکانی کر کے لاہور میں وارد ہوئے اور انہوں نے لاہور میں ایک اچھے' محنتی اور بااصول ٹھیکدار کی حیثیت سے نام کمایا اور اچھی اخلاقی روایات اپنی تمام اولاد کے لیے ورثہ میں چھوڑ گئے۔ مرحوم انجمن اہل حدیث لاہور کے بانی ارکان میں سے تھے.

پروفیسر صاحب کے نانا مولوی سلطان، احمد صاحب مرحوم بھی اپنے زمانے

کے ایک جید عالم دین تھے' جو کافی عرصہ انجمن اہلحدیث لاہور شاخ کے صدر اور جامع مسجد مبارک کے اعزازی خطیب رہے۔ آپ کے خاندان کی نیک شہرت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے ہاں متعدد اہل علم' مثلاً مولانا قاضی سلیمان سلمان منصور پوری' مولانا سلیمان ندوی اور مولانا ابوالوفاثناء اللہ امرتسری آمدورفت رکھتے تھے اور منشی صاحب اور ان کا خاندان ان کی میزبانی کرکے دلی مسرت حاصل کرتا تھا۔

اس خاندان کی علمی اور دینی یادگاروں میں مسجد مبارک کی تاسیس اور اس کی تعمیر و ترقی میں نمایاں حصہ لینا بھی شامل ہے۔ جس میں پروفیسر صاحب کے والد محترم اور نانا مولوی سلطان دونوں کا بڑا حصہ ہے۔

منشی فضل دین کی اولاد

منشی فضل دین (م ۱۹۵۶ء) بہت ہی خوش نصیب انسان تھے کہ اللہ تعالی نے انہیں کثیر المال ہونے کے ساتھ ساتھ کثیرالاولاد ہونے کا اعزاز بھی بخشا تھا۔ منشی صاحب کی تمام اولاد پڑھ کر اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوئی۔ ان کے دو بیٹوں (پروفیسر عبدالقیوم' پروفیسر عبدالحی) نے تعلیم میں نام کمایا۔ ایک بیٹے (عبداللہ بٹ) کو صحافت میں شہرت ملی' ایک بیٹا (محمد سلمان بٹ) پولیس میں اہم عہدے پر فائز رہا اور وطن دشمن عناصر کے خلاف جہاد کرتا ہوا شہید ہوا۔ چار بیٹوں (ونگ کمانڈر عبدالسلام بٹ' سکواڈرن لیڈر محمد یحیٰ بٹ' ائرکموڈور محمد زکریا بٹ اور گروپ کیپٹن محمد یونس بٹ) نے ائر فورس میں نام کمایا۔

۲۔ولادت اور تعلیم و تربیت

پروفیسر صاحب کی ولادت ۱۵۔ جنوری ۱۹۰۹ء کو ہوئی۔ اس وقت آپ کے والدین اندرون موچی دروازہ میں رہائش رکھتے تھے' خاندان میں چونکہ وہ دوسرے نمبر پر تھے۔ اس لیے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ مبذول رہی۔ آپ نے ابتدائی عمر میں قرآن مجید (ناظرہ)

پڑھا۔

آپ نے تعلیم کا آغاز منشی فاضل کے امتحان سے کیا' جو آپ نے اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہو کر ۱۹۲۶ء میں پاس کیا۔ بعد ازاں ۱۹۲۷ء میں پرائیویٹ امیدوار کے طور پر میٹرک کیا اور ایف اے اسلامیہ کالج لاہور (ریلوے روڈ) سے کیا۔ اس وقت اس کالج میں بہت سے مشاہیر علوم اسلامیہ جدیدہ کی تعلیم پر مامور تھے' جن میں سے خصوصی طور پر مولانا روحی' علامہ عبداللہ یوسف علی' ایم اے غنی' سر الیگزنڈر ولسن' پروفیسر سراج الدین آرزو' سید عبدالقادر' مسٹر یو کرامت' پروفیسر غلام حسین' ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔ پروفیسر صاحب نے ان سب سے استفادہ کیا۔

اسی کالج سے آپ نے ۱۹۳۲ء میں بی اے آنرز کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں ۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا۔ یہاں آپ کو پروفیسر محمد شفیع صاحب جیسا مشفق استاد ملا جو اپنی مثال آپ تھے۔

۲۔ اعزازات اور کارنامے

میکلوڈ سکالر شپ کا حصول

جامعہ پنجاب میں اس زمانے میں متعدد سکالر شپ مستحق طلبہ کو دیئے جاتے تھے۔ جن میں ایک میکلوڈ سکالر شپ بھی تھا۔ جس وقت آپ نے ۱۹۳۴ء میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت شعبہ عربی کے صدر اور اورینٹل کالج کے وائس پرنسپل ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم تھے' ڈاکٹر مولوی شفیع صاحب برصغیر پاک و ہند کے ممتاز اساتذہ اور محققین میں سے تھے۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم کیمبرج سے حاصل کی اور عمر بھر اورینٹل کالج میں عربی زبان و ادب کی تدریس پر مامور رہے۔ ڈاکٹر صاحب ہی آپ کے لیے اس مسند پر پہنچنے کا ذریعہ بنے تھے۔ ڈاکٹر

مولوی محمد شفیع سے پروفیسر صاحب کا یہ علمی اور تحقیقی تعلق عمر بھر قائم رہا۔ ڈاکٹر صاحب بھی چار سال (۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۶ء) اسی سکالر شپ پر کام کرتے رہے۔ اور ان سے قبل ڈاکٹر علامہ اقبالؒ بھی اس پر کام کر چکے تھے۔ آپ نے اس عرصے میں لسان العرب کے اشاریے پر کام کیا جسے بین الاقوامی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی' اس کے علاوہ آپ نے اس عرصے میں الحجازی کی نوادرالاخبار و طرائف الاشعار کو ایڈٹ بھی کیا۔ ۱۹۶۱ء میں جامعہ پنجاب نے آپ کو کیمبرج میں اعلیٰ تعلیم و تحقیق (پی ایچ ڈی) کے لیے منتخب کیا' مگر آپ بوجوہ نہ جاسکے۔

۲۔ تدریسی خدمات

آپ نے ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۶۸ء تک تقریباً تیس سال کا زمانہ عربی زبان و ادب کی تدریس اور تحقیق میں صرف کیا۔ اس عرصے میں آپ لغت و ادب عربی کی تدریس پر مامور رہے۔ آپ نے زمیندار کالج گجرات' گورنمنٹ کالج ہوشیارپور' گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ مؤخر الذکر مقام پر آپ اکیس برس (۱۹۴۷ء۔ ۱۹۶۸ء) تک مامور رہے۔

نیز اس عرصے (۱۹۵۳ تا ۱۹۶۸ء) میں آپ اعزازی طور پر اورینٹل کالج لاہور میں ایم اے (عربی) کے طلبہ کو بھی پڑھاتے رہے۔

اس عرصے آپ نے میں حسب ذیل مضامین کی تدریس کی:

۱۔ قدیم شاعری اور عروض (classical poetry and prasody)

۲۔ جدید عربی ادب

۳۔ قدیم نثر

۴۔ اسلام کی ادبی و سیاسی تاریخ

۵۔ تاریخ ادب عربی

علاوہ ازیں آپ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ کی رہنمائی اور ان کے ممتحن کے فرائض بھی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

ماہرین کی آراء:

آپ کی تدریس کے متعلق چند ماہرین کی آرا کا ذکر بھی مناسب ہو گا۔

(الف) ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ آپ کی تدریس کے متعلق لکھتے ہیں:

"میں نے انہیں بہت ہی اعلیٰ درجے کا استاد اور بہت اچھا رفیق کار پایا۔ انہوں نے نہ صرف تدریس میں جامعہ پنجاب کے ساتھ بھرپور تعاون کیا، بلکہ ان تحقیقی منصوبوں میں بھی پورا پورا ہاتھ بٹایا جو جامعہ نے ترتیب دیئے۔ انہوں نے مذکورہ بالا عرصے میں بے شمار طلبہ کے ایم اے کے مقالات (Theses) کی نگرانی کی۔

جو لوگ عربی زبان و ادب کا مطالعہ کرنے اور ان کی زبان و ادب کے بعض پیچیدہ مسائل کے حل کے جویا رہتے ہیں، وہ اس شعبے میں ان کے تصنیفی کام سے بخوبی آشنا ہیں۔

وہ تقریباً دس برس تک جامعہ کی عربک اینڈ پرشین سوسائٹی کے سیکریٹری رہے اور انہوں نے نے متعدد کانفرنسوں میں اعلیٰ تخلیقی و تحقیقی مقالات پیش کیے۔ انہوں نے لسان العرب کا لمبا اشاریہ تیار کیا ہے، جسے اندرون و بیرون ملک کے ماہرین نے بے حد سراہا ہے"۔

(ب) ڈاکٹر محمد عنایت اللہ کی رائے

"میں پروفیسر عبدالقیوم کو گورنمنٹ کالج کے زمانہ تدریس سے، جہاں وہ ۱۹۴۷ء میں تبدیل ہو کر آئے تھے اور میرے رفیق کار رہے، جانتا ہوں ان کا شعبۂ عربی کی تدریس میں اہم حصہ ہے اور اس شعبے کی کامیابی ان کے اخلاص، صمیم قلب سے ان کے تعاون اور ان کی روح پرور ہدایات کی رہین منت ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی اجازت سے وہ اورینٹل کالج میں ایم اے کی جماعت کو بھی پڑھاتے رہے۔ وہ مختلف سالوں میں مختلف پرچوں کے نگران بھی رہے۔

روز مرہ کی تدریس کے علاوہ پروفیسر عبدالقیوم صاحب متعدد ایم اے طلبہ کے مقالات کی نگرانی بھی کرتے رہے۔ انہوں نے متعدد پی ایچ ڈی کے طلبہ کی (بطور گائڈ) رہنمائی بھی کی۔ ان کے طلبہ ان کی نگرانی سے نہ صرف مطمئن رہے' بلکہ ان کی تبحرِ علمی اور مطالعہ کی وسعت سے بہت متاثر ہوئے"۔

ج۔ مولانا عبدالعزیز میمنی کی رائے

"پروفیسر عبدالقیوم استاد عربی گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر موصوف گذشتہ بیس برس سے ایم اے کی تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ تجربہ تحقیقات اور وسعت معلومات کے لحاظ سے پروفیسر موصوف پاکستان میں ایک ممتاز حیثیت رکھنے کے علاوہ بین الاقوامی شہرت بھی رکھتے ہیں"۔

الغرض آپ معلمؒ کے طور پر انتہائی کامیاب اور مضمون میں ماہر مدرس تھے۔ آپ کی تدریس سے گورنمنٹ کالج لاہور اور اورینٹل کالج لاہور کے عربی شعبے بڑی حد تک مستفید ہوئے اور اپنی اس حیثیت سے آپ نے سیکڑوں طلبہ کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کیا۔

۳۔ تصنیفی و تحقیقی خدمات

پروفیسر صاحب مرحوم اپنے زمانے کے ایک نامور محقق بھی تھے' جن کے علم و فضل سے استفادے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ آپ کی تدریسی خدمات کی طرح آپ کی تحقیقی و تصنیفی خدمات کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ آپ نے چھوٹی بڑی تقریبا ۲۷ کتب تصنیف کی ہیں' جن میں سے بعض انتہائی اہمیت و وقعت کی حامل ہیں۔ یہاں ہم بطور مثال آپ کی دو تحقیقی کاوشوں کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔

(الف) اشاریہ لسان العرب

پروفیسر عبدالقیوم صاحب نے اپنی زندگی میں جو تحقیقی کام کیے ان میں سے آپ کا ایک یادگار کارنامہ لسان العرب کا اشاریہ ہے۔ لسان العرب عربی

زبان و ادب کا وہ شاہکار ہے جس کی مثال کا دنیا کے ادب میں ملنا مشکل ہے۔ یہ عربی زبان کی ایک قدیم اور انتہائی مستند ڈکشنری ہے، جسے مؤلف نے بیس جلدوں میں مرتب اور مدون فرمایا، مگر اتنی اہم اور ضخیم کتاب اشاریہ کے بغیر تھی، خاص طور پر عربی اشعار اور شعرا کے اشاریئے کی کمی بے حد محسوس ہوتی تھی، اس کمی کو آپ نے پورا کرنے کی کوشش کی۔

پروفیسر صاحب نے یہ اشاریہ دو جلدوں میں مرتب فرمایا۔ جلد اول میں ان شعرا کا حروف تہجی کی ترتیب سے تذکرہ ہے، جن کے اشعار لسان العرب میں بطور شواہد استعمال کیے گئے ہیں اور دوسری جلد میں ان اشعار و قوافی اور ان کی بحور کا ذکر ہے جن اشعار کا صاحب لسان نے مختلف الفاظ کے تحت حوالہ دیا ہے۔

یہ کام چونکہ بین الاقوامی نوعیت کا حامل ہے اس لیے بین الاقوامی سطح پر اس کی پذیرائی اور تعریف ہوئی ہے، مولانا سید سلیمان ندوی نے جب فہارس لسان العرب کا مطالعہ کیا تو معارف (شمارہ نمبر۳، جلد ۲۴، ص ۲۴۳) میں اس پر حسب ذیل تبصرہ کیا:

"خوشی کی بات ہے کہ لسان العرب، جو ابن منظور الافریقی (م ۷۱۱ ھ) کی کتاب ہے، کی یہ خدمت ایک ہندی نژاد کی قسمت میں آئی ہے، مولوی عبدالقیوم صاحب ایم۔اے ریسرچ سٹوڈنٹ پنجاب یونیورسٹی نے اس کام کو بڑی محنت سے انجام دیا ہے۔ انہوں نے پہلے تو یہ کیا ہے کہ لسان العرب میں جتنے شاعروں کے نام جہاں جہاں آئے ہیں ان کو یکجا کیا ہے اور پھر ان کو حروف تہجی پر ترتیب دیا ہے اور ہر جلد کے جس صفحہ میں وہ نام آئے ہیں ان کا حوالہ دیا ہے۔ اس طرح آپ نہایت آسانی سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کس شاعر کا نام کہاں کہاں آیا ہے اور اس کے اشعار اس کتاب میں کہاں کہاں ہیں۔

اس کی دوسری جلد میں اشعار کی فہرست ہوگی کہ کون سا شعر اس میں ہے۔ یہ کام جتنی محنت، ہمت اور دیدہ ریزی کا ہے، اس کا اندازہ اہل علم ہی

کرسکتے ہیں۔ مؤلف نے اپنی اس محنت سے خدا جانے کتنے عالموں اور طالب علموں کو تلاش کی محنت اور زحمت سے بچا دیا ہے"۔

اسی طرح کیمبرج برطانیہ کے مشہور مشرقی ایف کرنکو (F.KRENKOV) نے اسلامک کلچر (ISLAMIC CULTURE) حیدر آباد دکن (اپریل ۱۹۳۹ء) میں اس پر جامع تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"اشاریہ لسان العرب' اشاریہ۔ ا۔ اسمائے شعرا' مرتبہ ایم عبدالقیوم ایم اے لاہور ۱۹۳۷۔ ۱۹۳۸ء' جب میں نے ۱۹۰۱ء میں لسان العرب کا اپنا نسخہ وصول کیا تو میں فوراً ہی اس بات کا قائل ہو گیا کہ عربی زبان کی اس سب سے عمدہ کتاب لغت میں جو شواہد پیش کیے گئے ہیں۔ انہوں نے اسے شاعری کی جامع بیاض بنا دیا ہے۔ میں نے ذاتی استعمال کے لیے اس کا ایک الف بائی اشاریہ بنا لیا۔ جس نے اشعار تلاش کرنے میں نہ صرف میری مدد کی' بلکہ میرے علاوہ بہت سے لوگوں کا کام بھی آسان کیا۔ اسی لیے میں مسٹر عبدالقیوم کے اس کام کو سراہتا ہوں' جس نے اس گراں قدر عربی ادب کو سب لوگوں کے مطالعے کے لیے آسان بنادیا ہے۔۔۔ اس قوافی کے اشاریئے سے ہمارے لیے بکھرے ہوئے اور متفرق اشعار کو باہم ملا کر مطالعہ کرنا آسان ہو گیا ہے۔

ایک اور نکتہ جو اس اشاریہ قوافی سے واضح ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ اس سے ایک ہی نام کے دو شاعروں کا کلام ایک دوسرے سے متمیز کیا جا سکتا ہے۔

اس بات کا افتخار (Credit) بھی انہی (مولوی محمد شفیع) کو حاصل ہے کہ وہ حقیقی طور پر خالص ایک سائنسی انداز میں مصر اور یورپ سے کہیں بہتر طریقے سے نئی نسل کی عربی زبان و ادب میں تربیت کر رہے ہیں۔ میں شدید اشتیاق کے ساتھ بقیہ اشارے کا انتظار کر رہا ہوں" (اسلامک کلچر۔ حیدر آباد دکن' بابت ماہ اپریل ۱۹۳۹ء)۔

(ب) اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں بطور مدیر اور سینئر مدیر خدمات:

آپ کا دوسرا عظیم الشان تحقیقی کارنامہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی ترتیب' تدوین اور طباعت میں بطور مدیر اور سینئر مدیر خدمات ہیں۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی اہمیت کا اس امر سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ عظیم الشان سعادت صرف پاکستان اور اردو کے حصے میں آئی ہے کہ دائرہ معارف اسلامیہ اس میں مکمل ہوا ہے۔ ورنہ باقی اسلامی ممالک (مثلاً ترکی' عرب ممالک اور ایران) میں دائرہ المعارف ابھی تک مکمل نہیں ہو سکا۔ مولوی محمد شفیع' جو اس کے پہلے ڈائریکٹر اور صدر شعبہ تعینات ہوئے تھے' پروفیسر صاحب کے خصوصی مربی اور استاد تھے اس لیے آپ کا اس موسوعۂ علمیہ سے تعلق روز اول سے ہی قائم ہو گیا۔ یہ تعلق تینوں شعبوں' یعنی لائیڈن کے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (Encyclopaedia of Islam) سے ترجمہ' نظر ثانی اور اس کے لیے نئے مقالات لکھنے تک وسیع تھا۔ بعد میں ۱۹۶۸ء میں آپ ریٹائرمنٹ کے بعد اسی شعبے سے متعلق طور پر وابستہ ہوگئے۔

یہاں بطور مدیر اور سینئر مدیر آپ نے جو فرائض انجام دیئے' ان کی تفصیل بہت طویل ہے' البتہ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے اس کے لیے بے شمار مقالات ترجمہ اور نظر ثانی کیے اور بہت سے موضوعات پر نئے مقالات لکھے اور سب سے بڑھکر یہ کہ آپ اس ادارتی ٹیم میں شامل تھے' جس نے اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی نہ صرف تکمیل کی' بلکہ اس میں وہ مشرقی اور اسلامی رنگ پیدا کیا جس پر بجا طور پر ناز کیا جاسکتا ہے اور جس کی بنا پر اردو دائرہ معارف اسلامیہ محض لائیڈن کے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا ترجمہ ہی نہیں رہا بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو گیا ہے۔

علاوہ ازیں جس زمانے میں مرحوم اورینٹل کالج لاہور میں عربی کی تدریس پر مامور تھے' اس زمانے میں ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم کی صدارت میں "عریبک اینڈ پرشین سوسائٹی" کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے تحت ایک جریدہ (جرنل آف عریبک اینڈ پرشین سوسائٹی) شائع ہوتا تھا اور بہت سی تصنیفی و

تحقیقی خدمات انجام دی جاتی تھیں۔ آپ ایک مدت تک اس کے جنرل سیکریٹری رہے۔

۵۔ بحیثیت عظیم علمی و فکری رہنما

پروفیسر صاحب کو علوم اسلامیہ اور علوم عربیہ میں اعلیٰ ترین مہارت اور تبحر حاصل ہونے کے باعث اپنے وقت میں ایک ممتاز علمی اور فکری رہنما کا مقام حاصل ہو گیا تھا۔ چنانچہ آپ کا دروازہ ہر خاص و عام کے لیے ہمہ وقت کھلا رہتا تھا اور آپ کے ہاں سے رہنمائی کے لیے کسی تخصیص یا سفارش کی ضرورت نہ تھی۔ بلاشبہ آپ قوم کے ایک ایسے مخلص اور قومی درد رکھنے والے رہنما تھے جو معاشرے کی صفوں میں رہ کر خاموش اور ملی مدد کے ساتھ اپنا کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور ایم۔اے' پی ایچ ڈی کے طالب علموں کا آپ سے حصول رہنمائی کے لیے تانتا بندھا رہتا تھا۔ آپ کی وسعت علمی کے پیش نظر بعض بیرونی محققین بھی آپ سے مشاورت اور علمی و تحقیقی رہنمائی کے لیے حاضر ہوتے اور آپ کے علم و فضل سے مستفید ہو کر واپس لوٹتے تھے۔

۶۔ بحیثیت ایک عظیم و مخلص انسان

بحیثیت مخلص و بے لوث انسان آپ کی ذات ایک مثالی نمونہ تھی۔ آپ اپنوں کے تو کام آتے ہی تھے' دوسروں اور اجنبی افراد سے بھی ہر طرح کا تعاون فرماتے تھے۔ اپنی زبان اور اپنے قلم کی حفاظت آپ کا ہمیشہ معمول رہا۔ خاکسار نے کبھی آپ کو اپنے دوستوں کی مجلس میں پھکڑ بازی کرتے یا اخلاق و معیار سے گری ہوئی گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

دوست احباب اور اپنے خدام و ملازمین کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنا آپ کا معمول تھا۔ آپ کی گفتگو ہمیشہ مہذب اور شائستہ ہوتی تھی۔

آپ ایک دیندار' مہذب و متشرع شخص تھے۔ آپ کا قول آپ کے

فعل کا اور آپ کا فعل آپ کے قول کا آئینہ دار تھا۔ آپ نماز اتنے اطمینان اور خشوع اور خضوع کے ساتھ ادا فرماتے کہ اس پر رشک آتا۔ نماز میں تمام مسنون دعائیں پڑھتے تھے۔

قیام لیل کا اکثر معمول تھا' خاص طور پر رمضان المبارک میں راتوں کو اکثر طویل قیام فرماتے اور صبح کو دفتر میں حاضری کا معمول بھی جاری رہتا۔ قرآن مجید اور حدیث نبوی سے گہرا شغف تھا۔ قرآن مجید کے رسم الخط اور اس کے طریقۂ املا و تصحیف پر پاکستان بھر میں آپ اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ قرآنی رسم الخط کی معمولی سے معمولی غلطی بھی آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہتی تھی۔ انجمن حمایت اسلام کے نسخہ قرآنی کی تصحیح میں پروفیسر صاحب کا بھی بڑا حصہ ہے' جو برصغیر پاک و ہند میں تصحیح متن اور املا کے اعتبار سے مستند ترین نسخہ تصور کیا جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب مسلک و مشرب کے اعتبار سے "اہلحدیث" ہونے کے باوجود دوسرے مسالک کے لیے حد درجہ احترام اور محبت کے جذبات رکھتے تھے۔ آپ دیگر مسالک' بالخصوص "احناف" کا خصوصی احترام کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مجموعہ مضامین و مقالات میں سید الاحناف امام ابو حنیفہؒ پر بھی ایک مستقل مضمون ملتا ہے' جس میں آپ نے امام صاحب کی ذات کو واضح الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مزید براں آپ کے حلقۂ احباب میں ہر مسلک و مشرب کے لوگ شامل تھے۔

آپ کو صوفیائے کرام سے بھی بے حد محبت تھی۔ چنانچہ آپ نے متعدد صوفیا' مثلاً حضرت ابراہیم بن ادہم' امام الغزالیؒ' مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اور خواجہ محمد معصومؒ وغیرہ پر مستقل مقالات لکھے ہیں۔

آپ بہت اچھے میزبان تھے۔ دوست احباب اور عزیز و اقارب کی میزبانی کے فرائض انجام دے کر آپ کو بیحد خوشی اور مسرت محسوس ہوتی تھی' آپ کا گھر ہمیشہ دارالضیوف رہا' جہاں دور دراز سے لوگ آتے رہتے تھے۔

اپنے خدام کے ساتھ آپ کا رویہ مہر و محبت اور شفقت و نرمی کا تھا۔ آپ ان کے دکھ درد میں کام آتے۔ اگر کسی کو قرض کی ضرورت ہوتی تو خندہ پیشانی سے قرض مہیا کرتے اور اگر کسی کا کوئی مسئلہ ہوتا' تو اس کے حل کی مناسب کوشش فرماتے۔

پروفیسر صاحب بڑے صابر اور ہمت والے شخص تھے۔ آپ کی صحت بہت اچھی' بلکہ مثالی تھی' کہ دیکھنے والے انہیں اسّی سال کی عمر میں دوسروں سے زیادہ ہشاش بشاش دیکھتے اور اگر کوئی تکلیف ہو جاتی تو اسے خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔

آپ کو کچھ عرصے سے معدے کے السر کی تکلیف تھی' مگر کمال ضبط و تحمل کا یہ عالم تھا کہ آپ نے گھر میں یا گھر کے باہر کسی شخص کو بھی اپنی تکلیف سے آگاہ نہ کیا۔

بیماری کے دوران میں آپ کو بے حد صابر و قانع پایا گیا۔ آپ کو بیک وقت تین موزی بیماریوں کا سامنا تھا' یعنی پیشاب کی بندش' معدے میں السر اور گلے میں کینسر کی تکلیف تھی۔ آپ نے تقریباً کئی ماہ بستر علالت پر پڑے پڑے ہی گزار دیئے' مگر بایں ہمہ آپ کی زبان پر کوئی حرف شکایت نہیں آیا' بلکہ لوگوں نے آپ کو ہمیشہ صابر اور راضی بقضاء پایا۔ الغرض مرحوم بہت ہی اعلیٰ خصوصیات اور علمی اوصاف و کمالات رکھنے والے شخص تھے۔

○

وفات:

آپ چار ماہ بستر پر گزار کر ۸ ستمبر ۱۹۸۹ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور ۹ ستمبر کو صبح دس بجے میانی والے قبرستان میں آپکے خاندان کے دوسرے افراد کے قریب آپ کو دفن کیا گیا (انا للہ و انا الیہ راجعون) اللہ تعالیٰ آپ کے درجات کو اپنے ہاں بلند فرمائے۔ آمین۔

○

(الف) تحقیقی و علمی تصانیف:

اس موضوع پر آپ نے حسب ذیل کتابوں کی تصنیف/ تحقیق فرمائی

۱۔ اشاریہ شعرائے لسان العرب' مطبوعہ اورئینٹل کالج' پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۲۔ فہرس القوانی لسان العرب، مطبوعہ اورینٹنل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔
۳۔ تحقیق کتاب نوادر الاخبار و ظرائف الاشعار، از شہاب الدین احمد الحجازی
مخطوطہ، مخزونہ کتاب خانہ جامعہ پنجاب، لاہور۔
۴۔ تاریخ ادب عربی، (عربی کتاب الوسیط کا اردو ترجمہ)
۵۔ تاریخ ادبیات پاکستان و ہند، جلد اول، بہ حیثیت مدیر خصوصی۔
۶۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، تقریباً ۲۱ جلدیں بحیثیت مدیر اور سینئر مدیر۔
۷۔ Specimens of Arabic Literature and Poetry for English readers.
یہ کتاب سر فضل حسین کی یادگار کے طور پر شائع ہوئی۔
۸۔ Aid to the study of Simtud Durar۔ یہ کتاب ماڈرن بک ڈپو سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔
۹۔ Biography and Criticism-
۱۰۔ Arabic Grammar (English)-
۱۱۔ Poems of the Desert۔ تینوں کتابیں مطبوعہ ہیں۔
۱۲۔ مقالات پروفیسر عبدالقیوم۔ (اردو، حصہ اول و دوم)۔
۱۳۔ مقالات پروفیسر عبدالقیوم۔ (انگریزی، زیر ترتیب)۔

ب۔ طلبہ کی رہنمائی کے لیے لکھی گئی تصانیف

ان خاص علمی کتب کے علاوہ پروفیسر صاحب نے حسب ذیل کتابیں میٹرک سے لے کر ایم اے تک کے طلبہ کی رہنمائی کے لیے تصنیف فرمائیں۔

۱۴۔ آئینہ اسلامیات، حصہ اول۔
بی اے و مابعد کے امتحانات کے لیے، مطبوعہ انڈس پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۶ء۔
۱۵۔ آئینہ اسلام
بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے جدید نصاب کے مطابق، ایف اے کے

طلبہ کے لیے، مطبوعہ یونیورسٹی بک ایجنسی، ۲ کچہری روڈ۔ لاہور۔

۱۶۔ فہم اسلام

بی اے کے طلبہ اسلامیات کے لیے، مطبوعہ یونیورسٹی بک ایجنسی، لاہور، ۱۹۵۷ء۔

۱۷۔ رہبر اسلامیات

ڈگری کلاسز کے طلبہ کے لیے، فضل اقبال صدیقی کے فرضی نام سے مطبوعہ یونائیٹڈ پبلشرز لاہور۔

۱۸۔ مطالعۂ اسلامیات

برائے بی اے سال اول، تعارف قرآن و حدیث، مطبوعہ پبلشرز یونائیٹڈ لاہور ۱۹۶۲ء

۱۹۔ خلافت راشدہ

بی اے اسلامیات آپشنل کے طلبہ کے لیے، مطبوعہ انڈس پبلشنگ ہاؤس لاہور۔

۲۰۔ تاریخ اسلام:

عہد قبل از اسلام سے لے کر زوال بنو عباس تک، مطبوعہ انڈس پبلشنگ ہاؤس لاہور۔

۲۱۔ مختصر تفسیر سورۃ الانفال

ضمیمہ رہبر اسلامیات، سورۃ الانفال مع اردو ترجمہ و مطالب، مطبوعہ پبلشرز یونائیٹڈ لاہور

۲۲۔ آئینہ اسلامیات (حصہ دوم)

سورہ نساء مع ترجمہ و مطالب، مطبوعہ انڈس پبلشنگ ہاؤس لاہور۔

۲۳۔ اسلامی تعلیم

طلبائے انٹرمیڈیٹ کے لیے، مطبوعہ پبلشرز یونائیٹیڈ۔ ۱۹۵۳ء لاہور

۲۴۔ علوم اسلامیہ

بارہویں جماعت کے طلبہ اسلامیات کے لئے، پبلشرز یونائیٹڈ، ۱۹۶۲ء

۲۵۔ مدارج الادب حصہ اول

۲۶۔ مدارج الادب حصہ دومؒ

۲۷۔ مدارج الادب حصہ سوم۔ مطبوعہ پبلشرز یونائیٹڈ ۱۹۵۳ء لاہور

مقالات کا زیر نظر مجموعہ

پروفیسر صاحب کے یہ مقالات علمی جواہر پارے ہیں۔ ان مقالات کے مطالعے سے علم و ادب کے کئی مخفی گوشے سامنے آتے ہیں، اور بہت سے حقائق و معارف سے آگاہی ہوتی ہے۔ اس بنا پر مرحوم کے تمام مقالات کو یکجا کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔

ان میں سے کچھ مقالات تو وہ ہیں جو مرحوم اپنی زندگی میں ایک مجموعہ میں مرتب کر گئے تھے، مگر ان کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی تھی اور کچھ مقالات، مختلف علمی رسائل و جرائد میں طبع ہو کر داد تحقیق پا چکے ہیں، جبکہ کچھ مقالات ابھی تک قلمی صورت میں محفوظ تھے۔ ہم نے ان تمام کو موضوعی ترتیب میں یکجا کر دیا ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ علمی جواہر پارے بہتر سے بہتر شکل میں اہل علم تک پہنچ جائیں۔ بایں ھمہ اگر ان مقالات کی ترتیب و تدوین میں کوئی کوتاہی نظر آئے تو ہم اس پر پیشگی معذرت خواہ ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ زیر نظر مقالات ادب عربی اور علوم اسلامیہ سے شغف رکھنے والوں کی دلچسپی اور ان کی معلومات میں اضافے کا باعث ہوں گے۔

○○○

۲۔ مقالات پر ایک نظر:

پروفیسر عبدالقیوم۔۔ مرحوم و مغفور کے جو مقالات اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔ یہ مرحوم کی زندگی بھر کی وہ متاع ہے جسے قطرہ قطرہ کر کے جمع کیا گیا ہے۔ یہ مقالات مرحوم نے اپنی زندگی کے مختلف ایام میں لکھے۔ ان میں ایسے مقالات بھی ہیں۔ جو اس وقت مرتب کیے گئے۔ جب آپ پنجاب یونیورسٹی میں ریسرچ سکالر کے طور پر اپنا تحقیقی کام انجام دینے میں مصروف تھے (۱۹۳۴۔ ۱۹۳۸ء)' اس زمانے کے مقالات میں قلم کی روانی'' جوش کی فراوانی اور تحقیق کا گہرا جذبہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ لسان العرب اور صاحب لسان العرب' الحجازی' ابن حجر العسقلانی وغیرہ پر مقالات اس کی عمدہ مثال ہیں۔

مقالات کی دوسری قسط' اس زمانے میں مرتب کی گئی جب آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور استاد لغۃ العربیہ خدمات تدریس انجام دینے میں مصروف تھے۔ جوش و فراوانی تحقیق کے ساتھ ساتھ پختگی عقل اور تجربے کی مہارت وغیرہ کی کارفرمائیاں ان مقالات کی خصوصیت ہیں۔

زندگی کے آخری دور (۱۹۸۸۔ ۱۹۸۹ء) کے دوران' آپ نے زیادہ تدریسی اور خطابتی نوعیت کے مضامین و مقالات لکھے' اس دور میں ریڈیو کی تقاریر' اور مختلف کانفرنسوں' یا اجتماعات میں پڑھے گئے مقالات ملتے ہیں' جن میں ایک واعظ کا درد' ایک مخلص رہنما کی فکر اور پختہ کار استاد کی خیر خواہی کے جذبات موج زن نظر آتے ہیں۔

الغرض تحقیق و مطالعے کی گہرائی اور اسلوب تحریر کی بنا پر یہ مقالات دو حصوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔

۱۔ تحقیقی و تنقیدی مقالات ۲۔ خطبات و مضامین

جہاں تک تحقیقی و تنقیدی مقالات کا تعلق ہے' انہیں پھر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جس میں آپ نے ہر بات اور ہر مضمون

کے لیے باقاعدگی کے ساتھ حوالہ دینے کا التزام کیا ہے' اس نوع کے مقالات تعداد میں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ ان کا دوسرا حصہ ایسے مقالات پر مشتمل ہے' جن کا انداز تو بہت محققانہ ہے' مگر ان مقالات میں ہر بات کے لیے حوالہ دینے کا اہتمام نہیں کیا گیا' گو جزوی طور پر ایسے مقالات میں بھی جابجا کتابوں کے حوالے نظر آتے ہیں۔

رہے خطبات و مضامین تو ان میں شاذ و نادر ہی کوئی حوالہ دیا گیا ہے۔ البتہ ان کا انداز اتنی پختگی اور بصیرت و بصارت کا مظہر ہے کہ حوالہ نہ ہونے کے باوجود بھی ہر بات پختہ کاری اور اعلیٰ فکر و تحقیق کی نمائندہ نظر آتی ہے۔

پھر جہاں تک اسلوب و انداز تحریر کا تعلق ہے' پروفیسر صاحب کا اسلوب مکمل طور پر اپنا ایک منفرد اسلوب ہے۔ تاہم اس پر مولانا شبلی نعمانی' مولانا سید سلیمان ندوی' بالخصوص ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے اسلوب تحریر کا ہلکا سا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ یہ اسلوب تحریر بیک وقت ایک طرف تو محققانہ اور عالمانہ ہے اور دوسری طرف توضیحی انداز و اسلوب لیے ہوئے ہے۔ آپ کی تحریر میں قاری کے سامنے' ایک ایسی شخصیت جلوہ فرما نظر آتی ہے۔ جو اپنے موضوع کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ جس کی معلومات کا میدان بے حد وسیع ہے اور وہ اس میں سے ایک ایک کر کے معلومات قارئین کی طرف بہاتی چلی جاتی ہے۔ تا آنکہ قاری کا ظرف پر ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ موضوع اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

آپ کے اسلوب تحریر میں یہ بات بڑی نمایاں ہے کہ آپ نے میدان تحقیق میں اکثر و بیشتر اپنا راستہ خود تلاش کیا ہے اور آپ لگے بندھے اسلوب کی پابندی خود پر ضروری نہیں سمجھتے اور نہ ہی کسی خاص نقطۂ نظر کی ترجمانی اپنے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ خیالات و افکار کے ہجوم میں سے اپنا راستہ خود تلاش کرتے ہیں۔ اور اپنے راستے کی حفاظت کا فریضہ بھی خود ہی انجام دیتے ہیں۔

حجاج بن یوسف مسلم تاریخ کی ایسی شخصیت کا نام ہے' جس کے لیے ہر

مسلمان کے دل میں حقارت و نفرت کے جذبات موجود ہیں، مگر پروفیسر صاحب نے اپنے مقالات میں اس تاریخی شخصیت کے متعلق پہلی مرتبہ تاریخ کی گرد ہٹائی ہے اور اس کے نیچے سے حجاج بن یوسف کا اصلی چہرہ قارئین کرام کو دکھانے کی پوری کوشش کی ہے، جو یقیناً ویسا نہیں ہے جو عام طور پر نظر آتا ہے۔ یہ بات آپ جیسا پختہ کار محقق ہی کر سکتا ہے۔

مصری علما میں سے ڈاکٹر قاسم امین کی ذات مصر و عرب میں ہمیشہ معتوب رہی ہے۔ اس کی کتاب تحریرالمرۃ (عورت کی آزادی) کی بنا پر تمام مذہبی لوگ اس کے سخت ترین مخالف ہوگئے تھے۔ مگر پروفیسر صاحب کا قلم آپ کے مذہبی خیالات کے باوجود اس کی حمایت میں شد و مد سے چلا ہے اور اس کے متعلق نہایت عمدہ اور اعلیٰ خیالات پیش کیے ہیں۔

السخاویؒ اور السیوطیؒ کے باہمی مقابلے میں اکثر لوگوں نے السخاوی کا ساتھ دیا ہے، اس لیے کہ وہ ایک عظیم مؤرّخ اور محقّق ہونے کے ساتھ ساتھ ابن حجرالعسقلانی کا نامور ترین شاگرد اور فیض تربیت یافتہ بھی ہے اور اس کے مقابلے میں اکثر السیوطیؒ کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ مگر آپ نے اس تاریخی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے اور السیوطی کی مظلومیت اور السخاوی کے قلم کی ان کے متعلق بے احتیاطیاں بلکہ زیادتیاں واضح کی ہیں۔

پھر جہاں تک ان مقالات کے موضوعات کا تعلق ہے تو اس کی تفصیل تو ان کے مطالعے سے ہی معلوم ہوسکتی ہے۔ یہاں مختصراً یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ پروفیسر صاحب کے یہ مقالات حسب ذیل عنوانات پر مشتمل ہیں اور ہم نے انہی عنوانات کے ساتھ اور اسی ترتیب میں ان کو مرتب کیا ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ تاریخ علوم قرآن و علوم حدیث و علم سیرۃ

پروفیسر صاحب کو قرآن مجید، حدیث نبویہ اور سیرت طیبہ سے والہانہ قلبی تعلق اور خصوصی لگاؤ تھا۔ ان موضوعات پر، آپ کی ذات ایک سند سمجھی

جاتی تھی۔ چنانچہ اس مجموعہ مضامین میں' آپ اس موضوع پر بہت سے مقالات اور مضامین پائیں گے' جن کے مطالعے سے' ذہنی اور فکری گرہیں کھلتی ہیں اور انسانی ذہن و فکر کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ تاریخ علوم اسلامیہ اور سیرت طیبہ پر آپ نے دو خاکے بھی مرتب فرمائے ہیں جن پر غالباً آپ مستقل کتب لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر زندگی نے آپ کو مہلت نہ دی۔

ہم نے یہ خاکے آپ ہی کے الفاظ میں اس مجموعے میں شامل کردیئے ہیں۔

۲۔ برصغیر پاک و ہند کی مسلم تاریخ و تہذیب

برصغیر پاک و ہند کے مسلمان علما' ان کی تحقیقی کاوشیں اور یہاں کی تہذیب و تاریخ آپ کا خصوصی موضوع ہے۔ اس عنوان پر آپ کو شروع سے ہی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی جو کہ آخر تک برقرار رہی۔ اس مجموعہ مقالات و مضامین میں متعدد مقالات اس موضوع پر نظر آتے ہیں۔

۳۔ مصری تاریخ و تمدن

برصغیر پاک و ہند کے بعد' عربی' بالخصوص مصری تاریخ و تمدن پروفیسر صاحب کا خصوصی میدان تحقیق ہے اس عنوان پر آپ کے مقالات و مضامین پر ایک نظر ڈال لینے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ مرحوم کو اس موضوع سے خاص دلچسپی تھی اور اس عنوان پر آپ کو اتنی معلومات حاصل تھیں جو آپ کے معاصر مصری علما کو بھی شاید ہی حاصل ہوں۔ آپ نے نامور عربی اور مصری ادبا' شعرا اور علماء و فضلا پر قلم اٹھایا ہے اور ان پر خوب داد تحقیق دی ہے۔ آپ کے اس عنوان پر مقالات و مضامین بلا شبہ قارئین کی معلومات میں بے حد اضافے کا موجب ہیں۔

۴۔ تاریخ اہل حدیث

اس کے علاوہ مرحوم کو اپنے مسلک و مشرب' یعنی تاریخ اہل حدیث سے بھی بہت گہری دلچسپی تھی۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اہل حدیث پر جو

مقالہ موجود ہے' وہ آپ ہی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ اس مجموعہ مضامین و مقالات میں بھی آپ اس موضوع پر پروفیسر صاحب کے متعدد مقالات اور مضامین پائیں گے۔ جو قاری کی معلومات میں اضافے کا موجب ہیں۔

۵۔ تصوف و اہل تصوف

مکتب اہل حدیث سے تعلق رکھنے کے باوجود پروفیسر صاحب کو تصوف اور اہل تصوف سے گہری دلچسپی اور عقیدت تھی' یہاں بھی آپ کا منفرد اسلوب اور پختہ کار انداز تحریر پوری عمدگی کے ساتھ نمایاں ہے۔ آپ نے تصوف اور اہل تصوف پر لکھتے وقت ان کے متعلق اپنے ہم مسلکوں کے رویے اور ان کے نقطہ نظر کا قطعاً خیال نہیں رکھا' بلکہ ان کا خود انہی کے اہل قلم کے مستند حوالوں اور توصیفی پیرائے میں تذکرہ کیا ہے۔ جس سے اس بات کا بخوبی اظہار ہوتا ہے کہ آپ نے تحقیق و تفحص میں اپنا راستہ خود تلاش کیا ہے۔

۶۔ تشریحات قرآن و سنہ

اس کے علاوہ آپ نے قرآن مجید کی کچھ آیات اور احادیث طیبہ پر بھی بعض تشریحی مضامین لکھے ہیں جو دراصل آپ کی ریڈیو اور دیگر مجالس میں کی گئی تقاریر پر مشتمل ہیں۔ ان تشریحات میں آپ قرآن و سنہ کے ایک عظیم سکالر اورایک قومی مفکر و رہنما نظر آتے ہیں۔

۷۔ سفرنامہ

۱۹۸۳ء میں آپ نے ہالینڈ' برطانیہ اور حجاز مقدس کا سفر کیا تو اس کا سفر نامہ لکھا' جو بڑا دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

۸۔ کتب پر تبصرے:

مزید براں کچھ مضامین و مقالات' مختلف کتب پر تنقید و تبصرے پر مشتمل ہیں' جن سے آپ کے مطالعے کی وسعت اور آپ کی بصیرت کی گہرائی کا علم ہوتا ہے۔

الغرض یہ مجموعہ مقالات گوناگوں خوبیوں اور متنوع خصوصیات کا حامل

ہے' اس کا صحیح اندازہ ان کے مطالعے سے ہی ممکن ہے۔

آخر میں اگر مرحوم کے خاندان کا شکریہ ادا نہ کیا جائے تو یہ احسان ناشناسی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مقالات و مضامین کی تالیف و کتابت کا تمام افتخار (Credit) آپ کے صاحبزادے میجر (ر) زبیر قیوم ہی کو جاتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف ان تمام مضامین کو اکٹھا کیا' بلکہ ان کی ترتیب و تدوین میں بھی قدم قدم پر میری مدد کی۔

اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کے اپنے ہاں درجات کو بلند فرمائے اور آپ کے ان مقالات و مضامین کو ملک و قوم کے لیے استفادہ اور استفاضہ کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

(ڈاکٹر محمود الحسن عارف)
بیت العرفان' رحمان پارک
گلشن راوی' لاہور۔

○

قرآن، علومِ قرآن و علومِ اسلامیّہ

قرآن مجید اور علوم اسلامیہ

قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا اور ایک ایسے زمانے میں نازل ہوا جب مروجہ علوم و فنون کا کوئی وجود نہ تھا۔ عربی زبان میں قرآن مجید پہلی کتاب ہے۔ اس سے پہلے کوئی کتاب عربی زبان میں نہیں ملتی۔ لے دے کر عربوں کا کل علمی سرمایہ شعر و شاعری اور چند خطبات تھے۔ قرآن مجید کے نزول کے بعد عربی اور اسلامی علوم نے ساری دنیا کو محو حیرت کر دیا۔

قرآن مجید ایک الہامی اور انقلاب آفریں کتاب ہے۔ اس نے امی اور جاہل لوگوں کو علوم و معارف کی قیادت و سیادت بخشی۔ صحرا میں بسنے والے شتربانوں کو علم و حکمت کی اجارہ داری عطا کر دی۔ قرآن مجید کی بدولت مسلمانوں نے اس وقت کے علوم و فنون کی تدریس و تعلیم اور تالیف و تصنیف کی جانب توجہ دی اور دنیا کی قیادت و رہنمائی کی۔ اس وقت سارا یورپ جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں گم تھا اور دنیا کے اکثر حصوں میں بسنے والے لوگ علوم و معارف کے نام تک سے ناآشنا محض تھے۔

قرآن مجید نے عربوں کے اخلاق و اطوار بدلے' ان کے عقائد و ایمان کی اصلاح کی' انہیں روحانیت کے اعلیٰ مراتب پر پہنچایا اور نئی اقتصادی اور معاشرتی اقدار سے بہرہ ور کیا۔ قرآن مجید کے عظیم احسانات میں ایک بڑا احسان یہ ہے کہ اس مقدس اور پاک کتاب کی بدولت بے شمار علوم معرض وجود میں آ کر پروان چڑھے' جنھوں نے عربی زبان و ادب کے دامن کو علم و حکمت سے اس طرح بھر دیا کہ پھر عربوں نے یہ گوہرہائے نایاب بڑی فیاضی اور فراخدلی کے ساتھ ساری دنیا میں لٹائے اور ہر خطہ ارض کو ان علوم سے بہرہ اندوز ہونے کا وافر موقع بہم پہنچایا۔

ہمارا یہ موضوع گو بیحد وسیع و عریض ہے' تاہم وقت کی قلت کے پیش نظر ہم حتی الامکان اسے سمیٹنے اور مختصر کرنے کی کوشش کریں گے۔

قرآن مجید نے مختلف علوم و معارف کی جانب جو توجہ دلائی ہے وہ کبھی تو اشارۂ و کنایہ کے انداز میں ہے اور کبھی وضاحت و صراحت کے ساتھ۔ کہیں تو اختصار و ایجاز سے کام لیا ہے اور کہیں بڑی تفصیل و تشریح سے بات سمجھائی ہے۔ قرآن مجید نے اوامرو نواہی اور احکام کے ساتھ انبیائے کرام ؑ کے حالات و واقعات بھی سنائے ہیں۔ کائنات کی تخلیق' حضرت آدم ؑ کی پیدائش' سلسلۂ نبوّت کی مختلف کڑیوں کا ذکر' احوال آخرت اور جنت و دوزخ بھی قرآن مجید کا موضوع ہے۔ عقائد و ایمانیات' اخلاق و عبادات' حدودو تعزیرات' تدبیر منزل' نظام سلطنت اور فلسفۂ عروج و زوال سے بھی قرآن مجید بحث کرتا ہے۔

قرآن مجید کی بدولت جو علوم معرض وجود میں آئے' ان میں سب سے اہم' اشرف اور افضل علم تفسیر قرآن کا ہے۔ تفسیر کے ذریعے قرآن مجید کے مطالب و معانی کی وضاحت و صراحت مقصود ہوتی ہے۔ ویسے تو علم تفسیر عہد نبوی' علی صاحبہاالصلوٰۃ والسلام سے شروع ہو چکا تھا' لیکن باضابطہ' مستند اور جامع تفسیر کا آغاز امام محمد بن جریر الطبری کی تفسیر سے ہوا۔ امام ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اپنے زمانے تک کی تمام تفسیری معلومات کو جمع کر دیا ہے' تاکہ آنے والی نسلوں کے لئے تمام مروجہ معلومات دستیاب ہو سکیں۔ انہوں نے جو کچھ اہل فن اور اساتذۂ تفسیر سے سنا اسے قلمبند کر دیا۔ امام ابن جریر کی تفسیر اپنے چند تسامحات کے باوجود آج بھی علمی اور فنی اعتبار سے مستند اور بلند پایہ تسلیم کی جاتی ہے۔ چند صدیوں کے بعد اسی جامع تفسیر کی تہذیب و تلخیص امام ابن کثیر نے اپنی شہرۂ آفاق تفسیر کی شکل میں پیش کی۔ جمع بین الروایات اور وفور معلومات کے لحاظ سے امام ابن جریر کا کوئی شریک و سہیم نظر نہیں آتا۔

دنیائے تفسیر میں قرآن مجید کے افہام و تفہیم کے لیے مختلف انداز و اسلوب اختیار کیے گئے ہیں۔ امام الزمخشری نے اپنی مشہور تفسیر الکشاف میں ایک نیا انداز اختیار کیا۔

ادبؔ و لغۃ اور صرف و نحو کا امام ہونے کی وجہ سے امام زمخشری نے قرآن مجید کے ادبی' اور نحوی پہلوؤں پر بڑی معلومات مہیا کر دیں۔ علاوہ ازیں صفات و عقائد باری وغیرہ کے مسائل میں مسلک اعتزال کی خوب ہی نیابت اور نمائندگی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علمی و ادبی بلندی کے باوجود اہل السنت والجماعت نے امام زمخشری کو بہت کم قابل اعتماد سمجھا ہے اور اختلاف مسلک کی بنا پر ان کے فلسفیانہ افکار سے بھی بے اعتنائی برتی۔ امام بیضاویؒ نے تفسیر میں ادب و لغت اور صرف و نحو کے اکثر و بیشتر مسائل نہایت اختصار کے ساتھ امام زمخشری سے لئے ہیں' بلکہ امام زمخشری کے تتبع میں بعض ضعیف روایات بھی نقل کر دی ہیں۔

جب امام فخرالدین رازی کا دور آیا تو اس وقت علم کلام' فلسفہ اور اس قبیل کے دیگر علوم زوروں پر تھے۔ مختلف مدارس فکر کے علما قرآن مجید پر غور و خوض کر رہے تھے۔ بہت سی ذہنی اور فکری الجھنیں قرآن فہمی کی راہ میں حائل نظر آتی تھیں۔ امام رازیؒ نے اپنے عہد تک کے مفکرین اور فلسفہ کے اعتراضات اور الجھنوں کو ذہن میں رکھ کر تفسیر قرآن کو مرتب کیا اور ان کے ایک ایک سوال کو بڑی شرح و بسط سے لکھا اور ہر ایک کا جواب نہایت عالمانہ طور پر دیا۔ چونکہ مسائل فلسفۂ و کلام پیش نظر تھے۔ اس لئے انہیں علوم کی زبان اسی اسلوب کے ساتھ استعمال کی گئی۔ زبان کی دقت' علمی مصطلحات اور فنی انداز و اسلوب نے تفسیر رازی کو مشکل بنا دیا۔ امام رازی کی فنی مہارت اور مشکل پسند طبیعت قارئین کے لئے قصور فہم کا موجب بن گئی اور بعض لوگ پکار اٹھے کہ "تفسیر رازی میں تفسیر کے سوا سب کچھ موجود ہے۔"

اندلس میں امام قرطبی نے الجامع لاحکام القرآن کے نام سے ایک نہایت بلند پایہ' مفصل اور مستند تفسیر لکھی۔ جس مین تمام تفسیری ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ احکام قرآن کی وضاحت اور استنباط مسائل پر خاص توجہ مرکوز کی گئی۔ قرطبی کی یہ تفسیر اپنی ضخامت کے باوجود بڑی مفید ثابت ہوئی۔

مختصر یہ کہ ہر دور کے علمی اور دینی رجحانات اور ضروریات کے پیش نظر علمائے

اسلام نے قرآن مجید کی وضاحت کرنے میں کبھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ متاخرین کی تفسیروں میں امام شوکانی کی فتح القدیر بھی بڑی مفید اور مقبول تفسیر تسلیم کی جاتی ہے۔

عصر حاضر کی عربی تفسیروں میں مفتی محمد عبدہٗ مصری، علامہ جمال الدین القاسمی اور المراغی کی تفسیریں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قرآن مجید کے مختلف زبانوں میں تراجم، بالخصوص اردو تفاسیر بھی اپنی ندرت اور اسلوب کے لحاظ سے ہماری توجہ کی مستحق ہیں، لیکن اردو میں تفسیر مواہب الرحمٰن مؤلفہ سید امیر علی جامع ہونے میں تمام تفاسیر پر سبقت لے گئی ہے۔

قرآن مجید کی بدولت ایک اور نہایت معزز اور متبرک علم وجود میں آیا ہے۔ یہ حدیث شریف کا علم ہے۔ یہ وہ اہم علم دین ہے جو قرآن مجید کے بعد شریعت اسلامی کا سرچشمہ اور دین کا نہایت ضروری اور لازمی مصدر و مآخذ ہے۔ اس علم کی بدولت سیرت النبی کے تمام پہلو، احکام دین اور آئین شریعت کی تمام جزئیات و تفصیلات بڑی احتیاط اور حفاظت کے ساتھ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات کی حفاظت اور صحت کے ساتھ روایت مطلوب و منظور تھی، اس لئے آپ نے اس کے بارے میں پوری احتیاط اور صحت روایت کے لیے ضروری ہدایات عطا فرمائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شریعت کی تفصیلات کی تکمیل ہو گئی اور ائمہ حدیث و محدثین کرام نے کتب حدیث کے انبار لگا دیئے۔ اس ضمن میں امام مالکؒ کی الموطا، امام شافعیؒ کی مسند، امام احمد بن حنبلؒ کی مسند، مسند طیالسی، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ محدثین کرام کے امت اسلامیہ پر بڑے احسانات ہیں کہ انہوں نے انتھک کوششیں کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہر پہلو کو ضبط کرکے ہم تک بحفاظت تمام پہنچا دیا۔ پھر شارحین حدیث کے قربان جائیے کہ انہوں نے ہر حدیث کے مطالب و معانی کو اس وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا کہ مسائل زندگی کا کوئی پہلو بھی تشنہ نظر نہیں آتا۔ ہماری سیاست، معاشرت، اقتصادیات، اخلاقیات، عمرانیات، ثقافت اور تعلیمات وغیرہ پر ایسی تفاصیل موجود ہیں جن کے

بعد امت کو کسی نئے ہدایت نامہ کی ضرورت محسوس ہوتی۔

قرآن و حدیث سے مسائل استنباط کئے گئے تو علم فقہ ایسا وقیع اور جامع علم پیدا ہوا۔

قرآن مجید کی بدولت علم تاریخ و سیر بھی معرض وجود میں آیا اور مسلمانوں نے سیرت النبی' سیر صحابہ' سیر تابعین اور پھر ساری امت کے مختلف طبقات پر بے شمار کتب تالیف کیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی بیان کرنے کے لئے بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں سیرت ابن ہشام اور اس کی شرح روض الانف' البلاذری کی انساب الاشراف (جلد اول)' ابن حزم کی جوامع السیرۃ' القسطلانی کی مواہب اللدنیہ اور اس کی شرح الزرقانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عصر حاضر کے بے شمار سیرت نگاروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر انگریزی' اردو' عربی' اور دیگر زبانوں میں عمدہ عمدہ کتب تالیف کی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات میں طبقات ابن سعد' ابن عبدالبر کی الاستیعاب' ابن الاثیر کی اسد الغابہ اور ابن حجر کی الاصابہ عربی زبان میں بڑی مشہور اور مستند کتابیں ہیں۔ عربوں نے سیرت نگاری پر اتنی کتابیں لکھی ہیں کہ دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اطباء' فلاسفہ' شعرا' صوفیاے کرام' محدثین' ادبا' حفاظ و قرا' علماے لغت و نحو' ملوک و سلاطین' وزرا و قضاۃ' غرض کہ ہر ملک' ہر دور ہر طبقہ اور ہر قسم کے لوگوں کے حالات زندگی ہمارے پاس موجود ہیں۔ عرب ہی پہلے مفکر ہیں جنہوں نے اپنے اکابر کے حالات زندگی صدی وار مرتب کیے۔ ان کی سیر و تراجم اور احوال و رجال کی کتابیں دیکھنے سے انسانی عقل و فکر دنگ رہ جاتے ہیں۔

اس طرح قرآن مجید کی بدولت ہماری اسلامی تاریخ دنیا کے مفکروں کے لئے حیرانی اور تعجب کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ابن جریر طبری کی کتاب الرسل و الملوک سے لے کر ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن کی مختصر تاریخ الاسلام تک ہزاروں مؤرخین نے اسلام کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ پر طبع آزمائی کی۔ تاریخ نویسی ہمارے اسلاف کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے' کم ہے۔

قرآن مجید کی بدولت ہمیں جو ایک اور اہم علم نصیب ہوا وہ لغت ہے۔ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے اس کے الفاظ کی تشریح و توضیح کے پیش نظر ساری عربی زبان کی لغات تیار کی گئیں۔ یہ علم اتنا شاندار اور اہم ہے کہ دنیا کی کوئی زبان عربی لغت نویسی کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ قرآن کی لغات الگ لکھی گئیں۔ حدیث شریف کی لغات علیحدہ تالیف کی گئیں اور عام لغات میں صرف ابن منظور افریقی کی لسان العرب ہی کو لیجیے اتنی ضخیم، اتنی مفصل اور جامع لغت کی کتاب دنیا کی کسی اور زبان میں موجود نہیں ہے۔

علم فلسفہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو الکندی، الفارابی، ابن سینا، ابن ماجہ، ابن طفیل، ابن رشد، الغزالی اور الرازی کے نام بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ مسلمان فلسفیوں نے ایک طرف تو فلسفہ یونان کو نئی زندگی بخشی اور دوسری طرف اسلامی فلسفہ کی بنیاد رکھ کر اس کو چار چاند لگا دیے۔

مسلمانوں نے قران مجید کی بدولت جدید سائنسی علوم پر بھی اپنے خاص انداز و اسلوب میں بہت کام کیا۔

چونکہ بات لمبی ہوتی جا رہی ہے اور ابھی بہت سے علوم قابل ذکر ہیں اس لیے میں ان علوم سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف یہ عرض کروں گا کہ آج کے دور میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان قرآن مجید سے رابطہ قائم کریں۔ قرآن مجید کو پڑھیں اور اس پر غور و خوض کریں۔ قرآن مجید کے تقاضوں کو سمجھیں۔ یہی وہ کتاب ھدیٰ تھی جس نے عربوں کو دنیا پر غالب کر دیا تھا اور ان کی سیاسی اور علمی ساکھ قائم کر دی تھی۔ آج ہمیں بھی اس نسخہ کیمیا کو آزمانا چاہیے، یہ کتاب آج بھی ہماری تمام مشکلات کا حل پیش کرتی ہے۔ صرف ایک مضبوط ارادے اور عزم کی ضرورت ہے کہ نوجوان آگے بڑھ کر قرآن مجید سے اپنا رشتہ پھر سے استوار کریں اور یقین جانیے کہ کل کا آفتاب اپنے ساتھ رفعت اور سربلندی کا پیغام لے کر آئے گا۔ قرآن مجید ہماری تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ اللہ تعالیٰ سے، اسلام سے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق استوار کرنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے قرآن مجید۔ قرآن مجید کی تلاوت اور اس پر عمل

دین و دنیا میں عزت و سرخروئی کا موجب ہے اور قرآن مجید سے اعراض و بے اعتنائی ذلت و ادبار اور افلاس و فقر کا باعث۔ اقوام و ملل کی ترقی کا انحصار تعلیم یافتہ نوجوانوں پر ہوتا ہے اور مسلمان قوم کی ترقی کا راز قرآن خواں اور عامل بالقرآن نوجوان ہیں۔ آیئے' آج سے ہم سب مل کر یہ عزم کریں کہ قرآن پڑھا کریں گے۔

قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور قرآن مجید کے احکام پر صدق دل سے عمل کریں گے۔ اگر ہم اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو گئے تو پھر دنیا کی قیادت و سیادت ہمارے ہی ہاتھ ہو گی۔

☆ بشکریہ مجلہ مرغزار' گورنمنٹ ڈگری کالج شیخوپورہ' جون ۱۹۶۶ء

قرآن اور علوم قرآن کی ضرورت و اہمیت

قرآن مجید ہی ایسی کتاب ہدایت ہے جس نے افراد اور اقوام عالم میں بے مثلی روحانی' اخلاقی اور سیاسی انقلاب پیدا کر کے انہیں دنیا کی قیادت و سیادت بخشی۔ دنیا میں معاشرتی عدل اور معاشی انصاف نافذ کیا۔ اخوت و مساوات کی بنیاد رکھ کر رنگ و نسل کے امتیازات کو یکسر مٹا دیا۔ جب تک مسلمان قرآن مجید پر کاربند رہے اور اس کے احکام کی اطاعت کرتے رہے وہ دنیا میں ہر اعتبار سے سربلند رہے۔ حکومت و سیادت' دانش و حکمت' دولت و ثروت اور علوم و معارف غرضیکہ ہر میدان میں مسلمانوں کے نام کا ڈنکا بجتا تھا اور زندگی کے ہر شعبے میں دنیا ان کی رہبری و قیادت تسلیم کرتی تھی۔

آج ہمارے ادبار و تنزل کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم اِتَّخَذُوۡا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَہۡجُوۡرًا (انہوں نے قرآن مجید پر عمل چھوڑ دیا' الفرقان' ۲۵:۳۰) کے زمرے میں شامل ہو گئے ہیں۔ ہم نے قرآن مجید کی تعلیمات سے انحراف کر لیا ہے' اسی لیے اس سزا کے مستحق ٹھہرے' جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمایا تھا:

وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا وَّنَحۡشُرُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اَعۡمٰی

یعنی اور جس شخص نے میرے ذکر سے اعراض کیا' تو اس کی زندگی تنگ ہو گی اور ہم اسے قیامت کے روز اندھا کر کے اٹھائیں گے۔

دنیا کی اس ذلت و رسوائی اور ادبار و تنزل کے علاوہ آخرت کا عذاب بڑا دردناک اور ناقابل برداشت ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق مرحمت فرمائے کہ ہم قرآن مجید کے حقوق کو پوری طرح ادا کر کے دنیا میں بھی عزت و آبرو حاصل کر سکیں اور آخرت کے ہولناک عذاب سے بھی مخلصی پا سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم کے دن یہ فرمان جاری کیا تھا:

فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی فَمَنۡ تَبِعَ ہُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (البقرہ' ۲:۳۸)' یعنی پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت' سو جو شخص پیروی کرے گا' میری اس ہدایت کی تو نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں

اور جب قرآن نازل فرمایا تو اعلان ہوا۔ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (البقرہ ۲:۲) یعنی اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں' ہدایت ہے متقی لوگوں کے لیے۔

آپ نے لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنایا اور قرآنی تعلیمات کے ذریعے ان کا تزکیہ نفس کیا۔ اتباع سنت' اطاعت رسول اور اسوۂ حسنہ کی تتبع کا تقاضا یہ ہے کہ ہم میدان عمل میں نکلیں' ہر چھوٹے' بڑے' بچے' بوڑھے اور مرد' عورت سب کو قرآن پڑھائیں' قرآن سکھائیں اور اس طرح امت کے لیے قرآن کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی راہ ہموار کریں۔ اس سلسلے میں دو تین باتیں خاص طور پر ذہن میں رکھنا بڑا ضروری ہے:

- ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عقیدہ کمزور ہوا تو محبت رسول کے زبانی دعوے تو قائم رہے لیکن حقیقی محبت رسول سے ہم تہی دامن ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اطاعت رسول کا جذبہ اور داعیہ کمزور تر ہوتا چلا گیا اور آج ہم سنت سے ناآشنا ہوتے جا رہے ہیں۔

ایمان بالآخرۃ کا عقیدہ کمزور ہوا تو ہم نے دنیوی مفادات ہی کو مطمح نظر ٹھہرا لیا اور ایمان کا سبق بھول گئے۔

آیئے آج تجدید ایمان او تجدید عہد کریں کہ ہم قرآن مجید کو سنت نبوی کی روشنی میں اپنی زندگیوں پر لاگو کریں گے اور زندگی کے ہر شعبے میں قرآن و سنت کو اپنا دستور حیات سمجھتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہوں گے۔

اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو ہماری دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں گی۔ اگر ہمیں بحیثیت مسلمان جینا اور بحیثیت مسلمان مرنا ہے تو اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ قرآن و سنت کو اپنائیں اور قرآن و سنت کے مطابق زندگی بسر کریں اور پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایسا نہ کر پائیں۔ یہی اور صرف یہی طریق کار ہے جس سے دنیوی زندگی میں آسائش' اطمینان' امن و سکون' چین و راحت میسر آئیں گے۔ اس وقت دنیا اور ہماری آخرت درست ہو سکتی ہے۔ اگر ایمان بالآخرت پکا اور سچا ہو جائے تو ہمارے مسائل یک دم حل ہو جائیں گے۔

○○○

جواہر اللسان فی لغات القرآن

قرآن شریف کے مخاطب اول عرب تھے' وہ زندگی اور ماحول کی سادگی کے ساتھ ذہنی سادگی کی نعمت سے بھی بہرہ مند تھے۔ ایمان وایقان کی دولت نے انہیں تعمق و تکلف اور فلسفیانہ موشگافیوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دور میں قرآن مجید کے بہت کم مقامات ایسے تھے جنہیں تفسیر طلب سمجھا گیا۔ اگر احادیث کے ذخیرہ تفسیر کو جمع کیا جائے تو چند آیتوں کی تفسیر کے سوا کچھ نہ مل سکے گا(۱)۔

اس ضمن میں دو نظریے ہمارے سامنے ہیں۔ ایک نظریے کی ترجمانی کرتے ہوئے ابن خلدون رقمطراز ہے کہ۔

"ان القرآن نزل بلغة العرب و علیٰ اسالیب بلاغتہم' فکانوا کلھم یفھمونہ و یعلمون معانیہٗ فی مفرداتہ و تراکیبہ"

(۲)

"قرآن مجید عربوں کی زبان اور ان ہی کے اسلوب بیان میں نازل ہوا۔ تمام عرب قرآن مجید کو سمجھتے تھے' اور اس کے مفرو اور مرکب الفاظ کے حقیقی و مجازی معانی جانتے تھے"

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اگرچہ قرآن مجید عربوں کی زبان میں نازل ہوا' پھر بھی سارے عرب قرآن مجید کے اجمال و تفصیل سے پوری طرح آگاہ نہ تھے۔ ہر شخص اپنی عقل و دانش اور فہم و فراست کے مطابق کتاب کو سمجھنے کی استعداد رکھتا ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں ایسی استعداد اور قابلیت کے لحاظ سے خاصا ذہنی فرق ہوتا ہے۔ عربوں کی بھی یہی حالت تھی' بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا

۱۔ امام مسلم نے اپنی صحیح کے آخر میں کتاب التفسیر کے تحت کل ۳۴ حدیثیں ذکر کی ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو صحیح بخاری اور ترمذی بذیل تفسیر القرآن۔

۲۔ مقدمہ ۳٦٦

کہ تمام عرب قرآن مجید کے تمام الفاظ اور ان کے معانی کو نہ سمجھتے تھے(۳).

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ بن الخطاب سے آیت ـ ـ ـ وفاکھۃ و ابا میں لفظ ابا کے معنے پوچھے تو حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ہمیں تعمق اور تکلف سے روک دیا گیا ہے(۴).

صحابہ کرام میں ایسے بزرگ بھی ملتے ہیں جو قرآن مجید کی چند آیات حفظ کرتے اور جب تک ان مطالب و معانی کو پوری طرح سمجھ نہ لیتے آگے نہ چلتے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفانؓ عبداللہ بن مسعود اور دوسرے صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے دس دس آئتیں سیکھتے' تو ساتھ ہی ان کا پورا مفہوم بھی ذہن نشین کرتے جاتے اور علم و عمل کے تمام حقائق سے آگاہی حاصل کر لینے کے بعد آگے بڑھتے۔ امام جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ

"حضرت عبداللہ بن عمرؓ آٹھ برس تک سورہ بقرہ کو حفظ کرتے رہے۔ ان کا دستور یہ تھا کہ ایک آیت حفظ کرتے اور اس کا پورا مفہوم و مطلب سمجھ لینے کے بعد دوسری آیت شروع کرتے۔"

صحابہ عرب تھے' قرآن مجید ان کی زبان میں نازل ہوا' لیکن اس کے باوجود قرآن فہمی میں ان کے مختلف مدارج ہیں۔ جب قرآن عجمیوں تک پہنچا تو الفاظ کی تشریح و توضیح اور تفسیری حواشی کی ضرورت اور زیادہ ہو گئی.

قرآن مجید کی تفسیری تشریحات و توضیحات کے لیے مختلف طریقے اختیار کئے گئے۔ یہاں محض ان تفسیری کوششوں کے ذکر پر اکتفا کیا جائے گا۔ جن کا تعلق لفظی تشریح و توضیح اور لغات و معانی سے ہے۔

ابن ندیم نے اس قسم کی کوششوں کے لیے تین عنوان قائم کئے ہیں۔

۳۔ فجر الاسلام ج ا' ۲۳۰ طبع ثانی.

۴۔ الموافقات للشاطبی ج ۲' ۵۷: ۳ الاتقان ج ۲' صفحہ ۲۰۸.

پہلے عنوان کے نیچے ان کتابوں کی فہرست اور مؤلفین کے اسماء درج کیے ہیں، جو معانی القرآن کے نام سے لکھی گئی ہیں، وہ بتاتا ہے کہ مندرجہ ذیل لوگوں نے اس نام سے کتابیں لکھی ہیں (۵):

یونس بن حبیب (متوفی ۱۸۳ھ)، ابوفید مورج السدوسی (م۱۹۵ھ)، الکسائی (م۱۹۷ھ) قطرب النحوی (م ۲۰۶ھ)، ابو عبیدہ (م ۲۱۰ھ)، الاخفش سعید بن مسعدہ (م۲۱۱ھ)، المبرّد (م ۲۸۵ھ)، ثعلب (م ۲۹۱ھ)، الزجاج (م ۳۱۰ھ)، الروَاسی، ابو محمد السدوسی، المفضّل بن مسلمہ، ابن کیسان، ابن الانباری، الحلف النحوی، ابو معاذالفضل بن خلف النحوی۔

دوسرے عنوان کے نیچے ان مؤلفوں کی فہرست دی گئی ہے جنہوں نے قرآن کالغت غریب القرآن کے نام سے لکھا ہے (۶)۔ مثلاً ابوعبیدہ، مؤرج السدوسی، ابن قتیبہ، ابوعبدالرحمن الیزیدی، محمد بن سلام الجمحی، ابو جعفر بن رستم الطبری، ابوعبیدالقاسم، محمد بن عزیز السجستانی، ابوبکر بن الوراق، ابوالحسن العروضی، محمد بن دینارالاحول، ابوزیدالبلخی اور نفطویہ (۷)۔

تیسرے عنوان کے تحت ابن ندیم نے لغات القرآن کے مؤلفوں کے نام درج کیے ہیں۔ مثلاً الفراء، ابوزید، الاصمعی، الہیثم بن عدی، محمد بن نجیح، القطیعی اور ابن درید۔ کہا جاتا ہے کہ ابن درید لغات القرآن کو مکمل نہ کرسکا (۸)۔

اس ضمن میں یہ اولیں کوششیں تھیں، پھر ہر زمانہ میں علمائے کرام اور ماہرین لغت اس موضوع پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ امام راغب کی مفردات کو اس نوع کے لٹریچر میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔

۵۔ الفہرست ج ۱، ۳۴ فلوگل ایڈیشن: ۲، الفہرست ج ۱، صفحہ ۳۵۔

۶۔ ایضا ۸۱: ۴ ایضا صفحہ ۳۵۔

۷۔ ابن منظور اور اس کی لسان العرب پر میرا ایک مفصل مضمون معارف بابت ماہ جنوری ۱۹۴۴ء میں شائع ہوچکا ہے وہاں ملاحظہ فرمایا جائے (اس مجموعہ میں بھی شامل ہے)

۸۔ یہ دونوں فہرستیں اورینٹل کالج میگزین میں بالاقساط شائع ہوچکی ہیں۔

ابن منظورالافریقی المصری (۶۳۰-۷۱۱ھ) کی (۸)۔ "لسان العرب" عربی کا سب سے بڑا مفصل جامع اور مستند لغت ہے۔ یہ درست ہے کہ اس سے پہلے بھی عربی زبان کی مستند لغات کا ایک خاطر خواہ ذخیرہ موجود تھا' لیکن ابن منظور کو ان سب پر کوئی نہ کوئی اعتراض ضرور تھا۔ کسی کی ترتیب پسند نہ تھی اور کسی کی جامعیت' مواد اور ذخیرہ الفاظ غیر تسلی بخش نظر آیا۔ بہر کیف لسان العرب اپنی ضخامت' وسعت معلومات' شواہد کی فراہمی' ذخیرہ الفاظ اور مطالب و معانی کے بیان کے اعتبار سے بے نظیر لغت ہے۔ یہ کتاب بیس ضخیم جلدوں میں بڑے سائز کے کوئی آٹھ دس ہزار صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی ترتیب بھی ایسی ہے کہ جس سے آج کل کے ذہن کم آشنا ہیں۔ اس کے علاوہ الفاظ کی تشریح' معانی کی وسعت' اشعار کی سندیں' محاورات اور مثالیں اس مشغولیت کے زمانے میں ...را اور اکتا دینے والی چیزیں ہیں۔

جن دنوں میں لسان العرب کے شعرا اور قوانی کی فہرستیں تیار کر رہا تھا' میں نے مناسب سمجھا کہ ایک تو اتنے اہم ذخیرہ معلومات کے افادی پہلو سے لوگوں کو آشنا کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کی افادی حیثیت سے استفادہ آسان اور سہل بنا دیا جائے۔ چنانچہ میں نے "جواہر اللسان فی لغات القرآن" کے نام سے ایک کتاب کی تالیف شروع کردی۔ تمام اشعار و شواہد' مثالیں اور محاورات نظرانداز کرتے ہوئے صرف الفاظ قرآنی کے معانی کو اکٹھا کر دیا تاکہ عوام و خواص دونوں اس بابرکت ذخیرہ الفاظ سے بآسانی مستفید ہوسکیں۔ یہ لغت قرآن اپنی نوع کی دوسری کتابوں کی علمی حیثیت میں معتدبہ اضافہ کا موجب ہوگا۔

ابن منظور کا انداز بیان بڑا سادہ اور آسان ہے۔ ایک معمولی استعداد رکھنے والا طالب علم بھی اس لغت قرآن سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کچھ الفاظ اور ان کے معانی بطور نمونہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں' تاکہ قارئین کرام اس کی افادیت کا صحیح اندازہ فرماسکیں۔ پہلے الفاظ قرآنی درج کئے ہیں' پھر وہ

آیت قرآنی جس میں ان الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ بعدازاں (:) اس نشان کے بعد معانی مندرج ہیں۔ سب سے آخر میں لسان العرب کا حوالہ بھی درج کردیا گیا ہے تاکہ تفصیلات کا شوق رکھنے والے حضرات تشنگی کا گلہ نہ کریں۔ کتاب کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہوگی(۹)۔

عوج' امت (لَا تَرٰی فِیْهَا عِوَجًا وَّ لَا اَمْتًا): لا انخفاض فیها ولا ارتفاع (۲: ۳۰۹)

جبت' طاغوت (اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتَابِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ) الجبت: السحر' الطاغوت: الشیطان (۲: ۳۲۵)

اشتات (یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا): قال ابو اسحاق ای یصدرون متفرقین منهم من عمل صالحا و منهم من عمل شرا (۲: ۳۵۳)

عنت ۱۔ (وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوْ یُطِیْعُکُمْ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ): لو قعتم فی عنت ای فی فساد وهلاک (۲: ۳۶۵)۔

۲۔ (وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَ عْنَتَکُمْ) لو شاء لشد دکم و تعبد کم بما یصعب علیکم' و قیل لا هلککم (۲: ۳۶۶)۔

۳۔ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْکُمْ): الفجور والزنا (۲: ۳۶۶)۔

مقیت (وَ کَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا): المقتدر' القدیر' الحفیظ (۲: ۳۸۰)۔

موقوت (اِنَّ الصَّلٰوةَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا): کتبت علیهم فی اوقات موقتة (۲: ۴۱۳)۔

۹۔ خواہش تو یہ بھی ہے کہ ہر آیت کا حوالہ یعنی سورت اور آیت کا نمبر بھی درج کردوں۔ وماتوفیقی الاباللہ

بث	(وَ بَثَّ فِیهَا رِجَالًا کَثِیرًا وَّ نِسَاءً): نشرو کثر (۲: ۲۱۸).
منبثا	(کَانَتْ هَبَاءً مُنْبَثًّا): غبارا منتشرا (۲: ۲۱۸)
وزر	(کَلَّا لَا وَزَرَ) الوزر فی کلام العرب الجبل الذی یلتجا الیه' هذا اصله: و کل ما التجات الیه و تحصنت به فهو وزر و معنی الایه: لا شی یعتصم فیه من امراللّٰه (۷: ۱۴۵)..
اشمازت	(وَاِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ): نفرت (۷: ۲۲۹).
معاجزین	(وَالَّذِیْنَ سَعَوْا فِیْ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ): معاندین (۷: ۲۳۵).
اعزة	(اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ): غلیظ' واشداء (۷: ۲۴۲).
عز	(وَ عَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ): غلبنی فی الاحتجاج (۷: ۲۴۵).
امتازوا	(وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ): انفردوا عن المومنین (۷: ۲۸۰).
هزی	(وَهُزِّیْ اِلَیْکَ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ): حرکی (۷: ۲۹۱).
ییئس	(اَفَلَم ییئس الذین اٰمَنُوْا اَنْ لَّوْ یَشَاءُ اللّٰهُ لَهَدَی النَّاسَ جَمِیْعًا): افلم یعلم (۸: ۱۴۷).
الفحشاء	(اَلشَّیْطَانُ یَعِدُ کُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَاءِ): البخل' والعرب تسمی البخیل فاحشا (۸: ۲۱۶).
قط	(عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا): نصیبنا من العذاب (۸: ۲۵۸).
حافظوا	(حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ): صلو ما فی اوقاتها۹ الازهری: واظبوا علی اقامتها فی مواقیتها (۹: ۳۲۰).
الرجع	(وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ): ذات المطر' ویقال ذات النفع (۹: ۴۷۹).

ینزفون	﴿لَا یُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا یُنْزَفُوْنَ﴾ لا یسکرون (۱۱: ۲۳۹).
السوق	﴿فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ﴾: السوق جمع سهاق مثل داد و دود (۱۲: ۳۰۴).
شق	﴿لَمْ تَكُوْنُوْا بَالِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ﴾: اصله من الشق نصف الشی کانه قد ذهب بنصف انفسکم حتی بلغتموه (۱۲: ۵۰).
شقاق	﴿اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ﴾: الشقاق العداوة بين فريقين والخلاف بين اثنين (۱۲: ۲۲۸).
نتق	﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ﴾: زعزعناه و رفعناه و جاء فی الخبر انه اقتلع من مکانه (۱۲: ۲۲۸).
تل	﴿فَلَمَّا اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ﴾: تله صرعه کما تقول کبه لوجهه (۱۳: ۸۲).
حمل	﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾: قال الزجاج معنی یحملنها یخینها لم تحمل الامانة ای ادتها و کل من خان الامانة فقد حملها (۱۳: ۱۸۵، ۱۸۶).
ضل	﴿لَا يَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا يَنْسٰى﴾: لا یوته، و قیل معناه لا یغیب عن شی ولا یغیب عنه شی (۱۳: ۳۱۶، ۳۱۷).
قبل	﴿فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا﴾: لا طاقة لهم بها ولا قدرة لهم علی مقاومتها (۱۴: ۵۹).
المحال	﴿شَدِيْدُ الْمِحَالِ﴾: الغضب والتدبير (۱۴: ۱۴۱).
الحکم	﴿وَاٰتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾: علما و فقها (۱۵: ۳۰).
زعیم	﴿وَاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ﴾: و انا به کفیل (۱۵: ۱۵۸).

کریم (وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا): سهلا لينا (۱۵: ۲۱۷).

اللّمم (اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ): هو صغار الذنوب (۱۶: ۲۳).

سقیم (فَنَظَرَ نَظْرَةً فِى النُّجُوْمِ فَقَالَ اِنِّىْ سَقِيْمٌ): تفكر ليدبر حجة. قال انى سقيم اى من كفر كم (۱۶: ۴۸).

هم (وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ج وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ): قال ابوعبيدة هنا على التقديم والتاخير كانه ارا د : ولقد همت به ولو لا ان راى برهان ربه لهم بها (۱۶: ۱۰۴).

○

اسلام میں علم کی اہمیت

اسلام نے علم کو بڑی اہمیت اور فضیلت دی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے علم الاسماء حاصل کر کے فرشتوں پر برتری پائی۔ قرآن مجید کی جو پہلی وحی نازل ہوئی اس میں بھی انسان کی تخلیق اور اس کے حصول علم کا بطور انعام الٰہی اور عطیہ ربانی ذکر فرمایا۔ ارشاد باری ہے۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ۔ (العلق، ۹۶: ۴)، یعنی سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اس پہلی وحی میں ایک لطف نکتہ یہ ہے کہ تخلیق انسان کو بطور نعمت رب کی طرف منسوب کیا گیا ہے، مگر دولت علم کو رب اکرم کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم ایسی گراں قدر نعمت ہے جو ازحد کرم کرنے والے پروردگار کا خاص کرم اور خاص لطف و عنایت ہے۔ اس آیت کی رو سے علم اللہ کا سب سے بڑا کرم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین کی خلافت و نیابت کے ساتھ علم و حکمت کی خلافت بھی بخشی ہے۔

قرآن مجید نے طالوت کے قصے میں بھی علم کی فضیلت بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ طاقت و عظمت کا سرچشمہ صرف دولت ہی نہیں بلکہ قوت و عظمت کا اصلی منبع علمی قوت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرہ، ۲: ۲۴۷) یعنی اور اللہ تعالیٰ نے اس (طالوت) کو علم اور جسم میں کشادگی عطا فرمائی اور فی الواقع طالوت نے اپنے علم اور جسم کی قوتوں سے اسرائیل کے کھوئے ہوئے وقار اور عظمت رفتہ کو دوبارہ بحال کیا۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جلالت قدر اور عظمت شان کے باوجود حکم الٰہی تھا کہ آپؐ علم کی فراوانی کے لئے دعا کرتے رہا کریں۔ فرمایا قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ

عِلْمًا (طٰہٰ ۲۰: ۱۱۴)' یعنی اے اللہ میرے علم میں اضافہ فرما۔

علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے' لیکن اس کی فرضیت اور حدود علم کی تفصیل میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ اسحاق بن راہویہ نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے وضو' نماز' زکوٰۃ اور حج وغیرہ ضروریات دین کا علم حاصل کرنا لازمی ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ آدمی کو اتنا علم ضرور حاصل کرنا چاہیے کہ اپنے دین میں فائدہ اٹھا سکے۔

عبداللہ بن مبارکؒ کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ جس بات میں شک ہو اس میں سوال کرنا فرض ہے' تاکہ شک دور ہو جائے۔ حضرت سفیان بن عینیہ کہتے ہیں کہ تحصیل علم اور جہاد مسلمانوں کی جماعت پر فرض کفایہ ہے۔ ایک گروہ ادا کر دے تو باقی لوگ سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ احمد بن صالح بھی یہی مراد لیتے ہیں۔

علما کے نزدیک علم کی دو قسمیں ہیں: (۱) فرض عین اور (۲) فرض کفایہ۔ دین کے فرائض کا اجمالی علم سیکھنا فرض عین ہے۔ اس کی تحصیل ہر آدمی کے لیے لازمی ہے۔ اس میں کلمۂ شہادت میں زبان و قلب سے اس بات کا اقرار کہ اللہ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں' کوئی نظیر نہیں۔ ان باتوں کا علم بھی ضروری ہے جن کے بغیر نماز پوری نہیں ہوتی' مثلاً طہارت' نماز کے ارکان و احکام اور یہ کہ رمضان کے روزے فرض ہیں اور روزے کے احکام کا علم بھی فرض ہے۔ مالدار آدمی کے لئے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ زکوٰۃ کن چیزوں پر فرض ہے۔ اس طرح انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حلال و حرام چیزوں کا علم بھی لازمی ہے۔

ان کے علاوہ دوسرے علوم کی تحصیل و ترویج اور ان میں تبحر فرض کفایہ ہے ایسے علم کو اگر ایک آدمی بھی حاصل کر لے تو اس علاقے کے باقی لوگوں سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے۔

جعفر بن محمد کے نزدیک علم چار باتوں میں منحصر ہے: (۱) پروردگار کی معرفت' (۲) اس کے احسانات کی معرفت' (۳) اس کے احکام کی معرفت' (۴) ان امور کی معرفت جو انسان کو دین سے نکال کر بے دین بنا دیتے ہیں۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کو قرآن مجید کے حصول اور رحمت الٰہی کا موجب قرار دیا ہے۔ نیز طلب علم کو حصول جنت کا ذریعہ ٹھہرایا۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم و ہدایت کو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے ملی تیز بارش سے تشبیہ دی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے بذریعہ وحی فرمایا کہ میں علیم ہوں اور ہر صاحب علم سے محبت کرتا ہوں۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سیکھنا اور سکھانا ذکر خداوندی سے بہتر ہے۔ نیز فرمایا کہ خود مجھے اللہ تعالیٰ نے علم کتاب سکھانے کے لیے بھیجا ہے۔

حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ محض اللہ کی خاطر علم حدیث کا حصول دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔ امام زہری کہتے ہیں کہ علم سے بہتر کوئی ایسا طریقہ نہیں، جس سے عبادات الٰہی ممکن ہو۔

اسحاق بن ابراہیم کے نزدیک علم ضرور حاصل کرنا چاہیے، کیوں کہ علم ہدایت کی راہ دکھاتا ہے اور ہلاکت سے بچاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالم زمین میں خدا کا امین ہے۔

حسن بصری کہتے ہیں کہ علم کا ایک باب سیکھنا اور اس پر عمل کرنا دنیا اور دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود لڑکوں کو پڑھتے دیکھتے تو فرماتے "شاباش! تم حکمت کے سرچشمے ہو، تاریکی میں روشنی ہو۔ تمہارے کپڑے پھٹے پرانے ہیں، مگر تمہارے دل تر و تازہ ہیں۔ تم علم کے لیے گھروں میں قید ہوئے ہو، مگر تم قوم کے مہکنے والے پھول ہو"۔

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علم حاصل کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے علم کی تعلیم خشیت ہے۔ علم طلب کرنا عبادت ہے۔ علم کا مذاکرہ تسبیح ہے۔ علم حلال و حرام کا نشان ہے، جنت کے راستوں پر روشنی کا ستون ہے، تنہائی میں مونس ہے، پردیس میں رفیق ہے، خلوت میں ندیم ہے، دشمن کے مقابلے میں ہتھیار

ہے' دوستوں میں زینت ہے' علم کے ذریعے سربلندی اور امامت ملتی ہے۔ علم اہل علم کی سیرت کو نمونہ بنایا جاتا ہے اور ان کے لیے تر و بحر کے رہنے والے دعا کرتے ہیں۔

حضرت سفیان ثوری کے نزدیک علم دنیا میں بھی باعث عزت ہے اور آخرت میں بھی۔

خلیفہ عبدالملک بن مروان نے علم کو دولت مند کا جمال اور غریب کی دولت قرار دیا ہے۔ حضرت ابو الدرداء سے مروی ہے کہ علم کی دولت خوش نصیب آدمی کو ملتی ہے اور بدنصیب اس سے محروم رہتا ہے۔

داناؤں کا کہنا ہے کہ اہل علم کی برتری کا ثبوت یہ ہے کہ لوگ ان کی تائید کرتے ہیں' علم کو عبادت پر بھی فضیلت حاصل ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر چیز کا ستون ہوتا ہے اور اس دین کا ستون علم ہے۔

حضرت سفیان ثوری کہا کرتے تھے کہ نیک نیت ہو کر طلب علم سے افضل کوئی عمل نہیں۔

ایک حدیث میں طلب علم کے دوران موت کو شہادت قرار دیا گیا ہے۔

دوسری حدیث میں عالم کو شہید پر فضیلت دی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نزدیک مسجد میں بیٹھ کر فرائض و سنت کی اور علم دین کی تعلیم دینا جہاد سے افضل عمل ہے۔

اسلام میں نیکی کی تعلیم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بھلائی کرنے والا اور بھلائی کی راہ دکھانے والا ثواب میں دونوں برابر ہیں۔

کم عمری میں تحصیل علم ضروری اور مفید ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو لڑکا طالب عالم اور عبادت میں نشوونما پاتا ہے' یہاں تک کہ بڑا ہو جاتا ہے اور اپنی اسی حالت پر استوار رہتا ہے اسے ستر صدیقوں کا ثواب ملتا ہے۔

حسن بصری کا قول ہے کہ بچپن میں تحصیل علم پتھر پر لکیر کی طرح ہے۔

ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ بوڑھا آدمی جوان سے علم حاصل کرنے میں نہ شرمائے۔

طلب علم کے لیے سوال ضروری ہے۔ محدثین کے نزدیک علم ایک خزانہ ہے اور سوال اس کی کنجی۔ (ابن شہاب) کثرت سوال سے علم کے نئے نئے دروازے کھلتے ہیں اور علم سکھانے سے علم تازہ رہتا ہے۔

اہل علم سلیقہ سوال کو نصف علم قرار دیتے ہیں (سلیمان بن یسار)

طالب علم میں شرم اور حجاب محرومی کا باعث ہے۔

حصول علم کے لیے آسائش اور تن آسانی کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔

محدثین نے طلب علم کے لیے بڑے دور دراز کے سفر اختیار کیے۔ بعض اوقات ایک ایک حدیث کے لیے کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں سفر کرنا پڑا۔

محدثین کا اصول ہے کہ حاصل کردہ علم پر قناعت نہ کرنی چاہیے۔ علم کے لیے ہر وقت کوشاں رہنا چاہیے۔

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: علم سے مومن کو کبھی سیری نہیں ہوتی۔ وہ علم حاصل ہی کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جنت میں پہنچ جاتا ہے۔

عبداللہ بن مبارکؒ سے پوچھا گیا۔ آپ کب تک علم حاصل کرتے رہیں گے۔ جواب دیا موت تک۔

حضرت سفیان بن عینیہ سے پوچھا گیا کہ طلب علم کی ضرورت سب سے زیادہ کسے ہے؟ جواب دیا جو سب سے زیادہ صاحب علم ہے۔

ابن ابی غسان کا قول ہے آدمی اس وقت تک عالم ہے جب تک طالب علم ہے اور جب طالب علمی کو خیرباد کہہ دے تو جاہل ہے۔

مشہور قول ہے کہ آدمی عالم پیدا نہیں ہوتا بلکہ علم سیکھ کر عالم بنتا ہے۔

ابن شبیب کہا کرتے تھے کہ طبیعت تربیت سے بنتی ہے اور علم تلاش و طلب سے

ملتا ہے۔

حضرت علی کا قول ہے کہ علم گمشدہ متاع ہے جہاں ملے' لے لو' علم سیکھنے میں عیب نہ سمجھو۔ آپس میں ملو جلو اور علم کا چرچا کرو' ورنہ علم جاتا رہے گا۔ حدیث کا مذاکرہ کرو۔ کیوں کہ علم مذاکرے سے بڑھتا ہے۔

فراء کا قول ہے: مجھے دو آدمیوں پر بڑا رحم آتا ہے: ایک اس پر جو علم حاصل کرنا چاہتا ہے' مگر سمجھ نہیں رکھتا اور دوسرے اس پر جو سمجھ رکھتا ہے' مگر علم حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ ان لوگوں پر بڑا تعجب ہے جو علم حاصل کرنے پر قدرت اور طاقت رکھتے ہیں مگر علم حاصل نہیں کرتے۔

حضرت ابو ہریرہ کا قول ہے کہ علم کو چھوڑ دیا جائے تو علم ضائع ہو جاتا ہے۔ زہری کا قول ہے کہ آدمی تھک جاتا ہے' مگر علم ختم نہیں ہوتا۔ علم کو بتدریج حاصل کرو۔ وہ احادیث روایت کر چکتے' تو شعرو شاعری اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگتے تاکہ تھکاوٹ دور ہو سکے اور دل و دماغ کو راحت و سکون میسر آسکے۔

علم کو چھپانا' علم میں جھوٹ کی آمیزش کرنا' اہل علم کی ناقدری کرنا' علم کے لیے بربادی' ہلاکت اور آفت کا حکم رکھتا ہے۔

محدثین کا قول ہے کہ اپنا علم جاہلوں کو دو اور عالموں کا علم خود لو۔ اس طرح تمہارا علم محفوظ رہے گا اور جہالت دور ہو جائے گی۔

محدثین علم میں تدریجی ترقی کے حامی اور قائل تھے۔ ابن شہاب الزھری کہا کرتے تھے کہ علم کو بتدریج حاصل کرو۔ لیل و نہار کی سست رفتاری کے ساتھ چل کر اسے حاصل کرو۔ اسے یک مشت لینے کی کوشش نہ کرو' کیونکہ ایسی کوشش علم کے باب میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

وہ حصول علم کے دوران میں تفریح کے بھی قائل تھے۔ ابن شہاب الزھری کا دستور تھا کہ جب بہت سی حدیثیں روایت کر چکتے تو شاگردوں سے فرماتے ہاں ذرا اپنے اشعار لاؤ۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرو' کان تھک جاتے ہیں دل اکتا جاتا ہے۔ ابن شہاب ہی

کا قول ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے شعر و شاعری وغیرہ سے دل بہلا لیا کرو۔

محدثین علم کے باب میں انتخاب کے بھی قائل تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ علم کا احاطہ نہیں ہو سکتا' لہذا علم میں انتخاب سے کام لو۔

ایک قدیم مقولہ ہے کہ جید عالم وہ ہے جو اپنی بہترین مسموعات لکھتا ہے۔ اپنی بہترین مکتوبات حفظ کرتا ہے اور اپنی بہترین محفوظات روایت کرتا ہے۔

محدثین حصول علم کے بارے میں حسن نیت اور خلوص کے بھی قائل تھے۔ رہا بحث و مباحثے یا فخر و مباہات کے ارادے سے حصول علم تو اسے ناپسند کیا جاتا تھا۔ طالب علم میں شرم و حجاب' علم کی ناقدری اور جہالت سے محبت کو بھی معیوب اور مذموم سمجھا جاتا تھا (حضرت عباسؓ)

حضرت علی رضی اللہ تعالی کا قول ہے کہ علم حاصل کرو' مگر عقل و وقار کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ استادوں اور شاگردوں سے نرمی اور حلم سے پیش آؤ۔ جبار عالم نہ بنو کہ تمہارا باطل تمہارے حق کو برباد کر ڈالے۔

محدثین کے نزدیک علم کے لئے کچھ آفات بھی ہیں۔ امام زہری کا قول ہے کہ علم پر بھی بربادیاں آتی ہیں۔ ایک بربادی یہ ہے کہ عالم کو ناقدری سے چھوڑ دیا جائے اور عالم اپنا علم سینے میں چھپائے ہوئے مر جائے۔ ایک بربادی یہ ہے کہ علم میں جھوٹ کی آمیزش کر دی جائے۔ جو علم کی سب سے بڑی بربادی ہے۔

ایک روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم کی آفت نسیان ہے اور علم کی تباہی یہ ہے کہ اسے کسی نااہل کے حوالے کر دیا جائے۔

ooo

خاکہ برائے کتاب "تاریخ علوم اسلامیہ"

پروفیسر عبدالقیوم صاحب کے کاغذات دیکھنے سے پتہ چلا کہ مرحوم کے ذہن میں سیرت طیبہ کی طرح علوم اسلامیہ کی ایک جامع اور مفصل ومبسوط تاریخ لکھنے کا منصوبہ بھی موجود تھا، مگر قدرت نے آپ کو اس کار خیر کو مکمل کرنے کی مہلت نہ دی۔

مرحوم نے اس عنوان پر جو خاکہ مرتب کیا تھا، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم اسلامیہ کی تاریخ پر آپ کو شرح صدر حاصل تھا اور اگر آپ کو اس کا موقع ملتا، تو یہ کتاب ایک علمی اور تحقیقی اعتبار سے ایک یادگار کتاب ہوتی۔

بہر حال ہم اس توقع پر کہ شاید کوئی صاحب نظر اس پروگرام کو مکمل کر سکے، ہم ان کا مرتبہ خاکہ من و عن شائع کر رہے ہیں (مرتب)

۱۔ علوم القرآن:

علوم القرآن، ایک وسیع اصطلاح ہے۔ اس اصطلاح کے تحت حسب ذیل عنوانات پر بحث کی جائے گی:

(۱) نزول قرآن مجید: جمع و کتابت قرآن، آیات و سور کی ترتیب توفیقی ہے

(۲) الاحرف السبعہ کا مفہوم

(۳) علم سور المکی والمدنی

(۴) علم الناسخ والمنسوخ

(۵) علم احکام القرآن

(۶) علم المحکم والمتشابہ

(۷) علم اقسام القرآن

(۸) اعجاز القرآن

(۹) علم القراءات

۲ علم التفسیر

اس عنوان کے تحت حسب ذیل علوم پر بحث کی جائے گی:

التفسیر بالماثور

التفسیر بالرای' (الرای الجائز' والرای المذموم)

مثلاً ابن جریر الطبری' ابن کثیر' السیوطی' الشوکانی' الرازی' البیضاوی' ابو سعود' النسفی' خازن' الزمخشری' القرطبی' الآلوسی' ابوحیان الاندلسی اور علی المھائمی (السندی) اور دیگر نامور مفسرین اور ان کی فارسی اور اردو تفاسیر۔ نواب صدیق حسن خاں اور ان کی ترجمان القرآن' تفسیر مواھب الرحمٰن مؤلفہ سید امیر علی علاوہ ازیں ہر مکتب فکر کے علما نے جو تفاسیر لکھی ہیں ان کا مختصر جائزہ۔

جدید مفسرین' مثلاً مفتی عبدہٗ و سید رشید رضا' جمال الدین القاسمی' المراغی' سید قطب وغیرہ۔

۳۔ علوم الحدیث:

(۱) حدیث و سنت کا معنی و مفہوم اور اس کا پس منظر

(۲) کتابت حدیث عہد نبوی میں

(۳) عہد صحابہ میں

(۴) عہد تابعین میں

(۵) کتاب مسانید

(۶) الصحاح ستہ اور دیگر اہم مجموعے

(۷) مکانۃ الحدیث فی التشریع

(۸) علم الجرح و التعدیل

(۹) علم رجال الحدیث

(۱۰) علم مختلف الحدیث

(۱۱) علم علل الحدیث

(۱۲) علم غریب الحدیث

(۱۳) علم الناسخ والمنسوخ

۴۔ علم الفقہ:

(۱) مآخذ اصلی:

۱۔ قرآن؛ ۲۔ حدیث؛ ۳۔ اجماع اور ۴۔ قیاس

(۲) فقہی مذاہب:

۱۔ احناف، ۲۔ شوافع، ۳۔ مالکی، ۴۔ حنبلی

(۳) مشہور فقہا اور کتب فقہ:

۵۔ تاریخ نگاری:

کتب فتوحات

کتب تاریخ

اقسام کتب تاریخ

۶۔ سیرت و تراجم نویسی:

(۱) سیرت النبی اور اس کا تاریخی پس منظر اور عہد بعہد اس کا ارتقا

(۲) سیر صحابہ

(۳) سیر اور عام کتب تراجم

(۴) کتب تراجم کے طبقات

(۵) عمومی کتب تراجم

(۶) صدی وار کتب تراجم

۷۔ علم جغرافیہ:

مشہور مسلم جغرافیہ دان اور ان کی تصانیف

۸۔ لغت نویسی:

مشہور لغت نویس اور ان کے علمی کارنامے

۹۔ علم اللغہ:

علم النحو۔ علم الشعر، فقہ اللغہ۔

۱۰۔ علم الطب:

مشہور اطبا اور ان کی طبی خدمات

۱۱۔ علم البلاغۃ:

عبدالقاہر جرجانی' جار اللہ الزمخشری اور دیگر علما کی تصانیف

۱۲۔ علم الفلسفہ:

قدیم فلسفے کا تعارف' فلسفی کتابوں کے تراجم' اہم فلاسفہ اور ان کے کارنامے

۱۳۔ علم الانساب:

علم الانساب کی ابتدا

(۱) عہد نبوی میں اور (۲) عہد صحابہ میں

کتب تاریخ اور علم الانساب پر اہم کتب کا تذکرہ۔

۱۴۔ علم الاحتساب:

آغاز و ارتقا' اس کے فوائد۔

کتب احتساب:

حسبہ پر مستقل کتابیں:

۱۔ السقطی المالقی: کتاب فی آداب الحسبۃ (تالیف ۵۰۰ھ)

۲۔ ابن عبدون الاشبیلی: رسالۃ فی القضاء والحسبہ (چھٹی صدی ہجری)۔

۳۔ عبدالرحمٰن بن نصر الشافعی الشیرازی (م ۵۸۹ھ/ ۱۱۹۳ء): نہایۃ الرتبۃ فی طلب الحسبہ۔

۴۔ ضیاء الدین محمد ابن الاخوہ (م ۷۲۹ھ/ ۱۳۳۸ء): معالم القربہ فی احکام الحسبہ۔

۵۔ ابن بسام المصری (آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی): نھایۃ الرتبہ فی طلب الحسبہ۔

۶۔ ابن تیمیہ: الحسبۃ فی الاسلام (قاھرہ)۔

ضیاء الدین السنامی: نصاب الاحتساب۔

ب۔ مستقل تصانیف کے علاوہ الماوردی: الاحکام السلطانیہ اور ابو یعلیٰ: الاحکام السلطانیہ وغیرہ، الغزالی: احیاء علوم الدین اور القلقشندی: صبح الاعشیٰ میں بھی حسبہ اور محتسب پر مباحث موجود ہیں۔

ان سب کتابوں میں حسبہ کے فضائل، محتسب کی ذمہ داریوں اور اس کے منصب کے مذہبی اور قانونی پہلوؤں کا ذکر ہے۔

بعض کتابوں میں محتسب کے فرائض منصبی کی انجام دہی کے لیے علمی اور فنی ہدایات اور معلومات مذکور ہیں، چونکہ یہ نگرانی مختلف پیشوں کی ہوتی تھی، اس لیے یہ کتابیں تمام تر ان کی نگرانی کے لیے سرکاری دستور العمل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ الشیرازی نے اپنی کتاب نہایۃ الرتبہ فی طلب الحسبہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے ایما پر لکھی، تاکہ ایوبی حکومت کے لیے ارباب صنعت و حرفت کی نگرانی کے لیے دستور العمل کا کام دے سکے۔ اسی طرح ماوردی (۴۵۰ھ / ۱۰۵۸ء) نے الاحکام السلطانیہ بھی حکومت وقت کے لیے تصنیف کی تھی۔

۱۵۔ دیگر مروجہ علوم و فنون

مثلاً علم الصرف، علم النحو، علم الاشتقاق، علم بدیع و معانی، علم عروض و قوافی وغیرہ پر صدی وار بحث۔

○

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم و سیر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسماءِ مُبارکہ

بقول قاضی ابو بکر بن العربیؒ بعض صوفیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ایک ہزار نام ہیں اور اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماے مبارکہ کی تعداد بھی ہزار تک پہنچتی ہے۔ بہرحال صفات و اوصاف کے اعتبار سے آپؐ کے متعدد اسما اہل علم نے قلمبند کیے ہیں۔ ذیل میں آپؐ کے مشہور اور خاص اسماے مبارکہ درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ محمد آپؐ کا مشہور ذاتی نام ہے جو قرآن مجید میں ۴ مرتبہ آیا ہے۔ اس سے مقصود وہ ذات گرامی ہے جس کی تعریف و توصیف اور مدح و ستائش میں ہر مخلوق رطب اللّسان اور کائنات کا ذرہ ذرہ جس کا ثنا خواں ہو۔ افعال و اعمال کے ساتھ جب تک آپؐ کی رسالت کا اقرار "محمد رسول اللہ" کہہ کر نہ کیا جائے کوئی شخص مسلمان نہیں بن سکتا۔ آپؐ کی ولادت باسعادت سے پہلے جزیرۃ العرب میں اہل کتاب کے ہاں یہ بات مشہور تھی کہ عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے جس کا نام محمدؐ ہوگا۔ بہت سے گھرانوں اور خاندانوں کی یہ تمنا تھی کہ یہ عزت و شرف ان کے حصے میں آئے اور اسی وجہ سے کئی لوگوں نے اپنے بیٹوں کے نام محمد رکھ لیے۔ بعض علما کے نزدیک ایسے نام والوں کی تعداد پندرہ بیس افراد تک پہنچ جاتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ملاحظہ فرمائیے کہ ان میں سے کسی نے بھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، کیونکہ یہ سعادت و کرامت ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص تھی۔ الغرض یہ نام ہر لحاظ سے بڑا بابرکت ہے۔

۲۔ احمد آپؐ کا یہ اسم گرامی قرآن مجید میں ایک مرتبہ آیا ہے اور وہ بھی حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے بطور بشارت وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (الصف ۶۱: ۶)، یعنی اور میں ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور جس کا نام

احمد ہو گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ سے پہلے کسی شخص کا نام احمد نہیں رکھا گیا۔ آپؐ نے اپنے خالق و مالک کی حمد و ثنا اس کثرت سے کی کہ دوسرا کوئی شخص اس معاملے میں آپؐ کا شریک و سہیم نہیں ہو سکتا۔ اپنے رب کی تعریف و حمد بیان کرنے میں آپؐ سب پر سبقت لے گئے۔ آپؐ اللہ کے ہاں بھی محمود ہیں' فرشتوں کے ہاں بھی۔ انبیائے کرامؑ کے ہاں بھی محمود ہیں اور اہل زمین کے نزدیک بھی۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے اتنے چرچے کیے کہ آپؐ کی امت حمَّادون کہلاتی ہے' جو ہر آن اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتی رہتی ہے۔ دکھ سکھ میں حمد کو ضروری ٹھہرایا گیا۔ ہر موقع اور ہر تقریب پر حمد کا ورد ہوتا ہے۔ آپؐ صاحب مقام محمود ہیں اور قیامت کے دن لوائے حمد کے حامل ہوں گے۔

۳۔ البر: یعنی محسن' خیر و بھلائی کا جامع' آپؐ حسن و صدق' خصائل جمیلہ اور اطوار حمیدہ کا پیکر تھے۔

۴۔ اَلْاَبْطَحِی: بطحائے مکہ کی نسبت سے یہ لقب ٹھیرا۔ آپؐ کے دادا زمانہ جاہلیت میں سَیِّدُ الْاَبْطَح کہلاتے تھے۔

۵۔ اَلْاَبْلَجُ: خندہ پیشانی اور رخ انور کی وجہ سے "ابلج" مشہور ہوئے۔

۶۔ الْاَبْیَضُ: لفظی معنے ہیں روشن و تابناک اور اس سے مراد ہے صاحب سخاوت' نیز اس لیے بھی کہ آپؐ کی زندگی نہایت پاک و صاف اور بے داغ گزری۔

۷۔ اَلْاَتْقٰی: آپؐ سب زیادہ متقی ہیں۔ تقوی آپؐ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ زندگی کے کسی لمحے میں بھی آپؐ نے دامن تقویٰ کو نہیں چھوڑا۔

۸۔ اَلْاَجْوَدُ: بہت ہی زیادہ جود و کرم کے مالک تھے۔ آپؐ ہر انسان پر احسان کرتے۔ مستحق تو تھے ہی حقدار اور غیر مستحق لوگوں کو بھی نوازتے' غیر سوالی کو بھی عطا کر دیتے اور فقر و فاقہ سے بے نیاز ہو کر کثرت سے سخاوت کرتے۔

حدیث میں اس بات کا ذکر آتا ہے کہ آپؐ تمام لوگوں سے زیادہ سخی (اَجْوَدُ النّاس) تھے اور بالخصوص رمضان المبارک کے مہینے میں تو آپؐ کی سخاوت کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔

۹۔ اَلْاَجَلُّ: آپؐ کی عظمت و جلالت اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی مسلم تھی اور بندوں کے ہاں بھی۔

۱۰۔ اَلْاَحْسَنُ: آپؐ حسن و جمال میں بے مثال اور صفات کمال کا پیکر تھے۔ حدیث میں صحابہ کرام کی طرف سے آپؐ کو احسن النّاس کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

۱۱۔ اَلْاَحْشَمُ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے زیادہ باوقار اور پر سکینت تھے۔ آپؐ نے شرک سے نجات دلا کر توحید کا راستہ دکھایا' نیز اس لیے بھی کہ آپؐ اپنی امت کو دوزخ کی آگ سے بچانے والے ہیں۔

۱۲۔ اَحْیَدُ: آپؐ نے لوگوں کو راہ باطل سے ہٹا کر راہ حق پر گامزن کر دیا۔

۱۳۔ اَلْاٰخِذُ الْحُجُزَاتِ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ میں لوگوں کو کمر سے پکڑ کر آگ میں گرنے سے بچانے والا ہوں۔ لوگ آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے ہیں اور قریب ہے کہ وہ اس آگ میں اوندھے منہ گر پڑیں۔ آپؐ ازراہ ہمدردی و تلطف انہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر پیچھے کی جانب ہٹاتے ہیں اور انہیں بچانے کے لیے مسلسل کوشش فرما رہے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آپؐ کی رسالت کا مقصد خلق خدا کو جہنم کی آگ سے بچانا ہے اور آپؐ اس مقصد کے حصول کے لیے رات دن کوشاں ہیں۔

۱۴۔ اَلْاٰخِذُ الصَّدَقَاتِ: اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر پر مأمور فرمایا کہ کہ آپؐ اہل ثروت اور صاحب حیثیت مسلمانوں سے زکوٰۃ مفروضہ اور نفلی صدقات لے کر مستحق لوگوں میں تقسیم کریں (دیکھیے آیت خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبہ' ۹:۱۰۳)۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ معاشرے کے تنگ اور بدحال لوگوں کے ساتھ مالی تعاون کی راہ نکل آتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مال خرچ کرنے والوں کی تطہیر مال و جان اور تزکیہ نفس ہو جاتا ہے۔

۱۵۔ اَلْاَخْشٰی: قرآن مجید میں ایک ارشاد ہے: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر' ۳۵:۲۸)' یعنی اللہ کے بندوں میں صرف علم والے ہی اس سے ڈرتے ہیں۔ خشیت و

تقویٰ علم کی راہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جتنا اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال اور قدرت و کمال کا علم و اعتقاد ہو گا اور اس ذات اقدس پر جتنا ایمان ہو گا اتنا ہی خوف خدا دل میں جاگزیں ہو گا اور جتنا خوف خدا ہو گا' اتنا ہی انسان گناہوں اور معاصی سے دور رہے گا۔ آپؐ کائنات میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی جلالت و قدرت اور عظمت و ہیبت کا علم رکھتے تھے اور سب سے زیادہ اس پر ایمان رکھتے تھے' اس لیے آپ سب سے بڑھ کر اللہ کے خوف و خشیت کے حامل تھے۔

۱۶۔ اَلْاَدْوَمُ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت پر سب سے زیادہ مداومت اور مواظبت کرنے والے تھے۔

۱۷۔ اُذُنُ خَیْرٍ: آپؐ سب لوگوں کی باتیں بڑی توجہ اور غور سے سنتے تھے۔ معذرت خواہ لوگوں کا عذر قبول فرما لیا کرتے تھے' گویا کہ آپؐ ہر ایک کی بات سننے کے لیے ہمہ تن گوش بن جاتے تھے۔ اس میں ان لوگوں کی بھلائی اور خیر خواہی کی دلیل بھی ہے اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی ہے کہ جو شخص تمہارے عذر قبول کر لیتا ہے وہ تمہارے لیے ہمہ تن خیر ہے۔

۱۸۔ اَلْاَرْجَحُ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم علم و فضل' حلم و شرف اور عقل و دانش میں تمام بنی نوع انسان پر فضیلت رکھتے تھے۔

۱۹۔ اَلْاَرْحَمُ: آپؐ رحمۃ اللعالمین ہیں اور رحمت و شفقت میں آپؐ کا کوئی ثانی و نظیر نہیں ہے۔

۲۰۔ اَلْاَزْکیٰ: پاکیزگی و نظافت اور طہارت میں آپؐ سب پر فوقیت لے گئے ہیں۔

۲۱۔ الازھر: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رخ روشن پر سب سے زیادہ رونق اور وقار تھا۔

۲۲۔ اَلْاَسَدُّ: قول و عمل میں استقامت و صداقت اور توفیق کے اعتبار سے آپؐ سب پر سبقت لے گئے ہیں۔

۲۳۔ اَشْجَعُ النَّاسِ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہی باہمت' بہادر اور دلیر تھے۔ شجاعت و بسالت میں آپؐ سب پر فضیلت رکھتے ہیں۔

۲۴۔ اَلْاَصْدَقُ: آپؐ سب سے زیادہ قول کے سچے، بات کے پکے، حق پر ثابت رہنے والے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں سب سے قوی اور طاقت ور تھے۔

۲۵۔ اَلْاَطْیَبُ: آپؐ سب سے افضل و اشرف بھی تھے اور آپؐ کے جسم اطہر سے خوشبو کی مہک بھی آتی تھی۔

۲۶۔ اَلْاَعَزُّ: آپؐ قوت و غلبہ اور عزت و طاقت میں سب لوگوں پر فوقیت رکھتے تھے۔

۲۷۔ اَلْاَعْظَمُ: آپؐ حسن خلقت اور حسن، یعنی ذاتی کمالات و صفات میں سب پر فضیلت رکھتے تھے۔

۲۸۔ اَلْاَعْلٰی: رفعت مرتبت اور بلندی درجات میں آپؐ سب سے بلند و بالا تھے۔

۲۹۔ اَلْاَعْلَمُ بِاللّٰہِ: اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں آپؐ کو سب سے زیادہ فوقیت حاصل تھی۔

۳۰۔ اَفْصَحُ الْعَرَبِ: فصاحت و بلاغت، زبان و بیان، طلاقت لسان اور وضاحت مطالب کے اعتبار سے آپؐ عرب کے سارے باشندوں پر سبقت لے گئے ہیں۔

۳۱۔ اَکْثَرُ الْاَنْبِیَاءِ تَبَعًا: آپؐ کی امت کی تعداد فرداً" فرداً" سارے انبیا کی امتوں سے زیادہ ہوگی۔ آپؐ نے فرمایا کہ بعض نبی ایسے ہوں گے جن کی امت ایک فرد پر مشتمل ہوگی اور ایک حدیث میں فرمایا: مجھے امید ہے کہ میری امت سب سے زیادہ ہوگی۔

۳۲۔ اَلْاَکْرَمُ: آپؐ جود و کرم اور شرافت و کرامت میں سب سے بڑھ گئے، اسی لیے آپؐ کو اکرم الناس اور اکرم ولد آدم بھی کہا جاتا ہے۔

۳۳۔ اَلْاِکْلِیْلُ: آپؐ تاج الانبیاء اور راس الاصفیا ہیں۔

۳۴۔ اَلْاٰمِرُ وَالنَّاھِیْ: آپؐ نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے ہیں لہٰذا آپؐ کی امت پر بھی لازم ہے کہ نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔

۳۵۔ اَلْاِمَامُ: آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے رہنما بنا کر بھیجا ہے۔ آپؐ کی اقتداء و اتباع میں ہی نجات ہے۔ آپؐ ہی امام الخیر، امام العالمین (العباد)، اِمَامُ الْمُتَّقِیْنَ، امام الناس اور امام النَّبِیِّیْنَ ہیں۔

۳۶۔ اَلْاَمَانُ: آپؐ اپنی امت کے لیے امن و سلامتی کا باعث ہیں۔ جب تک آپؐ صحابہ کرامؓ کے درمیان میں تشریف فرما رہے۔ امت عذاب الٰہی سے محفوظ رہی اور آپؐ کے بعد استغفار امت باعث امان قرار پایا۔ (دیکھیے (الانفال ۹: ۳۳ الترمذی السنن کتاب التفسیر)۔

۳۷۔ اَلْاُمَّۃُ: ہر نوع کی خصائل جمیلہ اور اوصاف حمیدہ کا پیکر ہونے کے باعث آپؐ کو یہ لقب ملا تھا۔ آپؐ کے اوصاف و خصال اس قدر زیادہ ہیں کہ مجموعی طور پر کوئی جماعت اور امت بھی آپؐ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

۳۸۔ اَلْاَلْمَعِیُّ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت ہی ذہین و ذکی، فصیح و بلیغ، قادر الکلام، روشن دماغ اور معاملہ فہم تھے۔

۳۹۔ اَلْاَمْنُ: آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے طمانیت نفس سے بہرہ وافر عطا کیا تھا۔ آپؐ ہر قسم کے خوف و خطرے سے بے نیاز ہو کر تبلیغ اسلام میں مصروف رہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا، فرمایا وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ ۵/ ۶۷ دنیا میں عصمت و حفاظت اور امن و سلامتی کے علاوہ آخرت میں بھی سروری و سرفرازی اور عزت و وقار کے قائم رکھنے کا وعدہ فرمایا: یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ (التحریم ۶۶: ۸) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو قیامت کے دن (بھی) رسوائی سے بچائے گا۔ یہ شفاعت امت کی طرف بھی اشارہ ہے۔

۴۰۔ اَلْاَمِیْنُ: آپؐ امانت و دیانت کے لیے مشہور و معروف ہیں۔ بعثت سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر کے وقت بھی قریش مکہ آپؐ کو دیکھ کر پکار اٹھے: ھٰذَا الْاَمِیْنُ آپؐ ہی تو امین ہیں۔ پھر آپؐ امین بمعنی مامون بھی ہیں کہ لوگ اپنی قیمتی چیزیں آپؐ کے پاس بطور امانت رکھ جاتے اور آپؐ ان امانتوں کی حفاظت فرماتے تھے۔ آپؐ اس لیے بھی امین ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کی امانت آپؐ کے سپرد کی اور آپؐ نے اس امانت کو من و عن لوگوں تک پہنچا دیا۔

۴۱۔ اَلْاُمِّیُّ: قرآن مجید میں آپؐ کو اَلرَّسُوْلُ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ (الاعراف ۷: ۱۵۷) کے الفاظ

سے یاد کیا گیا ہے۔ امی اسے کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ امی ہونا بھی آپؐ کے لیے معجزہ ہے۔ اس معجزے کی عظمت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو قرآن مجید جیسی عظیم الشان اور بے مثال کتاب عطا فرمائی جو بذات خود ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ آپؐ کی ذات گرامی کے لیے یہ لقب بطور تعظیم و تکریم استعمال ہوا ہے اور اسے نبوت و رسالت کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (العنکبوت ۲۹:۴۸)، یعنی اور آپؐ تو اس (قرآن) سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے۔ ورنہ باطل پرست لوگ ضرور شک کرنے لگتے۔

۴۲۔اَنْعُمُ اللّٰهِ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر بے شمار انعامات اور احسانات فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت تو یہ ہے کہ اس نے اپنے حبیب کو رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ بنا کر بھیجا اور اپنے بندوں کو اسلام جیسی نعمت غیر مترقبہ سے نوازا۔

۴۳۔اَلْاَوَّاهُ: آپؐ نہایت حلیم اور نرم دل تھے۔ دعائیں بڑے خشوع و خضوع اور تضرع سے کرتے۔ ہر وقت خدا کے حضور میں استغفار کرتے رہتے اور اس کی حمد و ثنا اور تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے تھے۔

۴۴۔اَوَّلُ شَافِعٍ: قیامت کے دن آپؐ ہی سب سے پہلے شفاعت کریں گے۔

۴۵۔اَوَّلُ مُشَفَّعٍ: سب سے پہلے آپؐ کی شفاعت ہی قبول کی جائے گی۔

۴۶۔اَلْبَارِعُ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علم و فضل، حلم و حکم اور خصائل، مکارم و اخلاق میں تمام مخلوق پر فوقیت رکھتے تھے۔

۴۷۔اَلْبَاهِرُ: آپؐ پیکر حسن و جمال تھے۔ مخلوق خدا میں سے کوئی آپؐ کا نظیر و سہیم نہ تھا۔ آپؐ کا نور نبوت تمام انبیا کے نور پر غالب آگیا اور آپؐ کے نور نے ساری دنیا کو منوّر کر دیا۔

۴۸۔اَلْبَحْرُ: آپؐ جود و کرم، طہارت و پاکیزگی اور عمومی نفع رسانی کے اعتبار سے ایک بحر

زاخر (ٹھاٹھیں مارتا ہوا) سمندر رہتے۔ آپؐ نے لوگوں کو پاکبازی، طہارت اور اخلاق حسنہ کی تعلیم دی۔ جود و کرم میں آپؐ ہواؤں سے بھی بازی لے گئے۔ آپؐ اتنی سخاوت کرتے کہ لوگوں کو فقر و فاقہ سے نجات مل جاتی۔ آپؐ نے جسمانی صفائی اور طہارت کے ساتھ تزکیہ قلوب کا بھی اہتمام فرمایا۔

۴۹۔اَلْبَدْرُ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فیوض و برکات، فوائد و کمالات اور حسنات و درجات کے باعث کائنات کے لیے چودہویں کے چاند کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۵۰۔اَلْبَرُّ: بر سے اسم فاعل ہے۔ بر کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ اس میں نیکی، احسان، طاعت صدق سب شامل ہیں۔ آپؐ نیکی اور احسان میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں آپؐ کی مثال نہیں ملتی۔ اسی طرح آپؐ نے اپنے وعدوں کو ہمیشہ پورا فرمایا۔ حسن خلق میں آپؐ سے بڑھ کر نہ تو کوئی ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ قرآن مجید نے بھی اس امر کی شہادت دی ہے۔

۵۱۔اَلْبُرْھَانُ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اعتبار سے بھی واضح دلیل اور روشن حجت ہیں کہ آپؐ ایسی آیات و ایسے معجزات لے کر آئے جو آپؐ کی نبوت و رسالت کا منہ بولتا ثبوت ہیں اور اس لحاظ سے بھی کہ آپؐ مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت کے تشریف لائے۔ سفیان بن عینہ، ابن عطیہ اور النسفی ایسے علما نے آیت، قَدْ جَآءَكُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (النساء، ۴:۱۷۴) میں برھان سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس لی ہے۔

۵۲۔اَلْبَشَرُ: آپ بنی نوع انسان میں اعظم البشر ہیں۔ وحی الٰہی اور منصب نبوت نے آپؐ کی جلالت و عظمت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ معارف جمیلہ اور امتیازات عالیہ نے آپؐ کو سرور کائنات کے بلند مقام پر فائز کر دیا ہے (دیکھیے الکھف، ۱۸:۱۱۰)

۵۳۔بُشْریٰ عِیْسٰی: آپؐ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی دعا اور حضرت عیسیٰؑ کی بشارت تھے۔ (الصف ۶۱:۶، نیز الحاکم: المستدرک، ۲:۶۰۰)

۵۴۔اَلْبَیَانُ: آپؐ نہایت بلیغ الفاظ میں اظہار خیال فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ جس فصاحت و

بلاغت سے اظہار مقصود کرتے تھے۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپؐ کا فرمایا ہوا ہر جملہ ادب کا ایک شہ پارہ ہے۔

۵۵۔ اَلتَّذْکِرَۃُ : دلیل اور علامت کا تعلق حسی امور سے ہوتا ہے، جبکہ تذکرہ کا تعلق ذہنی امور سے۔ آپؐ نے دلائل و براہین اور علامات و آیات سے بھی لوگوں کو سمجھایا اور ذہنی لحاظ سے بھی جھنجھوڑا۔ غافلوں کو بھی تنبیہ کی اور بھولے بھٹکے لوگوں کو بھی راہ راست پر ڈالا۔

۵۶۔ اَلتِّھَامِیُّ: تہامہ کی طرف نسبت ہے۔ مکہ مکرمہ کا ایک نام تہامہ بھی ہے۔ نیز مکے میں ایک جگہ کا نام ہے۔

۵۷۔ الثِّمَالُ: آپؐ لوگوں کا ملجا و ماویٰ تھے، ہر ایک کی مدد فرماتے، یتیموں بیواؤں اور بے کسوں کے لیے سہارا اور آسرا تھے۔

۵۸۔ اَلْجَبَّارُ: دنیا میں آپؐ کی عظمت و جلالت اور دبدبہ و رعب مسلّم ہے، نیز آپ اپنی امت کی تعلیم اور ہدایت و اصلاح کے لیے ہروقت کوشاں رہتے تھے۔

۵۹۔ اَلْجَدُّ : آپ ہر لحاظ سے کامل الصفات اور جلال و عظمت کا پیکر تھے۔

۶۰۔ اَلْجَلِیْلُ : آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اور مخلوق خدا کے نزدیک بھی بڑے جلیل القدر اور عظیم المرتبت تسلیم کیے گئے ہیں۔

۶۱۔ اَلْجَوَّادُ: آپ جواد بھی تھے اور الجواد بھی۔ جود و کرم کے سلسلے میں آپ خرچ کرنے سے کبھی دریغ نہ فرماتے تھے۔ جو کچھ ہوتا راہ خدا میں خرچ کر دیتے۔

۶۲۔ اَلْحَاشِرُ: قیامت کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے مرقد مبارک سے اٹھایا جائے گا اور لوائے حمد آپ کے دست مبارک میں ہو گا اور پھر ساری مخلوق کو آپ کے قدموں میں، یعنی آپ کے سامنے اٹھایا جائے گا۔

۶۳۔ اَلْحَاکِمُ: اللہ تعالیٰ نے نزول قرآن مجید کا ایک مقصد یہ بیان فرمایا ہے کہ آپ لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کیا کریں۔ فیصلوں کے سلسلے میں آپ کا عدل و انصاف تاریخ عدالت کا نہایت درخشاں اور روشن باب ہے۔

۶۴-اَلحَامِدُ: آپ نے زندگی بھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کثرت سے کی کہ آپ ساری کائنات سے سبقت لے گئے۔ آپ ہی قیامت کے دن لوائے حمد اٹھائیں گے اور اپنے خالق حقیقی کی حمد و ثنا کرتے کرتے منصب امامت و سیادت پر فائز ہوں گے۔

۶۵-اَلحَامِیُ: آپ اپنی امت کے حامی و ناصر تھے۔ آپ امت کے لوگوں کو تباہی و بربادی اور ہلاکت سے بچاتے رہے۔

۶۶-حَبِیبُ اللّٰہِ: محبت سے فعیل کا وزن، بمعنی فاعل اور مفعول الٰہی ایک روحانی کیفیت ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ احکام الٰہی کی سختی سے اطاعت کی جائے۔ سعادت و قرب الٰہی کے حصول کے تمام ذرائع اختیار کیے جائیں۔ اہل علم نے خلیل اور حبیب میں فرق بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ حبیب کا درجہ خلیل سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ خلیل کا اتصال واسطے سے ہوتا ہے اور حبیب کا اتصال بلاواسطہ، خلیل مغفرت کی امید و خواہش رکھتا ہے اور حبیب کو مغفرت کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ خلیل نیک نامی (لسان صدق) کے لیے دعا کرتا ہے اور حبیب کو وَرَفَعنَا لَکَ ذِکرَکَ کا مژدہ سنا دیا جاتا ہے۔ خلیل رب جلیل سے دعا کرتا ہے کہ مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچائے رکھیو اور حبیب کو یہ جاں فزا خبر دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے گھرانے کو پاکیزگی اور طہارت سے سرفراز کرنا چاہتا ہے۔ آپ ساری کائنات میں سے افضل و اعلیٰ ہیں اللہ تعالیٰ پر آپ کا ایمان سب سے زیادہ ہے۔ اس طرح آپ کو اللہ تعالیٰ سے محبت بھی سب سے زیادہ ہے اور اللہ تعالیٰ کو آپ سے کہ آپ ہی حبیب الرحمٰن ہیں۔

۶۷-الحِجَازی: حجاز کی طرف نسبت ہے۔

۶۸-حجّۃُ اللّٰہ: آپ مخلوق خدا کے لیے حجۃ اللہ بھی ہیں اور الحجۃُ البالغہ بھی۔ آپ نے دلائل و براہین سے لوگوں کو دین اسلام سمجھایا پورے طور پر اتمام حجت کر دیا۔ تبلیغ دین میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ کھول کھول کر عقیدہ توحید بیان کر دیا اور صاف صاف الفاظ میں منصب رسالت اور مقام نبوت کی وضاحت فرما دی۔ آپ کے اولین مخاطب امی تھے، اس لیے یہ ترکیب استعمال ہوئی۔

۶۹۔حرز الامیین: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو برائیوں سے روکنے اور گناہوں سے بچانے کے لیے تشریف لائے تھے۔ برائی کو ختم، نیکی اور بھلائی کو پھیلانے کے لیے آپ دن رات کوشش فرماتے رہے۔ برائی کا خاتمہ اسلام کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ آپ کی رسالت تمام جہانوں اور تمام زمانوں کے لیے ہے۔

۷۰۔اَلْحَرَمِیُّ: حرم مکہ کی طرف نسبت ہے۔

۷۱۔اَلْحَرِیْصُ عَلَی الْاِیْمَانِ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید خواہش تھی کہ لوگ دولت ایمان و ہدایت سے بہرہ مند ہو جائیں۔ آپ کی رسالت کا مقصد ہی یہ تھا کہ لوگ رشد و ہدایت کر کے ضلالت و گمراہی سے بچ کر صراط مستقیم پر گامزن ہو جائیں۔

۷۲۔اَلْحَسِیْبُ: بمعنی محاسب و مکافی۔ آپ اپنی امت کے لیے دین و دنیا کے تمام امور میں ایسی جامع اور مکمل رہنمائی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد کسی اور رہنما کی حاجت اور ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ کی جامع تعلیمات اور کامل اسوہ حسنہ نے دین کی تکمیل کر دی۔

۷۳۔اَلْحَقُّ: قرآن مجید میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا: وَشَهِدُوْاۤ اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ (آل عمران، ۳: ۸۶ ، نیز دیکھیے الزخرف، ۴۳: ۹۲)۔ امام بخاری نے اپنی الصحیح میں بھی ایک حدیث درج فرمائی ہے جس میں ہے: محمد حق۔ یہاں لفظ حق سے مراد یہ ہے کہ آپؐ کی نبوت اور صداقت برحق ہے۔ آپ نے لوگوں کو حق سنایا، حق کی دعوت دی، اور حق پھیلا کر باطل کو مٹا دیا۔

۷۴۔اَلْحَکِیْمُ: اللہ تعالیٰ نے آپ کے منصب کی وضاحت فرمائی: یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعة، ۶۲: ۲۰)، یعنی آپ لوگوں کو قرآن و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ دوسرے مقام پر فرمایا ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤى اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (بنی اسرائیل، ۱۷: ۳۹)، یعنی یہ باتیں اس حکمت سے ہیں جو آپ کے رب نے آپ پر وحی کی ہیں۔ حکمت عطیہ الٰہی ہے اور آپ علم و تعلیم کے اعتبار سے حکمت سے متصف ہونے کی وجہ سے حکیم ہیں۔ اہل علم نے حکمت سے مختلف معانی مراد لیے ہیں، جن میں سے مشہور اقوال یہ

ہیں: قرآن مجید کی معرفت و فہم، علم کی عملی صورت، سنت، اللہ کا خوف و خشیت، دین اسلام کی سمجھ بوجھ، موجودات کی معرفت اور نیک، افعال۔

یہ تمام معانی آپ کی تعلیمات پر صادق آتے ہیں اور ہر لحاظ سے آپ کا حکیم ہونا برحق ہے۔

۷۵۔اَلْحَلِیْمُ: آپ نہایت بردبار اور متحمل مزاج تھے۔ خوب سمجھ کر ہر کام کرتے کبھی جلد بازی سے کام نہ لیتے۔ ہیجان غضب کے وقت بھی ضبط نفس سے کام لیتے۔ تکالیف و مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے اور اذیت و الم پر صبر و تحمل فرمایا کرتے۔

۷۶۔اَلْحَمَّادُ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احمد ہیں اور کثیر الحمد حامد ہیں۔

۷۷۔اَلْحَمِیْدُ: بمعنی محمود، نیز حامد۔ آپؐ کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف محمودہ کا شہرہ چار دانگ عالم میں ہے۔ آپؐ کی حمد ثنا کے زمزمے زمین و آسمان میں گونج رہے ہیں۔

۷۸۔ اَلْحَنِیْفُ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف دین اسلام کی طرف مائل تھے، بلکہ آپ نہایت استقامت اور پامردی سے اسؐ پر قائم و دائم بھی رہے۔ دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی۔ کفر و شرک سے نکال کر لوگوں کو اسلام کی طرف ایسا راغب کیا کہ وہ بھی آخری دم تک اسلام پر ثابت قدم رہے۔

۷۹۔اَلْحَیِیُّ: آپ شرم و حیا کے پیکر تھے۔ اتنے کثیر الحیا کہ کسی بھی شخص کا سوال رد نہ فرماتے وہ جو چیز مانگتا آپ عطا فرما دیتے آپ برائیوں سے طبعاً نفرت کرتے اور ہمیشہ ان سے دور رہتے تھے۔

۸۰۔خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ: اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آپ کو اس معزز لقب سے یاد فرمایا ہے امام بخاری (الصحیح، ۲: ۲۱۸) اور امام مسلم (الصحیح، کتاب الفضائل، حدیث ۲۲) نے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے انبیا کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ایک شاندار اور نہایت خوبصورت مکان بنایا۔ اسے ہر لحاظ سے مکمل کیا، مگر ایک زاویے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رہی۔ یہ خالی جگہ میرے لیے ہے۔ میں نے اسے پر کر دیا ہے اور میں خاتم النبیین ہوں۔ دوسری حدیث میں فرمایا کہ میں

سب انبیا کے آخر میں آیا ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

۸۱۔ اَلْخَاشِعُ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ساری دنیا کے لوگوں سے بڑھ کر خوف خدا تھا۔ آپ ہروقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں خشوع کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

۸۲۔ اَلْخَاضِعُ: خشوع کے ساتھ آپ خضوع اور تواضع کا بھی پیکر تھے۔

۸۳۔ خَطِیْبُ النَّبِیِّیْنَ: آپ انبیا کے امام بھی ہیں اور خطیب بھی۔ قیامت کے روز آپ تمام لوگوں نیز انبیا کی طرف سے اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر شفاعت کریں گے۔

۸۴۔ خَلِیْلُ اللّٰہِ: آپ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ میں اللہ کا خلیل ہوں (احمد مسند ۱: ۴۶۲)۔

۸۵۔ اَلْخَیْرُ: آپ کا وجود مسعود امت بلکہ ساری انسانیت کے لیے موجب خیر ہے۔ آپ صاحب کوثر ہیں۔ آپ صاحب فضل و احسان ہیں' نیز آپ خیرالناس خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ، خیر العالمین اور خیر خلق اللہ ہیں۔

۸۶۔ اَلدَّاعِیُ اِلَی اللّٰہِ: آپ نے لوگوں کو اللہ کی اطاعت و فرنبرداری اور توحید و عبادت کی طرف بلایا۔

۸۷۔ الدَّامِغُ: آپ نے باطل کو حق کے ذریعے مٹایا اور باطل قوتوں کے لشکروں کو یہ ضرب لگائی۔

○○○

(پروفیسر صاحب کا یہ مضمون نامکمل ہے' غالبًا آپ اسے مکمل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے' مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جلدی بلاوا آجانے کے باعث اسے مکمل نہ کرسکے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیثیتِ سپہ سالار

اسلام طبعی اور فطری طور پر امن و سلامتی کا دین ہے لیکن ظالموں کے ظلم کو روکنے اور دشمنان اسلام کے ناپاک عزائم کو ناکام بنانے کے لیے مجبوراً جنگ کرنے کی اجازت قرآن مجید میں دینا پڑی۔ تاریخ شاہد ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل تیرہ برس تک کفار مکہ اور سرداران قریش کے مظالم جس صبر و استقامت اور ہمت و حوصلے سے برداشت کئے اس کی نظیر نہیں ملتی' یہاں تک کہ وطن مالوف کو خیرباد کہہ کر یثرب کا رخ کرنا پڑا۔ وہاں پہنچ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو اسلام کا مرکز ٹھہرایا اور مسجد نبوی تعمیر کر کے پہلی اسلامی ریاست کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ جب مخالفین اسلام نے آپ کو یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا تو اللہ تعالیٰ نے بذریعۂ وحی اس بات کی اجازت دے دی کہ ظلم و تعدّی کا تلوار سے مقابلہ کیا جائے۔

فریضۂ تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کے ساتھ ایک مثالی معاشرے اور پہلی اسلامی ریاست کے قیام سے ابھی فرصت نہ ملی تھی کہ آپ کو سپہ سالاری کی ذمہ داریاں بھی سنبھالنا پڑیں۔ آپ نے جس خوش اسلوبی سے اس اہم فریضے کو انجام دیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس تدبّر سے اسلامی فوجوں کی قیادت فرمائی اور جو تدابیر میدان جنگ کے انتخاب اور جنگ کے دوران میں اختیار کیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ فن حرب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عظیم مہارت حاصل تھی اور آپ لشکرکشی' فوجی تربیت' عسکری نظام اور میدان جنگ میں قیادت اور سپہ سالاری کے اصولوں سے اچھی طرح واقف تھے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دستور تھا کہ جب کسی کام یا مہم کا ارادہ کرتے یا کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر کے چند تجربہ کار مجاہدین اور ممتاز صائب الرائے اصحاب کو بلا کر مشورہ کرتے۔ مختلف تجاویز اور خیالات کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد جو معاملہ طے پاتا اس پر عمل کرتے۔ اس انداز اور طریق کار سے ایک طرف تو ساتھیوں کا اعتماد حاصل ہو جاتا اور دوسری طرف خود مجاہدین میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی تھی، اس سے لوگ مشورے کی اہمیت اور قدر و منزلت پہچاننے لگے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اپنی ذات سے بے نیاز ہو کر میدان جنگ میں فوج کی قیادت فرماتے۔ آپ کا یہ دستور تھا کہ آپ اپنے لشکر کی صفوں میں گھوم پھر کر اپنے بہادر سپاہیوں کو ہمت و جرات دلاتے۔ ثابت قدمی اور بہادری سے لڑنے کی تلقین فرماتے۔ آپ کی عزیمت اور شجاعت کو دیکھ کر آپ کے ساتھی بے خوف و بے خطر ہو کر داد شجاعت دیتے تھے۔

آپ کی جنگی مہارت و عسکری قیادت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے پیش قدمی کر کے ہمیشہ یہ کوشش فرمائی کہ جنگ کا میدان مدینے سے دور ہو۔ غزوۂ بدر میں مقام بدر کو میدان کے لیے منتخب کرنا اور پھر پانی کے چشمے پر قبضہ کر کے دشمن کے عزائم کو ناکام بنا دینا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عسکری تدبیر کا نمایاں ثبوت ہے۔

غزوۂ احد میں بھی آپ نے ایک ماہر فن سپہ سالار کا کردار ادا کیا۔ مدینہ منورہ سے باہر فاصلے پر میدان جنگ منتخب کیا۔ لڑائی کے لیے ایسی جگہ پسند فرمائی جو عسکری اعتبار سے کم تعداد والے لشکر کے لیے ممد و معاون ہو سکتی تھی۔ آپ نے اس گھاٹی پر پچاس تیرانداز متعین فرما دیئے۔ جہاں سے دشمن کے حملے کا خطرہ تھا۔ اور گھاٹی کے محافظ تیراندازوں کو حکم دیا کہ وہ کسی حالت میں بھی گھاٹی کو ہرگز نہ چھوڑیں اور دشمن کے گھوڑوں پر تیر برساتے رہیں، کیوں کہ گھوڑے تیروں کے مقابلے پر نہیں ٹھہر سکتے۔ جب گھاٹی کے محافظوں نے آپ کی ہدایت کے خلاف گھاٹی کو چھوڑ دیا تو دشمنوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گھاٹی کی طرف سے حملہ کر دیا۔ بایں ہمہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت قدمی

استقامت، تدبّر اور بہادری کی وجہ سے مسلمانوں کی فوج ذلت و شکست سے بچ گئی اور دشمن نامراد و ناکام لوٹ گئے۔

غزوہ خندق جسے غزوہ احزاب بھی کہتے ہیں، کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور حضرت سلمان فارسیؓ کی تجویز کو پسند فرمایا۔ اس موقع پر مسلمانوں کی قلیل تعداد کے مقابلے میں دشمن کا لشکر بہت زیادہ تھا۔ اس لئے جنگی اعتبار سے یہی مناسب سمجھا گیا کہ شہر کے گرد خندق کھود کر شہر کی حفاظت کی جائے۔ یہ تدبیر بڑی کارگر ثابت ہوئی، عربوں کے ہاں خندق کھود کر شہر کی حفاظت کرنے اور دشمن کے حملے کو روکنے کا رواج بالکل نہ تھا۔ وہ اس طریق جنگ سے بالکل ناواقف تھے۔ آپ نے ایرانیوں کے اس طریق کار پسند فرما کر مسلمانوں کی حفاظت کی اور دشمن کے لشکر جرار کے عزائم کو ناکام بنا دیا۔ اس جنگ میں آپؐ نے ایک اور قائدانہ تدبیر کا ثبوت یوں دیا کہ کفار قریش اور یہودیوں کے ناپاک گٹھ جوڑ کو توڑنے کے لیے حضرت نعیمؓ بن مسعود کو مقرر کیا تاکہ وہ قریش اور یہود کے سرداروں سے مل کر ان کے درمیان بے اعتمادی اور شکوک و شبہات کی فضا پیدا کر کے ان کے باہمی تعلقات میں کشیدگی پیدا کر دیں۔ چنانچہ حضرت نعیمؓ بن مسعود نے اپنے تعلقات کی بنا پر یہ کام نہایت تدبّر اور خوش اسلوبی سے سر انجام دیا۔ اور یہود بنو نضیر اور قریش مکہ میں بے اعتمادی کی فضا پیدا کر کے پھوٹ ڈلوا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حملہ آوروں کو یہودیوں کی متوقع اور موعودہ امداد نہ مل سکی۔ چنانچہ کفار مکہ کو مایوس ہو کر ناکام لوٹنا پڑا۔

جنگ حنین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مساعد اور ناموافق حالات میں جس شجاعت اور استقامت کا ثبوت دیا اور جس ثابت قدمی، بہادری اور ہمت و جرات سے دشمن کا مقابلہ کیا اور اس سے آپ کی عسکری قیادت کی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ آپؐ نے میدان جنگ سے بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو دوبارہ جمع کیا۔ ان کی صفوں کو از سر نو ترتیب دیا۔ ان کے حوصلے بلند کیے اور حملہ کر کے دشمن کو مار بھگایا۔ اور بے شمار مال غنیمت پر قبضہ کر لیا۔

محاصرۂ طائف اپنی نوعیت کا نیا اور اہم معرکہ تھا۔ یہاں آپ نے منجنیق اور دوسرے آلات جنگ استعمال کیے۔ جن کے استعمال کے لئے اپنے آدمیوں کو جرش کے علاقے میں بھیج کر پہلے تربیت دلائی گئی تھی' جنگی ضرورتوں کے پیش نظر نئے طریقے اختیار کر کے اور نئے ہتھیاروں کو استعمال کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ثابت کردیا کہ آپ عسکری ضرورتوں سے بخوبی واقف تھے اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے آپ نے جو اقدامات کئے وہ آپ کی عسکری قابلیت کے مظہر ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ وسلم ایک طرف تو جنگی معاملات میں بڑی رازداری سے کام لیتے تھے۔ لشکر کی روانگی کے وقت بڑی احتیاط برتی جاتی تھی۔ فتح مکہ کے لئے فوج روانہ کرتے وقت پوری کوشش کی گئی تھی کہ دشمن کو خبر نہ ہونے پائے۔ روانگی کے وقت تک کسی کو علم نہ ہونے دیا کہ کہاں جارہے ہیں۔ آپ کی عسکری لیاقت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے اپنا مقصد اور منزل فوج پر بھی ظاہر نہ کیا' بلکہ دکھاوے کے لیے چکر کاٹ کرنا معلوم راستوں سے گزرتے ہوئے مکے جا پہنچے۔ رات کے وقت ساری فوج نے یک دم آگ روشن کی جس سے مکے والے ڈر کر ہمت ہار بیٹھے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی دستور تھا کہ حالات سے باخبر رہنے کے لیے جاسوس مقرر فرماتے جو دشمنوں کی فوجی نقل و حرکت کی اطلاع برابر آپ تک پہنچاتے رہتے تھے۔

مختصر یہ کہ آپ نے جنگ کے میدان میں اپنی عسکری قابلیت' قائدانہ استعداد اور فوجی نظم و نسق میں بے نظیر مہارت کا مظاہرہ کر کے مخالفین سے اپنی غیر معمولی عسکری قیادت کا لوہا منوایا۔

○○○

حیاتِ طیّبہ ایک نظر میں

ولادت تا غار حرا

ولادت:	۱۲ ربیع الاول، عام الفیل
۲۲ اپریل ۵۷۱ء بمقام مکہ مکرمہ	
رضاعت:	حضرت حلیمہ سعدیہ کی گود میں
چار سال کی عمر تک	
آغوش مادر:	۴ سال کی عمر میں
والدہ کا انتقال:	۶ سال کی عمر میں
دادا کی وفات:	۸ سال کی عمر میں
شام کا پہلا تجارتی سفر:	۱۲ سال کی عمر میں، چچا ابو طالب کے ہمراہ
حرب فجار:	۱۵ یا بقول بعض مؤرخین ۲۰ سال کی عمر میں
حِلفُ الفُضُول:	۱۶ تا ۲۰ سال کی عمر میں
شام کا دوسرا تجارتی سفر:	۲۴ سال کی عمر میں، تاجر کی حیثیت سے
نکاح مبارک:	پچیس سال کی عمر میں۔ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ
نصب حجر اسود:	۲۵ سال کی عمر میں۔ تعمیر خانہ کعبہ کے وقت حجر اسود کے موقع پر تمام قبائل کی طرف سے حَکَم بنائے گئے
خلوت و تفکر:	۳۷ سال کی عمر میں غار حرا میں خلوت گزینی، عبادت اور ذکر و فکر

بعثت و نبوت

نزول وحی: ۴۰ سال کی عمر میں
فرضیت نماز فجر و عصر: ۴۰ سال کی عمر میں (بروز بعثت)
آغاز نزول قرآن: ۴۰ سال کی عمر میں
تبلیغ اسلام کا آغاز: ا نبوی (ربیع الاول): ۴۰ سال کی عمر میں
پوشیدہ تبلیغ کا دور ا تا ۳ نبوی: ۴۳ سال کی عمر میں۔ چالیس زن و مرد مسلمان ہوئے اور کوہ صفا میں خفیہ طور پر نماز پڑھی گئی
علانیہ تبلیغ: ۴ نبوی ۴۳ سال کی عمر میں۔ کوہ صفا سے علانیہ تبلیغ کا آغاز
کفار کی مخالفت: ۳ تا ۵ نبوی، ۴۳ تا ۴۵ سال کی عمر میں
قریش مکہ کی مخالفت کا پہلا دور
کفار کی شدید مخالفت: ۵ تا ۷ نبوی قریش کی طرف سے شدید مظالم ہوئے
ہجرت حبشہ ۵ نبوی: ۴۵ سال کی عمر میں
حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ
کا قبول اسلام: ۵۔۶ نبوی، ۴۶ سال کی عمر میں
شعب ابی طالب میں محصوری: ۶ تا ۹ نبوی۔ ۴۷ سال کی عمر میں
دوسری ہجرت حبشہ: ۶۔۷ نبوی ۴۹ سال کی عمر میں
محصوری و مقاطعہ کا اختتام: ۱۰ نبوی / ۵۰ سال کی عمر میں
چچا ابو طالب کا انتقال: ایضاً
حضرت خدیجہؓ کی وفات: ایضاً
طائف کا تبلیغی سفر: ۱۰ نبوی ایضاً
حضرت عائشہؓ سے نکاح: ایضاً
واقعہ معراج: ایضاً
فرضیت نماز پنجگانہ: ایضاً

مدینہ میں آغاز اسلام:	ایضاً
آمد و وفد مدینہ:	۱۱ نبوی / ۵۱ سال کی عمر میں
مدینہ کے چھ افراد کا قبول اسلام	
بیعت عقبہ اولیٰ:	۱۲ نبوی / ۵۲ سال کی عمر میں
	مدینے کے ۱۲ افراد کا قبول اسلام
بیعت عقبہ ثانیہ:	۱۳ نبوی / ۵۳ سال کی عمر میں
	مدینے کے ۷۵ افراد کا قبول اسلام
ہجرت مدینہ:	۱۳ نبوی / ۵۳ سال کی عمر میں

ہجرت تا رحلت

مدینے میں ورود نبوی:	۵۴ سال کی عمر میں (۱۲ ربیع الاول)
تاسیس مسجد نبوی۔ مؤاخات:	۱ھ / ۵۴ سال کی عمر میں
نظام دفاع کا آغاز:	ایضاً
مدینے کا نظم و نسق:	ایضاً
میثاق مدینہ:	ایضاً
جہاد کی اجازت:	۲ھ / ۵۵ سال کی عمر میں
اذان کا آغاز:	ایضاً
فرضیت زکوٰۃ:	ایضاً
تحویل قبلہ:	ایضاً
معرکۂ بدر:	ایضاً
نماز عید الفطر:	ایضاً
حضرت علی کا حضرت فاطمہؓ سے نکاح:	ایضاً
بنو قینقاع کی جلاوطنی:	۳ھ / ۵۶ سال کی عمر میں

بنو قینقاع کو بد عہدی اور غداری
کی پاداش میں جلا وطن کردیا گیا

حضرت حفصہ بنت عمرؓ سے نکاح: ایضاً

بنت نبیؐ حضرت ام کلثوم کا حضرت عثمانؓ
بن عفان سے نکاح: ایضاً

امتناع شراب کا حکم: ایضاً

غزوۂ احد: ایضاً

حضرت زینبؓ بنت خزیمہ سے نکاح: ایضاً

حادثۂ رجیع: ۴ ہجری/ ۵۷ سال کی عمر میں
بنو عامر کی مکاری اور دس قاریوں کی شہادت

حادثہ بئر معونہ: ایضاً ،
سترؓ علماء صحابہ کو بد عہدی اور غداری سے
شہید کردیا گیا

حکم حجاب: ایضاً

حرمت شراب کے قانون کا نفاذ ایضاً

امُّ المومنین حضرت زینبؓ
بنت خزیمہ کا انتقال: ایضاً

غزوہ بنو نضیر: ایضاً۔
مدینے کا یہ یہودی قبیلہ بوجہ جرم
بغاوت اور اقدام قتل حضور علیہ السلام
جلاوطن کردیا گیا

حکم تیمم حکم تیمم

حضرت جویریہ سے نکاح:	ایضاً۔ ۵ ہجری / ۵۸ سال کی عمر میں
پردہ سے متعلق قوانین:	ایضاً
غزوۂ خندق/احزاب:	ایضاً
حضرت زینب بنت جحش سے نکاح:	ایضاً
زنا' قذف اور لعان کے احکام:	ایضاً۔ ان جرائم کے فوجداری قوانین کا نفاذ
غزوۂ بنو قریظہ:	ایضاً انہیں مسلمانوں سے بدعہدی' بغاوت اور غداری کی سزا دی گئی
صلح حدیبیہ:	۶ ہجری / ۵۹ سال کی عمر میں
خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن العاصؓ کا قبول اسلام	ایضاً
تبلیغ اسلام کے سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر دعوت نامے:	ایضاً
غزوۂ خیبر:	۷ ہجری / ۶۰ سال کی عمر میں
حضرت صفیہؓ سے نکاح:	ایضاً
نکاح و طلاق کے تفصیلی قوانین:	ایضاً
حضرت میمونہؓ سے نکاح:	ایضاً
غزوہ موتہ:	۸ ہجری / ۶۱ سال کی عمر میں
فتح مکہ:	ایضاً
غزوہ طائف:	ایضاً
سود کی قطعی حرمت:	ایضاً

آپ کے صاحبزادے ابراہیمؑ کا انتقال:	ایضاً
غزوۂ حنین:	۹ہجری / ۶۲ سال کی عمر میں
غزوہ تبوک:	ایضاً
جزیہ کا حکم:	ایضاً
فرضیت حج:	ایضاً
وفود کی آمد:	ایضاً
حجتہ الوداع:	۱۰ہجری / ۶۳ سال کی عمر میں
آخری خطبہ:	ایضاً
وصال (۱۲ ربیع الاول):	۱۱ہجری ۶۳ سال کی عمر میں علالت و رحلت

OQO

دربارِ نبویؐ کا ملک الشّعراء حضرت حسّان رضی اللہ عنہ

یہ مقالہ پروفیسر عبدالقیوم صاحب مرحوم نے ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۸ء میکلوڈ سکالرشپ کے دوران لکھا، مگر وہ اپنی مصروفیات کے باعث اسے چھپوا نہ سکے۔

(مرتب)

حسّان نام، ابو الولید کنیت، باپ کا نام ثابت، دادا کا نام منذر اور والدہ کا نام فریعہ تھا۔ وہ خزرج میں ممتاز حیثیت رکھتے اور بنو نجار کے سرداروں میں سے تھے۔ اوس و خزرج کے معرکوں میں سے ایک معرکہ یوم سمیحہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے فیصلے کے لئے حسّان کے دادا منذ، بن حرام کو فریقین نے جج تسلیم کیا تھا[۱] چنانچہ حضرت حسّان شعر ذیل میں اس واقعہ کی جانب اشارہ کرتے ہیں:

وابی فی سمیحة القائل الفا

صل یوم التقت علیه الخصوم

(میرے والد محترم ہی سمیحہ کے دن بولنے والے اور فیصلہ کرنے والے تھے، جس دن دونوں فریق آپس میں لڑتے تھے)۔

اس واقعے سے دور جاہلیت میں خاندان حسّان کی اہمیت و منزلت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

۱۔ محمد بن سلام الجمحی: طبقات الشعراء، ص ۸۵

حافظ ابن حجر الاصابہ میں رقمطراز ہیں کہ حضرت حسّان کی والدہ فریعہ نے مشرّف باسلام ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔(۱)

ولادت

کتاب الاغانی میں مرقوم ہے کہ حضرت حسّان بیان کرتے ہیں: میری عمر سات آٹھ برس کی تھی کہ میں نے ایک یہودی کو یثرب میں بلند آواز سے دوسرے یہودیوں کو بلاتے سنا۔ جب بہت سے یہودی اس کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے' تو انہوں نے اس سے بلانے کا مقصد پوچھا وہ یہودی بولا کہ آج احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ستارہ طلوع ہوا ہے(۲) جو رات پیدا ہوا۔ اغانی کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسّان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت سے سات آٹھ برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔

حلیہ

یثربی اور خزرجی خصوصیات کے علاوہ حضرت حسّان کی زبان اتنی لمبی تھی کہ ناک کی پھنگی کو بآسانی لگا لیتے تھے۔(۳) دوسری قابل ذکر چیز یہ ہے کہ آپ اپنی ٹھوڑی کے درمیانی بالوں کو مہندی لگا کر سرخ رکھتے اور باقی ڈاڑھی کو یونہی رہنے دیتے۔ ایک دفعہ ان کے بیٹے عبدالرحمٰن نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ یہ اس لیے تاکہ معلوم ہو کہ میں ایسا شیر ہوں جس کا منہ خون آلود ہے۔(۴)

۱۔ الاصابہ' ۱: ۶۶۸

۲۔ الاغانی' طبع جدید' ۴: ۱۳۵

۳۔ ابن قتیبہ: الشعر والشعراء' ۱: ۱۰۴

۴۔ الاغانی' ۴: ۱۳۶

مختصر حالات زندگی

حضرت حسان اوس و خزرج اور یہود یثرب کے درمیان پروان چڑھے اور انہی لوگوں میں زندگی کا اکثر و بیشتر حصہ گزارا۔ قبائلی معرکوں میں بڑی دلچسپی لی اور بہت سے معرکوں کو اپنے اشعار سے دوام بخشا۔

زمانۂ جاہلیت میں شاہی درباروں میں رسائی حاصل کی' غسّانی حکمران شام اور لخمی شاہان حیرہ کی مدح میں قصائد لکھے اور بڑی عزت و اکرام سے نوازے گئے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نعمان بن منذر لخمی نے ابن کعب' وافد بن عمرو اور نعمان بن مالک کو گرفتار کرلیا۔ ان کی رہائی کے لئے شاہ حیرہ کے دربار میں ایک وفد حاضر ہوا' اس کے رئیس حضرت حسّان تھے۔ اور ان کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ان قیدیوں کو مخلصی نصیب ہوئی۔ اس واقعہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

وانا الصقر عند باب ابن سلمی

یوم نعمان فی الکبول مقیم

ابی و وافد اطلقالی

ثم رحنا و قفلہم محطوم

(میں ہی ابن سلمی کے دروازے پر شکرا (صقر) ہوں۔ جس دن کہ نعمان کبول میں مقیم تھا۔ اور ابی اور وافد کو میری وجہ سے رہائی ملی پھر ہم نے اس حال میں وہاں سے کوچ کیا' کہ انکے قفل کھلے ہوئے تھے)۔

عہد اسلامی میں حضرت حسّان نے اپنی تمام قابلیتوں اور استعدادوں کو اسلام اور پیغمبر اسلام کی مدافعت کے لئے وقف کردیا تھا۔

حضرت حسّانؓ کو شاعری وراثت میں ملی تھی اور یہی وراثت ان کے بیٹے اور بیٹی میں منتقل ہوگئی۔

حضرت حسّان نے ایک سو بیس برس کی عمر پائی' ساٹھ برس جاہلیت کی زندگی اور ساٹھ سال اسلامی زندگی گزارنے کے بعد ۵۴ھ میں انتقال فرمایا۔(۱) علامہ ابن حجر نے تہذیب التہذیب(۲) میں لکھا ہے کہ حضرت حسّان کے سارے خاندان نے بڑی لمبی عمریں پائیں۔ صاحب الاغانی رقم طراز ہے کہ حضرت حسّان کے والد ۱۵۰ برس تک زندہ رہے۔

صحیح بخاری(۳) میں مرقوم ہے کہ آخری عمر میں حضرت حسّان کی بصارت زائل ہو چکی تھی۔ اس نازک موقع پر انہوں نے اپنے احساسات اور جذبات کا اظہار اشعار ذیل میں کیا ہے:

ان یاخذ اللّٰہ من عینی نورھا
ففی لسانی وقلبی منھا نور
قلب ذکی و عقل غیر ذی زئل
وفی فمی صارم کالسیف ماثور

جب انگریزی شاعر ملٹن بھی بصارت و بینائی سے محروم ہوا' تو اس نے بھی اسی قسم کے خیالات و افکار کو اپنے اشعار میں پیش کیا۔

حضرت امیر معاویہؓ کا ایک سفیر جب روم میں غسّانی بادشاہ کے دربار میں پہنچا تو اس نے شاعر حضرت حسّان کی بابت دریافت کیا' جب سفیر نے بتایا کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور بینائی جاتی رہی ہے تو بادشاہ نے ایک ہزار دینار اور قیمتی خلعت دیا اور کہا کہ اگر حسّان زندہ ہو تو اس کے سپرد کر دینا اور مر چکا ہو تو یہ کپڑے اس کی قبر پر بچھا دینا اور دیناروں کے اونٹ خرید کر اس کی قبر پر ذبح کر دینا۔ جب سفیر واپس آیا اور سارا قصہ سنایا تو حضرت حسّان رو پڑے اور کہا کہ کاش میں مر گیا ہوتا۔(۴)

۱۔ ابن العماد: شذرات الذہب' ۱: ۶۰

۲۔ ایضاً' ۲: ۲۴۸

۳۔ البخاری' کتاب المغازی' باب ۴۔

۴۔ الشعر والشعراء ص ۱۰۴

حضرت حسان کے بھائی اوس ثابت قدم، نہایت جری، دلیر اور بہادر سپاہی تھے۔ انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ بدر، احد، خندق و دیگر معرکوں میں شرکت کی۔(۱)

جبن (کم دلی)

حضرت حسانؓ نے اپنی طویل عمر میں بے شمار معرکے اور جنگ و قتال کے میدان گرم ہوتے دیکھے، بایں ہمہ جاہلی اور اسلامی عہد کی کسی ایک جنگ میں بھی شرکت نہیں کی، عرب شعرا میں صرف حضرت حسان ہی ایک ایسے شاعر نظر آتے ہیں جو زبان سے تو قوموں اور ملکوں کو تہ و بالا کرتے دکھائی دیتے ہیں، مگر دل گردے کے اتنے کمزور ہیں کہ تلوار اٹھا کر میدان جنگ میں کودنا تو کجا، مردہ انسان کے ہتھیار چھیننے کی جرات بھی نہ رکھتے تھے۔ جنگ خندق کا واقعہ ہے کہ اسلامی فوج جنگ میں دشمن کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ عورتوں کو حضرت حسانؓ کے ساتھ قلعہ "فارع" میں ٹھہرایا گیا اور ان کی حفاظت کے لئے حضرت حسان کو مامور کیا گیا۔ حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب نے ایک یہودی کو قلعہ کے گرد چکر لگاتے دیکھ کر حضرت حسانؓ کو اس مشتبہ آدمی کی جانب توجہ دلائی اور کہا کہ مبادا یہ دشمن یہودی جاسوسی کر کے ہمیں نقصان پہنچائے، لہٰذا اس کو قتل کر دو۔ حضرت حسانؓ بولے: اے عبدالمطلب کی بیٹی! خدا تمہیں بخشے تم جانتی ہو کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ جب حضرت صفیہؓ نے حسانؓ کے یہ الفاظ سنے تو خود خیمہ کی ایک چوب لے کر گئیں اور یہودی کا کام تمام کر دیا۔ پھر حضرت حسانؓ کو آ کر کہا کہ اب جاؤ اور مقتول یہودی کے ہتھیار اور کپڑے وغیرہ تو سنبھال لو، مگر حضرت حسانؓ سے یہ بھی نہ ہو سکا۔(۲)

۱۔ ابن سعد: طبقات، ۳: ۶۳

۲۔ الاصابہ، ۱: ۶۶۸

اس واقعہ کی روشنی میں اندازہ فرمایئے کہ حضرت حسانؓ کس دل اور گردے کے آدمی تھے۔

شعرو شاعری

دور اول کے شعرا میں صرف حضرت حسانؓ ہی ایک ایسے شاعر تھے، جن کی شاعری میں اسلام کے بعد بھی فرق نہ آیا۔ عموماً ایسا ہوتا تھا کہ جب کوئی شاعر مشرف باسلام ہو جاتا تو قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا اور عمر بھر شعر نہ کہتا، بلکہ لبید کی طرح کہہ دیتا کہ قرآن کی نثر میں اتنی شاعری اور فصاحت و بلاغت ہے کہ اس کے بعد شعر کہنا فضول ہے، مگر حضرت حسانؓ کی شاعری کا کمال ملاحظہ ہو کہ ان کی شعر گوئی میں فرق نہ آیا۔ یہ اعتراف ضرور ہے کہ دور جاہلیت جیسی غزل گوئی نہ رہی تھی، لیکن دل و دماغ میں شعر کے سوتے برابر جاری رہے۔ اور شاعری کا خوشگوار چشمہ حضرت حسانؓ کے احساسات و جذبات کو بڑی تیزی اور سرعت سے اگلتا رہا۔ اگرچہ عہد اسلامی میں صحبت نبوی کی وجہ سے بہاؤ کا رخ بدل چکا تھا، مگر روانی میں ذرا فرق نہ آیا، لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ حسانؓ کی جاہلی اور اسلامی شاعری میں ادبی نقطہ نگاہ سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوا تو بے جا نہ ہو گا۔

عصر جاہلی میں غزل، فخر و مدح، حماسہ اور دوسری اقسام شعر پر طبع آزمائی کی مگر اسلامی اخلاق و تعلیم سے متاثر ہو کر غیر مہذب چیزوں کو ترک کر دیا۔ عہد اسلامی میں فخریہ و طنزیہ اور مدحیہ اشعار کہے، لیکن ان کا انداز اور ان کے اغراض و مقاصد بدل چکے تھے۔ جاہلیت کی جھوٹی مدح، کذب بیانی اور غلیظ و گندی ہجو نگاری کی بجائے دور اسلامی میں حقیقی تعریف و ستائش، اعلائے کلمۃ اللہ، حق گوئی اور اصلاحی و پاکیزہ طنز نے جگہ لے لی۔ ذلیل اور اسفل مقاصد کی جگہ بلند، اعلیٰ اور نیک جذبات کار فرما نظر آنے لگے۔

جاہلی دور کی شاعری میں صرف وہی حصہ قابل تعریف ہے جس میں اہم واقعات اور جنگوں کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں، یعنی اوس و خزرج کی لڑائیاں، حیرہ اور شام کے بادشاہوں کے درباروں کے حالات وغیرہ۔

عرب شعرا دو گروہوں میں منقسم تھے' ایک شہری اور دوسرے بدوی۔ تمام اکابر شعرا بدوی تھے۔ شہری شعرا بہت کم ہوئے ہیں۔ اغانی کی روایت کے مطابق عربوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یثربی شعرا کو تمام شہری شعرا پر فضیلت حاصل ہے اور یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ یثربیوں میں بہترین شاعر حضرت حسانؓ ہیں۔(۱)

حضرت حسانؓ کو کئی جہتوں سے دوسرے شاعروں پر فضیلت حاصل ہے:
(۱) زمانہ جاہلیت میں انصار کے شاعر تھے؛ (۲) عہد نبوی میں شاعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہلائے اور (۳) عہد اسلامی میں شاعر یمن کا لقب پایا۔(۲)

اگرچہ دربار نبوی میں شعرا بکثرت تھے۔ خود یثربی شاعروں میں عبداللہؓ بن رواحہ اور کعبؓ بن مالک جیسے بلند پایہ شاعر بھی مدافعت اسلام میں پیش پیش نظر آتے ہیں' مگر جو بلند درجہ اور اعلیٰ مرتبہ حضرت حسانؓ کو نصیب ہوا وہ کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہ آسکا۔ صاحب الاغانی کی روایت کے مطابق واقعات اس طرح ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کی مخالفت میں مشرکین مکہ اپنی تمام کوششوں کو ناکام ہوتا دیکھ کر اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے۔ انہوں نے شاعروں کی خدمات حاصل کیں اور ان سے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار لکھوانے شروع کیے۔ اس پر بعض مسلمانوں نے حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ کفار کی ہجو گوئی کا جواب دیجیے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے کہا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت دیں تو میں اس خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ جب لوگوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی تو ارشاد ہوا کہ وہ اس کام کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ پھر لوگوں نے انصار کو توجہ دلائی کہ جس طرح تم لوگوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت تلوار اور نیزے کے ساتھ کی ہے اسی طرح آپؐ کی مدافعت میں اپنی زبان کو بھی حرکت میں لاؤ۔ اس پر حضرت حسانؓ نے اپنی خدمات پیش کیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حسان تم قریش کی ہجو کرو گے' حالانکہ میں انہیں

۱۔ الاغانی ۴: ۱۳۷

۲۔ الاصابہ ۱: ۶۶۸

میں سے ایک فرد ہوں؟ حضرت حسّانؓ نے عرض کیا' یا رسول اللہ! میں آپ کو اس طرح الگ رکھوں گا جس طرح آٹے سے بال نکال لیا جاتا ہے۔ اس پر حضورؐ نے دُعا کی

اَللّٰهُمَّ اَيِّدْهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ

(اے اللہ ان کی روح القدس سے مدد فرما۔)

حضرت حسّانؓ یثربی ہونے کی وجہ سے قریش مکہ کے حالات' معرکوں اور انساب سے بہت زیادہ واقفیت نہ رکھتے تھے اور ہجو کہنے کے لئے اس قسم کی معلومات ازبس ضروری تھیں۔ اس لئے بارگاہ نبوی سے ارشاد ہوا کہ حسّانؓ کو اس کام کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی جانب رجوع کرنا چاہیے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسّانؓ کے لئے مسجد نبوی میں منبر رکھوا دیتے تاکہ وہ اس پر کھڑے ہو کر مشرکین مکہ کی ہجو گوئی کا جواب دیں۔(۱)

حضرت حسّانؓ نے ایک قصیدہ کہا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کے بعد ابو سفیان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

الا ابلغ ابا سفیان عَنّی
مغلغلةً فقد برح الخِفاءُ
هجوتَ محمدًا فاجبتُ عنهٗ
وعِنداللّٰهِ فی ذاک الجزاء
فانَّ ابی و والدهٗ و عرضی
لعرض محمّدٍ مّنکم وقاءٗ
اتهجوهٗ ولستَ لهٗ بِکُفءٍ
فشرّکما لخیر کما فداءٗ

---

۱ الاصابہ' ۱: ۲۶۸

(یعنی ابو سفیان تک میری یہ بات کھلے الفاظ میں پہنچا دی جائے کہ مخفی بات ظاہر ہو گئی ہے' تو نے (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہجو کی ہے' تو میں نے تجھے اس کا جواب دیا ہے۔ اور میرے اس کام کا اجر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ پس بے شک میرا باپ' اور ان کا باپ اور میری عزت و آبرو تمہاری طرف سے' آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت کے لیے ڈھال ہے' تو آپؐ کی ہجو کہتا ہے' حالانکہ تو آپؐ کا ہمسر نہیں ہے۔ پس تم دونوں میں سے بدتر' تم دونوں میں سے بہتر (آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم) پر قربان ہو جائے)۔

معجم الشعرا میں لکھا ہے(۱) کہ فرات بن حیان مشرکین قریش کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف شعر کہتا تھا۔ حضرت حسّانؓ نے اس کو مندرجہ ذیل شعر میں دھمکی دی۔

فان نلق فی تطوافنا وابتغائنا
فرات بن حیان یکن و ھوَ ھالک

(اگر ہمیں طلایہ گردی اور تلاش کے دوران میں کبھی فرات بن حیان مل گیا تو وہ ہلاک ہو جائے گا)۔

رسول اللہ کی نظروں میں

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ' کعبؓ بن مالک اور حسانؓ کا ذکر کرتے ہوئے اول الذکر دونوں کے متعلق تو الگ الگ احسن کا لفظ استعمال فرمایا' مگر حسانؓ کے متعلق فرمایا فَسَقیٰ واسْتَقیٰ (اس نے پانی پلایا بھی اور پیا بھی)۔

۱۔ المرزبانی' ص ۳۱۷

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے وقت سفر میں فرمایا: حسانؓ بن ثابت کہاں ہے؟ حضرت حسانؓ نے عرض کیا لبیک یا رسول اللہ (یا رسول اللہ میں حاضر ہوں)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حدی کے اشعار سناؤ۔ حضرت حسانؓ نے شعر پڑھنے شروع کیے آپ بڑی توجہ سے سنتے رہے۔ خاتمے پر فرمایا کہ حسانؓ کے اشعار تو دشمن کے لئے تیروں کی بوچھاڑ سے بھی زیادہ مضر اور تکلیف دہ ہیں۔

جنگ احزاب کے بعد کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں کی حمایت میں کون شعر کہے گا؟ اس پر حضرت عبداللہؓ بن رواحہ، کعبؓ اور حسانؓ نے اپنی خدمات پیش کیں، مگر نگاہ انتخاب حضرت حسانؓ پر پڑی۔(۱)

وفد بنو تمیم کا اعتراف

بنو تمیم نے اسّی آدمیوں کا ایک وفد مرتب کیا اور اس میں اکابر و اعاظم قوم کے علاوہ چرب زبان خطیبوں اور شاعروں کو بھی شامل کیا۔ یہ وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اور بلند آواز سے پکارنا شروع کیا۔ اخرُجْ الینا یا محمدُ فَقَدْ جِئْنَا لِنفاخرک (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلو، ہم تجھ سے فخر کی باتوں میں مقابلہ کرنے آئے ہیں) جب ان کے خطیب اور شاعر یکے بعد دیگرے کھڑے ہو کر اپنا اپنا کلام سنا چکے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب کے لئے حسانؓ کو کہا۔ چنانچہ حضرت حسانؓ نے کھڑے ہو کر صحابہؓ کی مدح میں برجستہ ایک قصیدہ کہہ دیا۔ جس کے آخر میں وفد کو یوں مخاطب کیا:

خذمنهم ماالتی عفوا وان منعوا
فلا یکن همک الامر الذی منعوا

۱۔ الاغانی، ۴: ۱۴۵

فان فی حربهم فاترک عداوتهم

سما یخاض علیه انصاب واسلع

اکرم بقوم رسول اللّٰه قائدهم

اذا تفرقت الاهواء والشیع

یہ قصیدہ سننے کے بعد رئیس وفد نے حضرت حسانؓ کی قابلیت اور فضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ واللّٰہ لشاعرہ اشعر من شاعرنا ،لخطیبه اخطب من خطیبنا (بخدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا شاعر ہمارے شاعر سے اور آپ کا خطیب ہمارے خطیب سے بڑھ کر ہے)۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وفد نے اسلام قبول کرلیا اور بارہ گاہ نبوی سے وفد کے ہر رکن کو خلعت سے نوازا گیا۔(۱)

نقادان فن کی شہادتیں

نابغہ ذبیانی نے حضرت حسانؓ کے چند اشعار سن کر کہا۔ انک لشاعر۔ (تو بہت بڑا شاعر ہے) شاعر حطیئہ نے حسانؓ کی فضیلت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

ابلغوا الانصار ان شاعرَهم اشعرُ العُرُب (انصار تک میری یہ بات پہنچا دو کہ ان کا شاعر عربوں میں سب سے بڑا شاعر ہے)۔(۲)

صاحب الاغانی نے حضرت حسانؓ کو فحل من فحول الشعرا کا لقب دیا ہے۔(۳) ابن رشیق اپنی شہرہ آفاق کتاب العمدہ میں رقمطراز ہے۔ (۴)

۱۔ الاغانی' ۴: ۱۴۵

۲۔ ابن حجر: تہذیب التہذیب' ۲: ۲۴۸

۳۔ الاغانی' ۴: ۱۳۵

۴۔ العمدہ' ۱: ۷۲

واشعر اهل المدر باجماع الناس واتفاقهم حسانؓ بن ثابت (تمام لوگوں کا اس بات پر اتفاق و اجماع ہے کہ اہل مدر میں سے' حسانؓ سب سے بڑا شاعر ہے)۔

شاعر کی اپنی زبانی

حضرت حسانؓ اپنی جدت طبع پر خود بھی نازاں تھے۔ شعر گوئی میں غیر مقلد واقع ہوئے تھے' چنانچہ فرمایا:

لا اسرق الشعرا مانطقوا

بل لا یوافق شعر هم شعری

(میں شعرا کی کہی ہوئی کسی بات کا سرقہ نہیں کرتا۔ بلکہ ان کا کوئی شعر میرے اشعار کے موافق نہیں ہے)۔

اپنی قادر الکلامی زبان کی پاکیزگی کا بیان کرتے ہوئے وہ اپنی زبان کو بے عیب تلوار اور اپنے اشعار کو ناقدان فن کے نقد و نظر سے بلند اور معاندین کے طعن سے وراء الوراء قرار دیتے ہیں:

لسانی صارم لا عیب فیه

و بحری لا تکدره الدلاء

(میری زبان میں کوئی عیب نہیں ہے اور میرے سمندر کو کوئی ڈول گدلا نہیں کرتا)۔

حضرت حسانؓ شاعر بھی ہے اور نقاد بھی' شعر کہتا ہے اور شعر و شاعری پر نقد و تبصرہ بھی کرتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت حسانؓ سے دریافت کیا گیا کہ بہترین شاعر کون ہے؟ پوچھا کہ انفرادی حیثیت میں یا بلحاظ قبیلہ؟ لوگوں نے کہا کہ کونسا قبیلہ شعر گوئی میں افضل ہے۔ جواب دیا: قبیلہ حذیل اور حذیل میں ابو ذؤیب کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔(۱)

۱۔ ابن رشیق' ۱: ۷۲

شعر کیا ہے؟ اس میں کونسی چیز خوبی کی ہے؟ حضرت حسّانؓ کا تخیّل ملاحظہ ہو' فرمایا:

و انما الشعر لب المرء یعرضه

علی المجالس ان کیسا وان حمقا

وان الشعر بیت انت قائله

بیت یقال انا انشدته صدقا

(شعر تو در حقیقت انسان کی عقل و دانش ہے' جسے وہ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے' خواہ وہ عقلندی کی باتیں ہوں یا حماقت کی' سب سے اچھا شعر جو تو کہے وہ ہے کہ جس پر تجھے کہا جائے تو نے سچ کہا ہے)۔

مدح رسول اللہ

حضرت حسّانؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں بے شمار قصیدے کہے' مگر ان سب قصائد میں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت حسّانؓ نے غلط بیانی اور غلو سے کبھی کام نہیں لیا۔ ہمیشہ واقعیت و حقیقت کو موزوں الفاظ میں پیش کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و جمال کا یوں ذکر کیا ہے:

و احسن منک لم ترقط عینی

واجمل منک لم تلد النساء

خلقت مبرء من کل عیب

کانک قد خلقت کما تشاءُ

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خوبصورت شخص میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا اور آپؐ سے زیادہ حسین کسی ماں نے اب تک نہیں جنا۔ آپؐ ہر عیب سے پاک پیدا ہوئے ہیں۔ گویا آپ ویسے ہی پیدا ہوئے ہیں جیسے آپ خود چاہتے ہیں)۔

ایک دوسرے قصیدے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوّ مرتبت اور مشن کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

و شق له من اسمه لیجله
فذو العرش محمود و هذا محمد
نبی اتانا بعد یاس و فترة
من الرسل و الاوثان فی الارض تعبد
فامسیٰ سراجاً مستنیراً وَ هادیاً
یلوح کما لاح الصقیل المهنَّد
وانذرنا ناراً و بشّر جنّةً
و علمنا الاسلام فاللّٰہ نحمَدُ

(اللہ تعالیٰ نے اپنے نام سے آپ کا نام مشتق کیا ہے۔ پس عرش والا محمود اور یہ (پیغمبرؐ) محمد ہے۔ آپ ایسے نبی ہیں جو انبیا کی طرف سے مایوسی اور رسولوں کے انقطاع کے بعد اس وقت آئے جب پوری دنیا میں بتوں کی پوجا ہو رہی تھی۔ پس آپ چراغ' روشنی دینے والے اور ہدایت دینے والے ہو گئے اور آپ ایسے چمکتے ہیں جیسے کہ صیقل کی ہوئی شمشیر براں چمکتی ہے۔ آپؐ نے ہمیں جہنم سے ڈرایا اور جنت کی خوشخبری سنائی' اور ہمیں اسلام سکھایا۔ پس ہم اللہ ہی کی حمد کرتے ہیں)۔

و انت اله الخلق ربّی و خالقی
بذالک ما عمرت فی الناس اشهد
تعالیت رب الناس عن قول من دعا
سواک الٰهاً انت اعلیٰ و امجد
لک الخلق والنعماء والامر کله
فایاک نستهدی و ایاک نعبد

(اے میرے پروردگار تو ہی تمام مخلوق کا معبود بر حق ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں لوگوں کے سامنے یہی گواہی دیتا رہوں گا۔ اے خدا تو ان تمام لوگوں کی بات سے' بلند و بالا ہے جنہوں نے تیرے سوا کسی اور کو پکارا' تو ہی اعلیٰ و ارفع اور بزرگ و برتر ہے۔ اے اللہ تمام مخلوق اور تمام نعمتیں اور تمام اختیار تیرے لیے ہیں۔ پس ہم تجھی سے

ہدایت مانگتے ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں)۔

جنگ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہادری اور شان پیغمبری کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

فینا الرسول و فینا الحق نتبعہ'
حیّ الممات و نصر غیر محدود
ماض علی الھول رکّابٌ لما قطعوا
انا الکماۃُ تحامو فی الصنادید
وافٍ و ماضٍ شھابٌ یستضاء بہٖ
بدرٌ انارَ علی کل الاماجید
مبارک کضیاءِ البُدر صورتُہٗ
ما قال کان قضاء غیر مَرْدودٍ

(ہمارے اندر اللہ تعالیٰ کے رسول اور ہمارے اندر اللہ کا حق ہے جس کی ہم پیروی کرتے ہیں' جو موت سے آزاد ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے لامتناھی مدد ہے۔ آپ خوف سے گزرنے والے' اس جگہ سواری پر سوار ہونے والے جہاں لوگ ہمت چھوڑ دیں۔ اس وقت شہ سوار' جب تیر انداز کمین گاہ میں چھپے ہوتے ہیں' آپ عہد پورا کرنے والے' اپنے قول کو کر گزرنے والے اور ایسے ستارے ہیں جس سے چودھویں کا چاند روشنی حاصل کرتا ہے' جو ساری کائنات پر چمکے ہیں۔ بابرکت ہیں' چودھویں کے چاند کی سی آپ کی صورت ہے' آپ کی کہی ہوئی بات تقدیر مبرم ہو جاتی ہے)۔

اپنے ایک شعر میں اسلامی تعلیمات کو اس طرح پیش کیا:

و تعلم ان اللہ لا رب غیرہ
و ان کتاب اللہ اصبح ھادیاً

(اور تو جانتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور اس کی کتاب (قرآن مجید) ہی لوگوں کے لیے ذریعہ ہدایت ہے)۔

پیغمبر اسلام کے اخلاق حسنہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

والله ربی لا نفارق ماجدًا

عف الخلیقة ماجد الامجاد

متکرمًا یدعو الی رب العلیٰ

بذل النَّصیحة رافع الاعماد

مثل الهلال مبارکاً نا رحمة

سمح الخلیقة طیب الاعواد

(مجھے اپنے پروردگار کی قسم، ہم بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ آپ پاکیزہ عادات والے اور بزرگی کے کام کرنے والے ہیں، انتہائی معزز ہیں۔ رب اعلیٰ کی طرف بلاتے ہیں۔ نصیحت (خیر خواہی) کرنے والے، اونچے ارادوں والے ہیں۔ پہلی تاریخ کے چاند کی طرح بابرکت اور صاحبِ رحمت ہیں۔ معاف کرنے کی عادت والے اور عمدہ صفات والے ہیں)۔

انصار کے ایثار، قربانی، خلوص اور محبت کو یوں ادا کیا:

بذلنا لهُ الاموال من جلّ مالنا

و انفسنا عند الواغی والتاسیا

نحارب من عادی من الناس کلهم

جمیعًا و ان کان الحبیب المصافیا

(جب بھی ضرورت ہوئی اور آپ نے حکم دیا، ہم نے اپنے عمدہ مال اور اپنی جانیں خرچ کر دیں۔ جو شخص بھی تمام لوگوں میں سے آپ کے ساتھ لڑے گا تو ہم اس کے ساتھ لڑیں گے۔ اگرچہ وہ ہمارا دلی دوست ہی کیوں نہ ہو)۔

اسی انداز میں صحابہ کرامؓ کی مدح میں قصائد کہے جو بخوف طوالت حذف کیے جاتے ہیں۔

مرثیہ

حضرت حسانؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر کئی ایک مرثیے کہے۔ جن میں انہوں نے اپنے جذبات عقیدت کا وافر طور پر اظہار کیا۔ خلفاے راشدین، صحابہؓ

اور شہدا کی وفات پر بھی مرثیے کہے۔ صحابہؓ میں سے حضرت عثمانؓ کی شہادت پر بہت زیادہ مرثیے کہے۔ اس کی وجہ ابن ہشام نے یوں لکھی ہے: و نزل عثمان بن عفان علی اوس بن ثابت بن المنذر اخی حسّانؓ بن ثابت فی دار بنی النّجار' فلذالک کان حسّانؓ یحبه و یبکیه حین قتل (حضرت عثمانؓ ہجرت کے بعد حضرت حسّانؓ کے بھائی اوس بن ثابت کے ہاں ٹھہرے تھے' اسی لیے حضرت حسّانؓ ان سے محبت رکھتے تھے اور جب وہ قتل ہوئے تو وہ ان پر روتے تھے)

قتلتم ولی اللّٰہ فی جوف دارہٖ
و جئتم بامر جائرٍ غیر مهتدی
فهل رعیتم ذمة اللّٰہ وسطکم
واوفیتم بالعهد عهد محمد

(تم نے اللہ تعالیٰ کے ایک دوست کو' ان کے گھر میں قتل کر دیا۔ اور تم ایک ظالمانہ فعل کے مرتکب ہوئے ہو (اے قاتلین عثمان) تم نے اپنے میں سے بہترین شخص کے متعلق اللہ سے کیے ہوئے عہد کا لحاظ کیوں نہ رکھا. اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو کیوں پورا نہ کیا)۔

مضمون بہت طویل ہو رہا ہے۔ حضرت حسّانؓ کے کلام کی خوبیوں کا ذکر ابھی تک بالکل ادھورا پڑا ہے۔ حضرت حسّانؓ کا دیوان اس عہد کی مستقل تاریخ ہے' ان کے اشعار عہد نبوی اور دور اول کے معاصرانہ ریکارڈ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اوس و خزرج کی جنگیں ان کے اخلاق' اس عہد کے عام واقعات و حالات' ان کی حضارت و ثقافت' یہ سب چیزیں بحث طلب ہیں اور زیر قلم مقالہ میں سے ان چیزوں کا اضافہ قارئین کے لیے صبر آزما ہو جائے گا' لہٰذا انہیں کسی اور فرصت پر اٹھا رکھتا ہوں۔

○○○

ا۔ سیرت رسول اللہ' یورپی ایڈیشن' ص ۳۲۳

ذمی: سیرت النبیؐ کی روشنی میں

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات اور دستور زندگی ہے اور پیغمبر اسلام سید المرسلین، شفیع المذنبین، خاتم النبیین، رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں اسلام کو نافذ فرمایا۔ اس دین فطرت پر خود بھی عمل کیا اور اپنے صحابہؓ کو بھی اس حیات بخش دستور پر عمل کرایا اور اس طرح ایک ایسا عملی نمونہ اور اسوۂ حسنہ پیش کیا جو رہتی دنیا تک کے مسلمانوں کے لیے ہر دور اور ہر زمانے میں قابل عمل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکّے میں عقائد کی تبلیغ کی۔ توحید و رسالت اور آخرت کے اسلامی اور قرآنی نظریے پیش کیے۔ یہ تیرہ سال کا عرصہ تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کا دور تھا۔ آپؐ مخالفتوں اور عداوتوں کے ماحول میں لوگوں تک اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچاتے رہے۔ غیر اللہ کی پرستش سے روکتے رہے اور توہمات، اور جاہلی رسم و رواج سے عربوں کے دل و دماغ کو صاف اور پاک کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش فرماتے رہے۔

جب آپؐ ہجرت فرما کر مدینے تشریف لے گئے تو وہاں حالات یکسر مختلف پیدا ہو گئے۔ دس سال کے قیام مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی اور اپنے متبعین اور جان نثاروں کو اسلامی حکومت کے نظم و نسق اور دینی سلطنت کے اصول سیاست سے عملی طور پر روشناس کرا دیا۔ عربوں کے قبائلی معاشرے میں حکومت و سلطنت اور سیاست ملکی کا اسلامی تصور پہلی مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف پیش کیا بلکہ اس کو عملی طور پر نافذ کر کے لوگوں کو بتا دیا کہ عدل و انصاف کے تقاضے کیا ہوتے ہیں۔ معاشرے کے مختلف افراد اور ملک میں بسنے والے مختلف طبقات کے کیا حقوق و فرائض ہیں۔ اس پہلی سلطنت میں جو قانون اور حکم

نافذ کیا گیا وہ کسی انسان کا بنایا ہوا نہ تھا' بلکہ وہ قانون الٰہی اور حکم خداوندی تھا۔ ہم مختصر یوں بیان کرسکتے ہیں کہ قرآن و سنت کا قانون جاری اور نافذ کیا گیا تھا۔

اب ہم سیرت النبیؐ کی روشنی میں اسلامی سلطنت میں غیر مسلم رعایا یعنی ذمّیوں کی حیثیت کا جائزہ لیتے ہیں۔

سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ لفظ ذمی کا مفہوم سمجھ لیا جائے کیونکہ یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک لفظ کا مفہوم کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو' مگر بعض غلط فہمیوں بلکہ سازشوں کی وجہ سے اس لفظ کے مفہوم کو یکسر تبدیل کرکے اس میں ذلت و رسوائی' توہین و تحقیر اور نفرت و حقارت کے عناصر پیدا کر دیے جاتے ہیں۔ پھر وہ لفظ اپنے حقیقی معنی و مفہوم سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کے استعمال میں تحقیر' ذم اور برائی کا پہلو غالب آ جاتا ہے۔

در اصل ذمّی کا اطلاق اہل ذمہ پر ہوتا ہے اور ذمّہ کے معنی ہیں: حق' ذمّے داری' کفالت' عہد اور حرمت وغیرہ۔ اسلامی شریعت اور اسلامی قانون کی اصطلاح میں ذمّی اس شخص کو کہتے ہیں جس سے حکومتی سطح پر کوئی عہد و پیان کیا گیا ہو اور اس لیے ذمی کو اہل الذمہ کے علاوہ اہل العہد (یعنی وہ شخص جس سے عہد و پیان کیا گیا ہو) بھی کہتے ہیں۔ الجوہری ایسے ماہر لغت نے ذمّی کو اہل العقد کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ ایک دوسرے ماہر لسانیات نے ذمہ کا مفہوم بھی امان بیان کیا ہے۔

معاہد کو ذمّی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ عہد و پیان کے بعد مسلمانوں کی حمایت و حفاظت میں آ جاتا ہے۔ اس کو امان مل جاتی ہے اور اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ ذمّی کے مال و جان اور عزت و آبرو اور شہری حقوق کی نگہداشت کرے اور اسے کسی قسم کی تکلیف' ضرر یا نقصان نہ پہنچنے دے۔ اسلامی ریاست کا یہ مقدس فرض ہے کہ وہ غیر مسلم رعایا کے حقوق کی پوری پوری حفاظت کرے' کیونکہ حکومت نے یہ ذمہ لیا ہے۔ اس کے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ لفظ ذمّی میں تحقیر و تذلیل کا قطعاً کوئی تصور یا پہلو نہیں پایا جاتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا

یہ بہت بڑا فیضان ہے کہ آپؐ نے غیر مسلم رعایا کو ہر طرح کی امان دی اور ان کے شہری حقوق کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا۔ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر مسلم قوم کا کوئی شخص بھی کسی کو امان دے دے تو ساری مسلم قوم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ جسے امان دی گئی ہے اس کی پوری پوری حفاظت کرے تاکہ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔" تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ جب عہد فاروقی میں میدان جنگ میں ایک غلام نے دشمن کی ایک فوج کو امان دے دی تھی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس غلام کے عہد اور ذمے کو قائم رکھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اسلامی عقائد و عبادات کی تعلیم دی وہاں اخلاق و آداب بھی سکھائے' سیاست کاری اور حکمرانی کے اصول بھی بیان فرمائے اور صلح و جنگ کے قواعد و ضوابط کی تشریح بھی فرمائی۔ مختلف طبقات کے شہریوں کے حقوق بھی متعین فرما دیے۔ مسلم اور غیر مسلم رعایا نیز غیر مسلم جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک اور برتاؤ کے بارے میں احکام نافذ ہی نہیں کیے' بلکہ ان پر عمل کر کے ایک نمونہ اور مثال قائم فرما دی۔ جنگ کے دوران میں بچوں بوڑھوں اور عورتوں کو قتل کرنے کی ممانعت فرما دی۔ کھیتوں کو برباد کرنے اور درختوں کو کاٹ کر تباہ کرنے سے روک دیا۔ اسلام سے پہلے یہ عام دستور تھا کہ میدان جنگ میں دشمن کو قتل کرنے کے بعد اس کے ناک و کان اور دیگر اعضا کاٹ دیئے جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موت اور قتل کے بعد بھی آدمیت کے تقدس کو ملحوظ رکھنے کی غرض سے اس وحشیانہ اور ظالمانہ حرکت سے باز رہنے کا حکم دیا۔ جنگی قیدیوں کو جیلوں میں رکھنے اور بیڑیوں میں جکڑنے کی بجائے ایک نہایت شریفانہ اور پروقار طریقہ بتایا' کہ ان کو گھروں میں لے جا کر ان سے خدمت تو لو' لیکن انہیں کھانے پینے اور پہننے کے لیے وہی کچھ دو جو تم خود استعمال کرتے ہو۔ اس کے دو واضح فائدے نظر آتے ہیں' ایک تو یہ کہ جنگی قیدی قید و بند کی تکالیف و مصائب ہی سے نجات نہیں پاتے بلکہ احساس قید سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے گھریلو ماحول میں ان کے حسن سلوک اور نیک برتاؤ اور صالح

کردار سے متاثر ہو کر اپنی زندگی اور اپنے عقیدے کو بہتر بنا کر مؤمنانہ طرز زندگی کو اپنائیں۔

یہ بات بڑی واضح ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم رعایا کی تین اقسام ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو کسی معاہدے یا صلح نامے کے ذریعے اسلامی ریاست کی رعایا بنے ہوں۔ ایسے لوگوں کو معاہد کہتے ہیں۔

دوسرے وہ غیر مسلم جو جنگ میں شکست کھانے کی بعد مغلوب و مفتوح ہوئے ہیں' یہ لوگ مفتوحین کہلاتے ہیں۔

تیسرا طبقہ ان غیر ملکیوں کا ہے جو پہلی دونوں صورتوں سے بالکل الگ ہیں وہ اسلامی ریاست کے باشندے ہیں اور انہوں نے اسلامی ریاست کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔ اگرچہ ان تینوں اقسام کے عام حقوق برابر و یکساں ہیں' لیکن پہلے دونوں اقسام کے احکام میں تھوڑا بہت فرق ہے۔

معاہدین

معاہدین کے بارے میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ ان کے تمام معاملات میں شرائط صلح کے مطابق برتاؤ کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرائط صلح کی خلاف ورزی کرنے سے سختی کے ساتھ روک دیا۔ صلح نامے کی شرائط کیسی ہی سخت کیوں نہ ہوں ان پر عمل درآمد ضروری قرار دیا اور شرائط صلح کی پابندی نہ کرنے پر سخت وعید فرمائی ہے۔

امام ابو داؤد نے اپنی کتاب السنن (کتاب الجہاد) میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "اگر تمہیں کسی قوم سے جنگ کرنی پڑے اور تم ان پر غالب آ جاؤ اور وہ تم سے کچھ شرائط پر صلح کر لے تو ان مقررہ شرائط سے تجاوز کرنا تمہارے لیے قطعاً" جائز نہیں۔" امام ابوداؤد نے ایک اور حدیث روایت کی ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو خبردار کرتے ہوئے فرمایا کہ کان کھول کر سن لو کہ جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا' یا اس کے حقوق میں کسی قسم کی کمی

کرے گا' یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالے گا یا اس کی مرضی کے خلاف اس سے کوئی چیز لے گا تو قیامت کے دن میں خود ایسے ظالم شخص کے خلاف مدعی بنوں گا۔

ہمارے ہاں حدیثی' فقہی اور شرعی ادب میں غیر مسلم رعایا کے حقوق پر بڑی تفصیلات موجود ہیں' مگر معاہدین کے بارے میں صرف یہ عام قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت ان کے ساتھ طے شدہ شرائط کے مطابق معاہدہ کرے۔ ان شرائط میں کمی بیشی کرنا قطعاً" جائز نہیں۔ نہ تو ان پر زر صلح بڑھایا جا سکتا ہے' نہ ان کی زمینوں پر حکومت قابض ہو سکتی ہے' نہ ان کو گھربار سے محروم کیا جا سکتا ہے۔

انہیں اپنے مذہبی معاملات اور عبادات میں پوری آزادی حاصل ہے۔ اسلامی ریاست میں ان کی عزت و آبرو اور مال و جان محفوظ و مامون ہیں (ابو یوسف کتاب الخراج' ص ۳۵)۔

مفتوحین

یہ وہ غیر مسلم لوگ ہیں جنہیں مسلمان فوجوں نے میدان جنگ میں بزور شمشیر فتح کیا اور لڑائی کے نتیجے میں ان کے علاقے مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے ہوں۔ ایسے مفتوحین کو اسلامی ریاست میں خاص حقوق دیے جاتے ہیں' جن کے متعلق تفصیلی بیان ہمارے فقہی ادب میں بڑی شرح و بسط سے ملتا ہے' مثلاً" (ا) جب اسلامی حکومت کا سربراہ ان مفتوحین سے جزیہ لینا قبول کر لے تو اس کے نتیجے میں دوامی عقد ذمہ قائم ہو جاتا ہے اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت و نگہداشت مسلمانوں پر فرض ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد مسلمان سربراہ ریاست کے لیے مفتوحین کو غلام بنانے یا ان کی جائیداد و املاک پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ گویا کہ قبول جزیہ مفتوح ذمیوں کے لیے ایسا پروانہ امن و سلامتی ہے کہ اس کے بعد وہ اپنے گھربار یا اپنی جائیداد اور اپنی عزت و آبرو کے بارے میں ہمیشہ کے لیے مطمئن ہو کر بے خوف و خطر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ (بدائع الصنائع ۷ : ۱' کتاب الخراج' ص ۸۲) جب عقد ذمّہ طے پا جانے کے بعد مفتوحین اپنی زمینوں کے خود مالک قرار پاتے ہیں اور انتقال اراضی کے ورثہ کے نام ہو

گا۔ ان لوگوں کو اپنی جائیداد اور اراضی کے بارے میں بیع' ہبہ یا رہن کا قانونی حق حاصل ہو گا۔ اسلامی حکومت ان کو بے دخل کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔

یہاں جزیئے کا ذکر آیا ہے' لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی بھی مختصراً" طور پر وضاحت کر دی جائے۔ در اصل جزیہ وہ ٹیکس ہے جو ذمیوں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے بدلے میں وصول کیا جاتا ہے۔ اگر اسلامی حکومت جان و مال کی حفاظت نہ کر سکے تو جزیہ وصول نہیں کیا جاتا۔ اس سلسلہ میں ہمیں اسلام کا یہ اصول حکمرانی بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ بوقت ضرورت ملکی دفاع یا جہاد کے ضمن میں ہر مسلمان کو فوجی خدمت کے لیے بلایا جا سکتا ہے' لیکن ذمیوں کو یہ رعایت دی گئی ہے کہ ان کے لیے فوجی خدمت لازمی نہیں۔ جزیہ اس فوجی خدمت کے بدلے میں بھی لیا جاتا ہے اور پھر اس جزیئے کی رقم نہایت معمولی ہے۔ علاوہ ازیں کمزور بیمار' اپاہج' عورتیں' بچے' بوڑھے' دیوانے' اندھے' بے روزگار' عبادت گاہوں کے خادم' راہب' لونڈی اور غلام وغیرہ کو جزیئے سے مستثنیٰ ٹھہرایا گیا ہے۔ نیز جزیئے کی وصولی کے وقت اسلام نے نرمی کا حکم دیا ہے اور سختی اور ناروا سلوک سے منع کر دیا ہے۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے عام حقوق کا بھی ذکر کیا جائے جو اسلامی ریاست میں ذمیوں کو حاصل ہیں:

جان کی حفاظت کے بارے میں قانونی طور پر اسلامی ریاست کے سب شہری برابر ہیں' اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کرے تو اس کا قصاص لیا جائے گا اور اسی طرح جس طرح کہ مسلمان کے قتل پر لیا جاتا ہے۔ عہد نبویؐ میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **انا احق من وفی بذمتہ (عنایہ' شرح ہدایہ' ۸:۲۵۶)**' یعنی اس کے ذمہ کو وفا کرنے کا میں سب سے زیادہ حق رکھتا ہوں۔ عہد فاروقی میں ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا اور حضرت عمرؓ کے فیصلے کے مطابق اس قاتل مسلمان کو قصاص میں قتل کر دیا گیا۔ حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ مسلمانوں اور ذمیوں کا قصاص اور دیت برابر ہے۔ ان کے عہد خلافت میں ایک

مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا' تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے شہادت مکمل ہونے کے بعد قصاص کا حکم دے دیا۔ اس طرح کا ایک واقعہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں پیش آیا اور انہوں نے قصاص پر عمل کیا (یحییٰ بن آدم: الخراج' ص ۷۶)

حفاظت مال: آغاز اسلام ہی میں یہ مسئلہ طے پا گیا تھا کہ اسلامی حکومت کے غیر مسلم رعایا کی مقبوضہ اراضی انہیں کے قبضے میں رہیں گی (کتاب الخراج' ص ۱۴)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ذمیوں کی جاگیروں' ان کے غلاموں یا دیگر اراضی کی خریداری سے منع فرما دیا تھا۔ (ایضاً ص ۵۵-۵۶) شام کے ایک کاشت کار کی کھیتی کو فوجیوں کی نقل و حرکت سے نقصان پہنچا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسے بیت المال سے دس ہزار درہم ادا کر دیئے۔

ذمیوں کے سلسلے میں اسلامی ریاست کی یہ بھی اہم ذمہ داری ہے کہ اگر کوئی دشمن ان پر حملہ کر دے تو اسلامی حکومت دشمنوں کا مقابلہ کر کے ان کی مداخلت و حفاظت کرے۔

مذہبی آزادی: اسلامی ریاست میں ذمیوں کو پوری پوری مذہبی آزادی حاصل ہے۔ اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان شاہد عادل ہے' آپ نے نجران کے عیسائیوں کو فرمان لکھ کر دے دیا جس کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں۔ لَا يُفْتَنُوا عَنْ دِيْنِهِمْ (فتوح البلدان' ص ۶۴)' یعنی انہیں ان کے مذہب کے بارے میں کوئی تکلیف یا گزند نہ پہنچنے پائے۔ کتاب الخراج میں امام ابو یوسف نے لکھا ہے کہ پادری' راہب اور گرجاؤں کے پجاری اپنے عہدوں اور منصبوں سے الگ نہیں کیے جائیں گے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے فتح حیرہ کے موقع پر وہاں کے عیسائیوں کو یہ عہد نامہ لکھ کر دیا کہ ان کے گرجے اور کنیسے منہدم نہیں کیے جائیں گے۔ انہیں ناقوس بجانے سے بھی نہیں روکا جائے گا اور نہ اپنے تہواروں پر انہیں صلیب کا جلوس نکالنے سے منع کیا جائے گا یہ اور اس قسم کی دوسری اقدار سیکڑوں معاہدوں میں مشترک ہیں۔

اسلامی حکومت میں ذمیوں کی مذہبی رسوم اور عبادات سے تعرّض نہیں کیا جاتا۔

ذمیوں کو اپنی مذہبی عبادات اور رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت کے سربراہ کا یہ فرض ہوتا ہے کہ ذمیوں کے عبادت خانوں کی حفاظت کرے۔ ان کے عبادت خانے منہدم نہ کیے جائیں۔ انہیں اپنی ضرورت کے مطابق نئی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کا اختیار ہے۔ مسلمان حکمرانوں پر گرجے منہدم کرنے کا الزام بدنیتی پر مبنی ہے۔ مسلمان حکمرانوں نے تو منہدم شدہ گرجے سرکاری خزانے سے از سر نو تعمیر کرا دیئے اور ابن تغری بردی نے **النُّجُومُ الزَّاہِرَة فی ملوک مصر والقاہرہ** اور **المقریزی** نے اپنی کتاب ''الخطط'' میں یہ حقائق قلمبند کیئے ہیں کہ مسلمان حکمرانوں نے نہ صرف یہ کہ پرانے عبادت خانے قائم رکھے' بلکہ معبدوں سے متعلق تمام عہدے اور تمام جائیدادیں قائم اور بحال رہنے دیں۔ پجاریوں اور راہبوں کے مقررہ روزینے مسلمانوں کے بیت المال سے ادا کرتے رہے۔

اسلام کی رواداری اور فراخدلی ملاحظہ ہو کہ ذمی کو کسی قسم کی اذیت یا تکلیف پہنچانے سے منع کر دیا گیا ہے۔ جس طرح کسی مسلمان کو گالی دینا' مارنا پیٹنا یا اس کی غیبت کرنا جائز نہیں' بالکل اسی طرح یہ باتیں کسی ذمی کے حق میں بھی جائز نہیں ہیں۔ فوجداری قانون' مسلمان اور ذمی کے لیے یکساں ہے۔ دونوں کے لیے تعزیرات ایک جیسی ہیں۔ جرائم کی سزائیں مسلمان اور ذمی کے لیے برابر یکساں ہیں۔ چوری' ڈاکہ' زنا' تہمت زنا وغیرہ میں سزا دونوں کے لیے یکساں ہیں۔ البتہ شراب کے معاملے میں ذمیوں کو رعایت حاصل ہے۔ دیوانی قانون بھی مسلمان اور ذمی دونوں کے لیے یکساں ہے۔ تجارت اور کاروبار کے ضمن میں بھی رعائتیں اور پابندیاں دونوں کے لیے ایک جیسی ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اگر کسی زمانے میں کسی مسلمان حکمران نے ذمیوں پر ظلم کیا یا کوئی ناانصافی برتی تو علمائے دین اور فقہائے اسلام نے ذمیوں کے حقوق کی حمایت کی اور ظلم و ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ علماء نے ہمیشہ اسلامی قانون کی پاسبانی کا اہم کردار ادا کیا ہے اور ہماری تاریخ کو اس شاندار کردار پر فخر ہے آج بھی فخر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

ہمیں یہ حقیقت ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم رعایا سے حسن سلوک اور فراخدلانہ رواداری کا حکم دیا ہے۔ معاملات میں نرمی برتنے کی تلقین فرمائی ہے۔ ایک اسلامی حکومت میں انہیں پوری مذہبی' معاشرتی اور معاشی آزادی حاصل ہے۔ اسلام ان کے عقائد' عبادات اور رسم و رواج پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتا' لیکن اس کے ساتھ یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ اسلام ایک نظریاتی اور اصولی حکومت کا داعی اور حامی ہے اور نظریاتی حکومت اور جمہوری حکومت میں بڑا فرق ہے۔ اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا کو شریعت کے عطا کردہ حقوق پر مجبور ہوتی ہے ان حقوق کو سلب کرنے یا ان میں کمی کرنے کا اختیار اسلامی حکومت کو ہرگز حاصل نہیں ہے۔ جبکہ جمہوری حکومتیں اقلیتوں کے حقوق غصب کر لیتی ہیں اور اقلیتوں کے وجود کو بھی ختم کر دیتی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں ذمیوں کو وہ تمام بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوں گے جو ایک مسلمان شہری کو حاصل ہیں اور اس پر شریعت کی عطا کردہ رعائتیں الگ ہیں۔

دیوانی اور فوجداری قانون میں مسلم اور غیر مسلم دونوں برابر ہوں گے۔ ذمیوں کو مذہبی عقائد و عبادات میں آزادی کے ساتھ اس بات کا بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے مذہب کی تعلیم دیں۔ ذمیوں کو تہذیبی خود اختیاری حاصل ہو گی اور ان کے شخصی اور عائلی معاملات میں ان کے اپنے قوانین ان پر لاگو ہوں گے۔ اسلامی پرسنل لا ان پر عائد نہیں کیا جائے گا۔

اس کے بعد بھی یہ گنجائش ہے کہ مزید حقوق تعین کرنے کے لیے ایک اجتہادی بورڈ قائم ہو جو وقتاً" فوقتاً" اقلیتوں کے مسائل و معاملات پر ہمدردانہ غور کرتا رہے۔

○○○

سیرت طیبہ پر ایک جامع تصنیف کا خاکہ

پروفیسر عبدالقیوم صاحب ـــــ نوّر اللہ مرقدہٗ ـــــ عربی اور علوم اسلامیہ، بالخصوص علوم قرآن، سیرت طیبہ اور حدیث پر سند تسلیم کیے جاتے تھے۔ انہوں نے یوں تو اس موضوع پر بے شمار مقالات لکھے اور تصانیف مرتب کیں، مگر ان کے کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرحوم کے ذہن میں ایک جامع سیرت طیبہ کا نقشہ موجود تھا، جس پر آپ کام کرنا چاہتے تھے۔ مرحوم نے اس کے لیے ایک ابتدائی خاکہ (OUT LINE) بنا لیا تھا، مگر افسوس کہ انہیں اس عظیم الشان کتاب سیرت کی تکمیل کا موقع نہ مل سکا۔ لہٰذا اس خیال سے کہ عین ممکن ہے اللہ تعالیٰ ان کے چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل کا کسی اور کو موقع فراہم کر دے۔ ان کا مرتبہ خاکہ انہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ عرب ممالک کا مختصر جغرافیہ و حالات
۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرہ نسب۔ قبیلہ قریش پر مختصر نوٹ
۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤ اجداد کے فضائل کا بیان
۴۔ ولادت باسعادت والد محترم
۵۔ بئر زمزم کی بازیافت
۶۔ حضرت عبداللہ کی شادی
۷۔ اصحاب فیل کا واقعہ
۸۔ ولادت باسعادت سرکار دوعالم
۹۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت طیبہ کا جشن مبارک
۱۰۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسما گرامی
۱۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلانے والی خواتین
۱۲۔ سینہ مبارک شق ہونے کا واقعہ
۱۳۔ کفار کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کم سنی میں قتل کرنے کا عزم
۱۴۔ حضرت آمنہ کی وفات
۱۵۔ عبدالمطلب کا سیف بن ذی یزن کو مبارک باد دینا
۱۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد عبدالمطلب کی وفات
۱۷۔ ابو طالب کی کفالت

۱۸۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر شام
۱۹۔ بحیرا راہب کا واقعہ
۲۰۔ آپ کے ہمراہی کون تھے
۲۱۔ مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بکریاں چرانے کا بیان
۲۲۔ جنگ فجار اور
۲۳۔ حلف الفضول میں شرکت
۲۴۔ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا سفر فرمایا تھا؟
۲۵۔ جاہلیت کی برائیوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوری کا بیان
۲۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے سفر شام کا واقعہ
۲۷۔ ام المومنین سیدہ خدیجہؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد کا بیان
۲۸۔ تعمیر خانہ کعبہ کی تجدید
۲۹۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب الامین کا بیان
۳۰۔ بچپن اور جوانی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کا بیان
۳۱۔ تورات اور انجیل سے آپ کی رسالت کا ثبوت
۳۲۔ دیگر قدیم کتب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ذکر مبارک
۳۳۔ یہود کا کفار کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد سے ڈرانے کا بیان
۳۴۔ وہ لوگ جن کا نام زمانہ جاہلیت میں "محمد" تھا
۳۵۔ بتوں کی پرستش کا بیان

۱۶۰۔ شہدائے احد کی تدفین
۱۶۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ طیبہ کو واپسی
۱۶۲۔ مسلمانوں پر یہود و منافقین کی طعن و تشنیع
۱۶۳۔ غزوۂ احد میں ملائکہ کا نزول
۱۶۴۔ قرآن کریم میں غزوۂ احد کا ذکر
۱۶۵۔ غزوۂ حمراء الاسد
۱۶۶۔ رجیع کا طلایہ گردستہ
۱۶۷۔ غزوۂ بنی نفید
۱۶۸۔ شراب کی حرمت
۱۶۹۔ غزوۂ ذات الرقاع
۱۷۰۔ صلواۃ خوف کا حکم
۱۷۱۔ آخری غزوۂ بدر
۱۷۲۔ غزوۂ دومتہ الجندل
۱۷۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینبؓ بنت حجش سے عقد
۱۷۴۔ غزوۂ مریسیع یا غزوۂ بنی المصطلق
۱۷۵۔ ہشام بن صبابہ کا قتل
۱۷۶۔ تیمم کے حکم کا نزول
۱۷۷۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ اور افک کا واقعہ
۱۷۸۔ غزوۂ خندق (غزوۂ احزاب)
۱۷۹۔ سخت چٹان کی برآمدگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ
۱۸۰۔ ہردو لشکر کی تعداد
۱۸۱۔ یہودیوں کی عہد شکنی

○○○

تاریخ و تمدّن عالم، تاریخ اسلام

ماہرین علوم اسلامیہ و شعراء،

قدیم تہذیبوں کا تعارف، تاریخ اسلام کا پس منظر

مشرق قریب میں قدیم تہذیبیں:

دریاؤں کی وادیوں نے قدیم انسانی تہذیب کو جنم دیا بالخصوص دریائے نیل، دجلہ، فرات اور سندھ کی وادیوں میں قدیم تہذیبیں پروان چڑھیں۔ اس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ ان وادیوں میں بسنے والے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ ان کی ترقی و تہذیب چند باتوں سے خاص طور پر ظاہر ہوتی ہے:

- انہوں نے مل جل کر رہنے کے لیے بستیاں بنائیں۔

وہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور تحریر کے ذریعے اپنے خیالات دوسروں تک پہنچا سکتے تھے۔

- وہ مل جل کر کام کرتے اور ایک دوسرے کی مدد اور اعانت کرتے تھے۔ وہ سوچ بچار کر کے اپنی مشکلات کا حل تلاش کرتے اور اسرار قدرت کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔
- قدیم تہذیب کے مرکزی شہروں میں بعض تو پانچ ہزار سال بلکہ اس سے بھی پہلے موجود تھے۔
- اہل بابل و نینوا، اشوری، یونانی، رومی اور ایرانی اپنی اپنی تہذیب کے لیے خاص طور پر مشہور ہیں۔

پرانے زمانے میں دجلہ و فرات کی وادی بہت سرسبز و شاداب تھی۔ اس وادی کے جنوبی حصے میں سمیری قوم آباد تھی۔ سمیریوں نے بڑے بڑے شہر آباد کیے۔ یہ لوگ زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت میں بڑے ماہر تھے۔ لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے۔ ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں بھی بکثرت تھیں۔ یہ لوگ تہذیب و تمدن میں مشہور اور نامور ہوئے ہیں۔ البتہ انہوں نے جو شہر بسائے ان کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہر شہر الگ تھا۔ ان کے دیوتا الگ تھے۔ تہوار الگ اور ہر شہر کا بڑا پروہت الگ۔ یہی بڑا پروہت شہر کا حاکم اور بادشاہ بھی تھا۔

بابل و نینوا

پرانے زمانے میں بابل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو دجلہ و فرات کی وادی میں واقع تھا اور آہستہ آہستہ ترقی کر کے ایک خوش حال اور بڑا شہر بن گیا۔

تقریباً چار ہزار برس قبل کی بات ہے کہ شام کے علاقے سے ایک قوم نے آکر بابل پر قبضہ کر لیا۔ پھر آس پاس کے علاقوں کو فتح کر کے وادی کے اوپر کے حصے اور نچلے حصے پر بھی قابض ہو گئے۔ اب یہ ساری بستی بابل کی سلطنت کہلانے لگی۔

اہل بابل نے مفتوحہ علاقوں کے لوگوں سے بہت کچھ سیکھا۔ انہوں نے مصریوں کے خیالات اور ایجادات سے بھی بڑا فائدہ اٹھایا۔

اہل بابل کی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے۔ انہوں نے لکھنے کا طریقہ سمیریوں سے سیکھ کر اس میں کچھ کانٹ چھانٹ کی۔ کاغذ کے بجائے وہ مٹی کی تختیوں پر لکھتے تھے۔ اہل بابل نے بہت سے قانون تو سمیریوں سے لیے اور کچھ قانون نئے بنائے۔

بابلیوں نے باقاعدہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ تجارت اور لین دین کے نئے طریقے نکالے۔

اہل بابل کا مشہور بادشاہ حمورابی تھا۔ اس نے سلطنت کو منظم کر کے ایک ضابطہ قانون تیار کیا۔ حمورابی کا دعویٰ تھا کہ یہ قانون اس پر انصاف کے دیوتا نے اتارا ہے۔ اس

نے ان قوانین کو ایک ستون پر کندہ کرا دیا تھا۔ اس مجموعہ قانون میں مختلف طبقات کے حقوق و فرائض کی وضاحت کی گئی ہے اور جرائم کے لیے سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔

اہل بابل نے فلکیات یعنی علم النجوم اور اجرام سماوی کا خوب مطالعہ کیا۔ وہ چاند اور سورج گرہن کا صحیح اندازہ لگا سکتے تھے۔ بابلیوں نے سال کو بارہ مہینوں میں منقسم کر کے ہر ایک مہینے کا الگ نام رکھا اور سات دن کا ہفتہ مقرر کیا۔

اشوری

بابلیوں کی آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے لوگ شمال کی طرف بڑھنا شروع ہوئے اور ایک نئے شہر کا وجود عمل میں آیا۔ اس نئے شہر کو انہوں نے اپنے دیوتا کے نام پر اشور کہنا شروع کیا۔ اشوری لوگ پہلے تو اہل بابل کے ماتحت رہے، لیکن جب انہوں نے حتی قوم سے لوہے کی ہتھیار بنانا سیکھ لیے تو بڑے طاقتور بن گئے اور ایک مستقل حکومت قائم کر کے نینوا کو صدر مقام بنا دیا۔ پھر آس پاس کے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ اشوری بڑے وحشی اور خون خوار لوگ تھے۔ ۷۲۲ قبل مسیح میں اشوروں نے اسرائیل کو فتح کر لیا اور بالآخر کلدانیوں اور ایرانیوں کو شکست دے کر نینوا پر قبضہ کر لیا۔

کنعانی یا فنیقی

تین ہزار برس پہلے کی بات ہے کہ بحیرۂ روم کے مشرقی کنارے پر شام کے ساحل کے ساتھ ساتھ کنعان یا فنیقہ آباد تھا۔ اس علاقے کے باشندے کنعانی یا فنیقی کہلاتے تھے۔ یہ لوگ مچھلیاں پکڑتے، جہاز اور کشتیاں چلاتے اور خوب تجارت کرتے تھے۔ فنیقی تاجر اپنا مال لے کر دور دور تک تجارت کے لیے جاتے اور وہاں کی تہذیب اپنے وطن میں لاتے تھے۔

فنیقیوں نے بہت سے ہنر دوسرے ملکوں سے سیکھے، لیکن رومیوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا خاص طور پر لکھنے کا طریقہ۔ فنیقیوں کا لکھنے کا طریقہ بابلیوں اور مصریوں سے آسان تھا۔ ان کے ہاں صرف بائیس حروف ابجد تھے۔ یونانیوں نے ان سے لکھنے کا

طریقہ سیکھ کر سارے یورپ کو سکھایا۔ فنیقیوں نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے جابجا بستیاں قائم کیں۔ ان میں قرطاجنہ (کارتھیج) نے بڑی شہرت پائی۔

عبرانی

عبرانی قوم کی ابتدا حضرت ابراہیمؑ سے ہوتی ہے۔ جو عراق کی سرزمین کو خیرباد کہہ کر کنعان یا فنیقہ میں جا آباد ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستی کے خلاف جہاد کیا اور توحید کی تبلیغ کی۔

بنی اسرائیل

حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔ حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ۔ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا۔ چنانچہ ان کی اولاد بنی اسرائیل مشہور ہوئی۔ جن کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ قحط کی وجہ سے اسرائیلی لوگ مصر میں جا بسے۔ جب فرعون کا ظلم حد سے بڑھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو بھیج کر بنی اسرائیل کو نجات دلائی۔ فرعون اور اس کے لشکر کو سمندر میں غرق کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ کے ذریعے بنی اسرائیل کو مقدس کتاب تورات ملی اور موسوی شریعت عطا ہوئی۔ اس شریعت کی بنیاد دس احکام پر ہے۔

بعد ازاں بنو اسرائیل نے کنعان فتح کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کی۔ ان میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے پیغمبر اور بادشاہ کی حیثیت سے بڑا نام پایا۔ حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس میں عالیشان محل بنائے اور ایک عظیم الشان عبادت گاہ تعمیر کی۔

یہودی

حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل کمزور ہو گئے، سلطنت تقسیم ہو گئی اور بیت المقدس کی حکومت کے حامی صرف یہود اور بن یمین کے قبیلے رہ گئے۔ یہی لوگ بعد میں یہودی کہلائے۔ یہودی مذہب میں بڑا غلو اور سختی کرنے لگے۔ ۵۸۶ قبل مسیح میں بابلیوں کے بادشاہ بخت نصر نے یہودیوں پر حملہ کر کے بہت سے یہودی تہ تیغ کیے اور بہت سے

قیدی بنا لیے۔ بعد میں رومیوں نے یہودیوں کو زیر نگیں بنا لیا، مگر جب یہود نے بغاوت کی تو رومی حکمرانوں نے بیت المقدس کو تباہ کر دیا اور یہود کا قتل عام کیا۔

قدیم یونانی قوم

یونان کا علاقہ بحیرۂ روم کے کنارے واقع ہے۔ قدیم زمانے میں یونان بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر ریاست خود مختار تھی۔ ان ریاستوں میں سپارٹا اور ایتھنز کی ریاستیں زیادہ مشہور تھیں۔ دونوں کے نظام حکومت اور قانون میں بڑا فرق تھا۔ یونانیوں کا طرز حکومت جمہوری تھا۔ سیاست میں انہوں نے فرد کے حقوق کو تسلیم کیا اور شہروں کو نظم و نسق میں شریک کیا۔

سپارٹا کے باشندے شمشیر و سناں کے دھنی تھے۔ ان کا نظام حکومت فوجی انداز کا تھا۔ وہ سخت کوش، جفاکش اور بہادر تھے۔ ان کی گھریلو زندگی بھی اسی قسم کی تھی۔ اس کے مقابل ایتھنز کے لوگ جمہوریت پسند تھے۔ ان کے ہاں تعلیم و تربیت کے لیے اعلیٰ سکول موجود تھے۔ وہ جسمانی صحت اور طاقت کے ساتھ ساتھ قوم کی دماغی اور ذہنی نشوونما کا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔ ورزش بھی کرتے اور علوم و فنون میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔

یونانیوں نے علم و ادب میں بڑی شہرت حاصل کی، بالخصوص فنون لطیفہ اور فن تعمیر، فلسفہ و طب، ریاضی و علم ہیئت، ادب، تاریخ نگاری اور ڈراما نویسی میں بڑا نام پیدا کیا۔ رزمیہ اور عشقیہ شاعری میں بڑی ترقی کی۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے مشہور فلسفی، بقراط اور جالینوس جیسے نامور طبیب سر زمین یونان میں پیدا ہوئے۔ ارشمیدس مشہور ریاضی دان اور علم ہیئت کا ماہر تھا۔ اقلیدس نے علم ہندسہ میں نام پایا۔ مسلمانوں نے یونانی علوم و فنون کو عربی زبان میں ترجمہ کر کے اپنے دامن کو علم و حکمت سے بھر لینے کے علاوہ قدیم یونانی علوم کو ہمیشہ کے لیے محفوظ بھی کر دیا۔

یونانی فاتح سکندر اعظم نے متمدن دنیا کے ایک بڑے حصے کو فتح کیا۔ سکندر اعظم کے بعد یونانی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔

قدیم رومی قوم

ہزاروں سال ہوئے کہ رومی لوگ اٹلی پر قبضہ کر کے وہاں آباد ہو گئے اور مختلف مقامات پر بستیاں بنالیں۔ ان میں سے ایک قبیلہ لاطینی کے نام سے مشہور تھا۔ اس قبیلے نے دریائے ٹائبر کے کنارے روم یا رومہ کے نام سے ایک شہر آباد کیا اور اسی شہر سے وہ رومی مشہور ہوئے۔

رومی بڑے تنومند' محنتی اور جفاکش تھے۔ وہ اعلیٰ درجے کے سپاہی اور سیاست دان ثابت ہوئے۔ انہوں نے اپنی جنگی مہارت کی وجہ سے آس پاس کے علاقوں کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ متمدن دنیا کے مغربی حصے ان کے زیر نگیں تھے۔ رومی حکمران طاقتور بھی تھے اور اچھے حاکم بھی۔ رومیوں نے عدل و انصاف کے بعض بنیادی اصول وضع کیے۔ ان کا یہ مجموعہ قانون عام طور پر قابل قبول سمجھا گیا۔ ابتدا میں رومی حکومت میں جمہوری اور شورائی نظام کارفرما تھا۔ ایک مجلس شوریٰ تھی جس میں سب شہروں کے نمائندے شامل ہوتے تھے' لیکن آخر کار شہنشاہیت غالب آ گئی۔ ان کا پہلا شہنشاہ آگسٹس تھا۔ رومی بادشاہوں کا عام لقب قیصر تھا۔

عیسائیت کا ظہور

آگسٹس کے عہد حکومت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور اس وقت فلسطین رومیوں کے ماتحت تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کی اصلاح کے لیے ان تھک کوششیں کیں' لیکن یہودیوں نے ان کی ایک بات بھی نہ مانی۔ الٹا ان کے دشمن ہو گئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنا عہد جوانی ناصرہ شہر میں گزارا تھا اس لیے انہیں مسیح ناصری کہتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کا دین پھیلنے لگا اور آہستہ آہستہ اٹلی جا پہنچا اور شاہ قسطنطین (قیصر روم) نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ پھر رومی حکومت کی بدولت عیسائیت کو بڑی قوت اور عظمت حاصل ہو گئی اور عیسائیت بہت سے ملکوں میں پھیل گئی۔

بزنطی حکومت

شاہ قسطنطین نے ۳۳۰ء میں رومہ کو چھوڑ کر شہر بزنطین کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس وقت سے بادشاہ کے نام پر اس کا شہر قسطنطینیہ مشہور ہو گیا اور قسطنطنیہ کے قدیم نام بزنطین کی وجہ سے مشرقی سلطنت کو بزنطینی سلطنت کہتے ہیں۔ چوتھی صدی کے آخر تک مسیحیت رومی سلطنت میں پھیل چکی تھی۔ مذہب کو بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ادب، شاعری اور فنون لطیفہ مذہب کے تابع تھے۔ رومی یہ بھی مانتے تھے کہ ان کے بادشاہوں کو حکمرانی کا منصب خدا تعالیٰ نے عطا کیا تاکہ وہ عوام کو فائدہ پہنچائیں۔ رومیوں پر یونانی اثر غالب تھا۔ رومی تجارت کرتے تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے شہر بسائے۔ عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ کھیل تماشے اور رتھوں کی دوڑ کے علاوہ وہ کتابیں پڑھنے کا بھی شوق رکھتے تھے۔

بزنطینی حکومت تقریباً ایک ہزار برس قائم رہی۔ رومی سلطنت کی عظمت و شوکت شاہ جسٹنٹین پر ختم ہو گئی۔ اس وقت ان کی سرکاری زبان لاطینی تھی اور ان کا مجموعہ قوانین بھی لاطینی زبان میں مرتب ہوا تھا۔ بزنطینی حکومت پندرہویں صدی عیسوی کے وسط تک قائم رہی۔ عہد نبویؐ میں مصر، فلسطین اور شام کے علاقے بزنطینی سلطنت کے ماتحت تھے۔ خلافت راشدہ میں شام، فلسطین اور مصر مسلمانوں نے فتح کر لیے۔ عثمانی سلطنت کے مشہور حکمران سلطان محمد فاتح نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطینیہ پر حملہ کر کے فتح کر لیا۔ اس وقت سے آج تک یہ شہر ترکوں کے قبضے میں چلا آتا ہے۔ اس کو آجکل استانبول کہتے ہیں۔

ساسانی سلطنت

ایران ایک ہزاروں سال پرانا ملک ہے۔ یہاں کئی خاندانوں نے حکومت کی۔ ایران میں بڑے نامور بادشاہ ہو گزرے ہیں۔ جن میں سائرس، دارا اور نوشیرواں عادل خاص طور پر مشہور ہیں۔ بالآخر ۲۲۶ء میں اردشیر اول نے ساسانی سلطنت قائم کی۔

ساسانیوں اور رومیوں کے درمیان چار سو برس تک لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر کار مسلمانوں نے ۶۵۱ء میں ایران کو فتح کر لیا۔ خسرو دوم کے عہد میں ساسانی سلطنت نے بڑا عروج حاصل کیا۔ نوشیرواں عادل اسی خاندان کا ایک مشہور اور دانشمند بادشاہ گزرا ہے۔ جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو ایران پر نوشیروان عادل حکمران تھا۔

ساسانیوں نے ملکی انتظام کے لیے عمدہ اور اعلیٰ قسم کے اصول بنائے تھے۔ اس عہد میں ایران تہذیب و تمدن میں دنیا کے اکثر ممالک سے آگے تھا۔ ساسانی خاندان کے بادشاہ کسریٰ کہلاتے تھے۔ وہ مطلق العنان فرمان روا تھے ان کو شکار اور عمارتوں کا بڑا شوق تھا۔ ایرانی لوگوں کو مصوری، بت تراشی، اور نفیس کپڑا بننے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ نقش و نگار کے لیے بھی ایرانی مشہور تھے۔

زرتشتی

ایران کے قدیم لوگ زرتشت کے پیرو تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام سے چھ سات سو برس پیشتر تھا۔ زرتشت کے نزدیک دنیا میں نیکی اور بدی کے درمیان ہمیشہ جنگ جاری رہتی ہے۔ نیکی کا دیوتا یزدان ہے اور بدی کا اھرمن۔ اس نے لوگوں کو نیکی کی دعوت دی۔ زرتشت کے پیرو زرتشتی کہلاتے ہیں وہ آگ کو مقدس مانتے ہیں اور ان کے عبادت خانوں میں آگ روشن رکھی جاتی ہے۔ اسی لیے ان کے معبد کو **آتشکدہ** کہتے ہیں۔ زرتشتیوں کو عرب مجوس اور عام لوگ انہیں آتش پرست کہتے ہیں۔ پاکستان میں وہ پارسی کہلاتے ہیں۔

اردشیر اول نے زرتشتی مذہب کو سلطنت کا مذہب قرار دے کر بڑا رواج دیا۔ اس کے عہد میں موبد، یعنی مذہبی پیشوا، مذہبی اور سیاسی معاملات میں بڑا عمل دخل رکھتے تھے۔ جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کر لیا تو یہ مذہب آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ البتہ بعض زرتشتی برصغیر پاک و ہند میں چلے آئے اور پارس (فارس) یعنی ایران سے آنے کی وجہ سے پارسی کہلائے۔

یہ مختصر سا تعارف ہے ان تہذیبوں کا جو اسلام سے پہلے دنیا میں موجود تھیں اور جن کی اکثریت سے اسلام کو سابقہ پڑا۔ اور بالآخر اسلام ان سب پر غالب آگیا۔

○○○

عہدِ عباسی کی ثقافت، معاشرتی و اقتصادی حالات

معاشرت

عباسی عہد حکومت میں اسلامی معاشرت میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عباسی خلفا نے ملکی اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر عربوں کو پیچھے ہٹا کر ایرانیوں اور ترکوں کو آگے بڑھایا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی اقتدار کے ساتھ ایرانی اور پھر ترکی تہذیب و تمدن بھی معاشرے نے اپنانے شروع کیں۔ ایک اثر یہ پڑا کہ شاہی محلات اور خلفا کے حرم میں عربی عورتوں کی جگہ عجمی بیگمات نے لے لی۔ عربی معاشرت کی جگہ ایرانی معاشرت نے رواج پایا۔ لباس، وضع قطع، رہن سہن سب پر ایرانی اثرات پڑے۔

عورتوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی گئی۔ قرآن و حدیث اور فقہ، شعر و شاعری اور موسیقی میں بعض عورتوں نے بڑا نام پایا۔ عورتیں ملکی معاملات میں بھی حصہ لیتی تھیں اور لڑائیوں میں بھی شریک ہوتی تھیں۔

گھروں کی آرائش و زیبائش اور کھانے پینے کے معاملات میں بھی عباسی عہد میں بڑی ترقی ہوئی۔ ایرانیوں اور ترکوں کی بہت سی رسوم بھی معاشرے میں رواج پا گئیں۔ شہروں کی توسیع و ترقی، صنعت و حرفت کی ترقی اور تجارت کی گرم بازاری سے معاشرے کو فراغت اور خوشحالی نصیب ہوئی۔

باغات اور سیرگاہیں بکثرت تعمیر کی گئیں۔ سبزہ و شادابی کی فراوانی نے فارغ البال عوام کو پر کیف مناظر سے لطف اندوز کر کے انہیں خوشی و مسرت سے مالا مال کر دیا۔

اقتصادی حالت

عباسی عہد حکومت میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت بڑی تسلی بخش تھی۔ زراعت' تجارت اور صنعت و حرفت کی بدولت ملک نے بڑی ترقی کی۔ عراق زراعت کا بڑا مرکز تھا۔ دجلہ و فرات سے بہت سی نہریں نکال کر آب پاشی کا انتظام کیا گیا۔ ملک میں گیہوں' چاول' جو' گنا اور ہر قسم کے پھل بکثرت پیدا ہوتے تھے۔ مالیہ کے تعیّن و تقرر میں رعایا کو بڑی سہولت دی جاتی تھی۔ شہروں کی دیکھ بھال کے لیے ایک الگ محکمہ قائم کیا گیا تھا۔ خراسان کا علاقہ بھی زرعی پیداوار کے لیے مشہور تھا۔ ترکستان میں بخارا اور سمرقند کے علاقوں میں پھل بکثرت پیدا ہوتے تھے۔ مصر میں وادی نیل بھی اپنی زرخیزی اور غلہ جات کی پیداوار کے لیے بڑی مشہور تھی۔ حکومت کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ زمینوں کا مالیہ تھا۔

صنعت و حرفت نے بھی بڑا فروغ پایا۔ کان کنی کے پیشہ نے بڑی ترقی کی۔ خراسان سے لوہا نکلتا تھا۔ کرمان سے چاندی اور سیسہ' تبریز سے سنگ مرمر اور ایران سے نمک۔ کئی شہروں میں شیشہ اور صابون کے کارخانے قائم ہوئے۔ کاغذ بنانے کے کارخانے بھی کھولے گئے۔ فارس اور اھواز میں گنے کی کثرت کی وجہ سے چینی اور شکر سازی کے کارخانے تھے۔ اونی' ریشمی اور سوتی کپڑوں اور قالینوں کے کارخانے بھی ملک کے مختلف حصوں میں بکثرت موجود تھے۔

عباسی عہد میں تجارت کو بھی بڑا عروج حاصل ہوا۔ ملک کے مختلف حصوں سے چاول' گندم' چینی' پھل' دھات کی چیزیں' شیشہ اور اونی و ریشمی کپڑے اور دیگر بہت سی اشیاء دوسرے ملکوں میں بھیجی جاتی تھیں۔ تجارت کی منڈیاں عام تھیں۔ بری اور بحری راستوں سے تجارت کا مال آتا جاتا تھا۔ بڑے بڑے تجارتی مرکزوں میں تاجروں نے اپنی اپنی مجالس اور انجمنیں قائم کر رکھی تھیں تاکہ تجارت کو ترقی دی جائے اور جعل سازی کی روک تھام کی جائے۔ تجارتی منڈیوں اور بازاروں میں بڑی رونق ہوتی تھی۔ دوکانوں پر خرید و فروخت کی وجہ سے بڑی چہل پہل رہتی اور تجارت کی وجہ سے روپے پیسے کی بڑی ریل پیل نظر آتی تھی۔

تصنیف کتب

اس عہد میں مختلف طبی علوم پر قیمتی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ شیخ بو علی سینا نے طب کے ساتھ فلسفہ، ہندسہ، ہیئت اور دیگر فنون میں اپنا نام بڑا روشن کیا۔ ادھر فلسفہ و حکمت میں سقراط، افلاطون اور ارسطو ایسے نامور یونانی فلسفیوں کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کیا گیا اور ادھر ہمارے ہاں کندی، ابن سینا، فارابی، غزالی اور رازی ایسے نامور حکما اور دانشوروں نے حکمت و فلسفہ پر کتابوں کے انبار لگا دیئے۔

عباسی عہد میں علم جغرافیہ نے بھی خاصی ترقی کی۔ زمین شکل و صورت اور پیائش وغیرہ کا حساب لگایا گیا۔ "یاقوت الحموی" نے جغرافیہ کا ایک شاندار انسائیکلوپیڈیا (دائرہ معارف) تیار کر دیا اور اس کا نام "معجم البلدان" رکھا۔ نامور جغرافیہ دانوں میں ابن حوقل، اصطخری، ادریسی اور مسعودی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس عہد میں مسلمانوں نے علم ہیئت اور ریاضی میں بھی بڑی قابلیت اور شہرت حاصل کی۔ ہیئت دانوں میں خوارزمی، ابراہیم الفزاری ابو معشر فلکی، موسیٰ بن شاکر بیرونی اور عمر خیام کے اسما خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ریاضی میں مثلث کے علم کو بالخصوص ترقی ہوئی اور ابو الفداء، عمر خیام وغیرہ نے بڑا نام پایا۔ جبرو مقابلہ اور ہندسہ میں بھی مسلمانوں نے گہرے نقوش چھوڑے۔

علم الکیمیا والطبیعیات، علم النبات اور علم الفلاحۃ و الزارعۃ میں بھی بڑا کمال حاصل کیا گیا اور قابل قدر تصانیف وجود میں آئیں۔ تاریخ نویسی میں امام ابن جریر، طبری، مسعودی، ابن مسکویہ، خطیب بغدادی، ابن عساکر الدمشقی، امام ذہبی اور ابن اثیر کے نام شہرہ آفاق ہیں۔ سیرت نگاری میں ابن سعد، ابو نعیم اصفہانی، ابو الفرج اصفہانی، ابن الجوزی، ابن ہشام، ابن خلکان وغیرہ نے بڑی شہرت حاصل کی۔

شعر و شاعری اور ادبیات میں بھی بڑی سرگرمی اور دلچسپی کا اظہار کیا گیا اور کثیر التعداد شعرا اور نثر نگاروں نے عربی ادب کے دامن کو اپنے جواہر پاروں سے مالا مال کر دیا۔ الف لیلہ کی کہانیاں بھی عباسی عہد کی یادگار ہیں۔ شاعروں میں ابو نواس، ابو العتاہیۃ، بشار

ابو تمام، متنبی اور ابو العلاء المعری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

فنون لطیفہ

عباسی عہد میں فنون لطیفہ نے بھی بڑی ترقی کی۔ فن تعمیر، مصری نقاشی، خطاطی اور موسیقی نے بڑا فروغ پایا۔ شاہی محلات، مساجد، محلات اور شاندار عمارات تعمیر ہوئیں، فن کاروں نے مصری نقاشی اور خطاطی کے بہترین نمونے پیش کیے۔

کتاب خانے

عباسی عہد کی ثقافت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خلفا اور امرا کو کتاب خانے قائم کرنے کا بڑا شوق تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید اور خلیفہ مامون کی علم دوستی اود معارف پروری بڑی مشہور ہے۔ علما و فضلا ان کے ہمرکاب رہتے تھے۔ پہلا کتاب خانہ خلیفہ ہارون الرشید نے قائم کیا جو بیت الحکمت کے ساتھ وابستہ تھا۔ پھر خلیفہ مامون نے علما کی ایک جماعت کو اطراف عالم میں بھیج کر علم و حکمت کی بے شمار کتابیں جمع کیں۔ بعدازاں تمام امراء و سلاطین نے کتابوں کو فراہم کرنا اپنا معمول قرار دے دیا، چنانچہ بغداد، دمشق، قاہرہ، بصرہ، کوفہ، مرو اور خوارزم وغیرہ شہروں میں بڑے عظیم الشان کتاب خانے قائم ہو گئے۔ اس طرح مساجد کے ساتھ بھی کتاب خانوں کا قیام عمل میں آیا۔ فیاض اور دیندار حضرات مسجدوں کے لیے اپنی ذاتی کتابیں وقف کر دیا کرتے تھے۔

مدرسے

عباسی عہد میں بچوں اور جوانوں، مردوں اور عورتوں کی تعلیم کے لیے ایک "تدریسی نظام" وجود میں آیا۔ اس نظام میں مکتب، مدرسہ اور دارالعلوم کو عوامی تعلیم کے لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ مکہ، مدینہ، بصرہ، کوفہ، بغداد، دمشق اور مصر وغیرہ میں یہ نظام خوب ترقی پذیر ہوا۔ اسی طرح مرو، نیشاپور، موصل، اصفہان، ہرات اور بلخ وغیرہ شہروں میں بھی مدرسے کامیاب رہے۔ ہر مدرسے میں عالم و فاضل اساتذہ درس و تدریس کا کام کرتے تھے۔ ہر مدرسے کے ساتھ ایک کتاب خانہ بھی ہوتا تھا۔

اُندلس میں اسلامی حکومت

جزیرۂ عرب کے شمال مغرب اور یورپ کے جنوب میں ہسپانیہ اور پرتگال کا علاقہ ہے۔ جو بحیرۂ روم کے کنارے ایک لمبا چوڑا جزیرہ نما ہے۔ یورپ اس ملک کو سپین کہتا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں اس علاقے میں قبائل فندال فروکش ہوئے۔ ہسپانوی لوگوں نے ان قبائل کی نسبت سے اس علاقے کو فندلس کہنا شروع کیا۔ عربوں نے فندلس کو اندلس میں تبدیل کر دیا۔ تب سے یہ ملک عربوں کی تاریخ اور جغرافیہ میں اندلس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

فتح اندلس

موسیٰ بن نصیر کے ایک سپہ سالار طارق بن زیاد نے ۹۲ھ / ۷۱۰ء میں اندلس میں اسلامی پرچم لہرایا۔ اس زمانے میں ہسپانیہ پر شاہ راڈرک کی حکومت تھی جو کہ قوطی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ ہسپانیہ کے اکابر سلطنت بادشاہ سے بڑے دل برداشتہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس کے جور و ظلم اور استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لیے افریقہ اور مراکش کے مسلمان حکمران اور فاتح موسیٰ بن نصیر سے مدد طلب کی۔ موسیٰ بن نصیر نے اپنے سپہ سالار طارق کو بھیج کر ملک کو فتح کر لیا۔ موسیٰ نے خود پیش قدمی کر کے ہسپانیہ کے دارالسلطنت طلیطلہ پر قبضہ کر لیا۔ اس اثنا میں خلیفہ ولید کی طرف سے موسیٰ کو شام پہنچنے کا حکم ملا۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کو اپنا قائم مقام مقرر کیا اور خود شام کو روانہ ہوا۔

مسلمانوں سے پہلے اہل ہسپانیہ پر حکومت کی طرف سے ہر قسم کا ظلم وجور اور سختی روا رکھی جاتی۔ مسلمانوں نے اپنی رعایا سے بڑا اچھا سلوک کیا۔ ملک میں عدل و انصاف قائم کیا۔ زندگی کے ہر شعبے میں نظم و نسق پیدا کر کے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا۔

اندلس کے امیر

اندلس کی حکومت کا نظم و نسق چلانے کے لیے خلیفہ اپنا امیر مقرر کیا کرتا تھا اور بعض اوقات اس امیر کا تقرر والی قیروان بھی کر دیتا تھا۔ پہلے تو امیر اندلس اشبیلیہ میں رہا کرتا تھا۔ بعد میں اس نے قرطبہ کو دارالحکومت مقرر کر کے وہیں رہائش اختیار کی۔ جب بدقسمتی سے مضری اور یمنی گروہوں میں ان بن ہو گئی تو ہر ایک فریق کی یہ خواہش تھی کہ ان کا آدمی امیر ہونا چاہیے۔ آخر کار فریقین اس بات پر رضامند ہو گئے کہ ہر سال باری باری فریقین میں سے امیر مقرر ہوا کرے۔ ۱۲۸ھ / ۷۵۶ء میں مضری قبائل کا نمائندہ یوسف بن عبدالرحمٰن فہری امیر اندلس تھا۔ یہ امیر ایک سال کی مقررہ مدت کے بعد اپنے وعدے سے پھر گیا اور حکومت سے دست بردار ہونے سے منکر ہو گیا۔ یمنی قبائل نے احتجاج کیا لیکن یہ بدستور حکمرانی پر مصر رہا' یہاں تک کہ ۱۲۸ھ میں ایک اور امیدوار حکومت کے میدان میں اتر آیا اور اس نے سارے ملک پر قبضہ کر کے اندلس کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کیا' یہ عبدالرحمٰن الداخل تھا۔

عبدالرحمٰن الداخل

یہ اموی شہزادہ معاویہ بن ہشام بن عبدالملک کا بیٹا تھا' جو اموی خاندان کے زوال کے بعد عباسی خلیفہ سفاح کے قتل و خون ریزی سے بچ کر بھاگ نکلا تھا اور وفادار خادم بدر کو ساتھ لیے صحرا نوردی کرتے کرتے افریقہ میں جا پہنچا۔ عبدالرحمٰن بڑا نڈر' دلیر اور عالی ہمت جوان تھا۔ اس وقت اس کی عمر اٹھائیس برس تھی۔ اس نے اندلس کی حکومت کو مطمح نظر ٹھہرایا۔ اندلس میں یمنی اور مضری اختلافات کی وجہ سے بڑا انتشار رونما ہو چکا تھا۔ عبدالرحمٰن نے اس خانہ جنگی' سیاسی اضطراب اور بدنظمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے خادم بدر کو اندلس روانہ کیا۔ اس وقت یمنی گروہ مضری قبائل سے برسرپیکار تھا۔ بدر نے یمنی گروہ کو بآسانی ساتھ ملا لیا۔ جب امیر عبدالرحمٰن کو یمنی حلیفوں کی امداد و اعانت کا یقین ہو گیا تو وہ بربری قبائل کے ساتھ اندلس پر حملہ کر کے ۱۲۸ھ میں ملک کے بڑے حصے

پر قابض ہو گیا۔ قرطبہ کو دارالحکومت بنایا اور خود اندلس کا امیر اکبر کہلایا۔

بنو امیہ کے خلفا کی نسل سے وہ پہلا امیر تھا جو اندلس کی سرزمین میں داخل ہوا۔ اس لیے الداخل مشہور ہوا۔ اس کی عزیمت، استقلال، ہمت، جوانمردی اور بلند حوصلہ کی وجہ سے عباسی خلیفہ منصور، عبدالرحمٰن کو "صقر قریش" یعنی قریش کا "شکرا" (باز) کہا کرتا تھا۔ امیر عبدالرحمٰن کی عزیمت و شجاعت کی روشن دلیل یہ ہے کہ اس نے یکہ و تنہا ایک ملک پر قبضہ کر کے ایک سلطنت کی بنیاد رکھی پھر یہ سلطنت پونے تین سو سال تک اس کے خاندان میں رہی۔

دشمن شکست کھانے کے بعد انتقامی جوش میں فرانس کے بادشاہ شارلیمان کے پاس پہنچے اور اسے ساتھ لے کر اندلس پر حملہ کر دیا، لیکن امیر عبدالرحمٰن نے شارلیمان کی اس مہم کو پسپا کر کے دشمنوں کے ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔

امیر عبدالرحمٰن الداخل ایک طرف تو تلوار کا دھنی تھا اور دوسری طرف بڑا مدبر، منتظم، دور اندیش، بلند ہمت، تیز فہم، بیدار مغز، عالی حوصلہ، عالم و فاضل اور باکمال و فیاض حکمران تھا۔ علم و فن کا بڑا قدر دان تھا۔ شعر و ادب کا ذوق سلیم رکھتا تھا۔ اس کے عہد حکومت میں ملک نے بڑی ترقی کی۔ قرطبہ اور دوسرے بڑے شہروں میں مسجدیں، پل، حمام اور قلعے تعمیر ہوئے۔ قرطبہ کی شاندار جامع مسجد اسی عالی ہمت حکمران کی یادگار ہے۔ اس مسجد کی تکمیل اس کے بیٹے ہشام اول نے کی تھی۔ عبدالرحمٰن اول کے عہد حکومت میں اندلس نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی اور علوم و معارف کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

اس کے زمانے میں کچھ عرصے تک تو عباسی خلفا کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا، لیکن ۱۴۶ھ میں امیر عبدالرحمٰن الداخل نے خطبہ سے عباسی خلیفہ کا نام نکال دیا اور ۳۳ سالہ حکومت کے بعد ۱۷۲ھ / ۷۸۸ء میں وفات پائی۔

امیر عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد اس کی وصیّت کے مطابق اس کا بیٹا ہشام اول حکمران بنا۔ اس نے ۷۸۸ء سے ۷۹۶ء تک حکومت کی۔ ہشام اول بڑا دیندار، نیک اور صالح حکمران تھا۔ اس نے قرطبہ کی جامع مسجد کی تکمیل کی۔ شارلیمان کے حملہ کو پسپا کیا اور

ملک میں کتاب و سنت کو رواج دیا۔

ہشام کی وفات کے بعد اس کا بیٹا حکم اول تخت نشین ہوا۔ حکم اول بڑا بیدار مغز حکمران تھا۔ امور سلطنت میں بڑی دلچسپی لیتا۔ اس نے رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے جاسوس مقرر کیے۔ وہ جاہ و حشم کا شوقین تھا۔ اس نے گھوڑوں اور غلاموں کو بکثرت جمع کیا۔ لشکر اور فوج کو منظم کر کے بہت سا اسلحہ اور سامان جنگ فراہم کر لیا۔ اس نے ۲۷ برس حکومت کرنے کے بعد اندلس میں اپنے خاندان کی حکمرانی کے لیے زمین بالکل ہموار کر دی۔ حکم اول نے ۸۲۲ء میں وفات پائی۔

حکم اول کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبدالرحمٰن (ثانی) مسند حکومت پر رونق افروز ہوا۔ وہ علوم و فنون کا قدر دان تھا۔ اس نے بیرونی حملہ آوروں کو پسپا کر کے ملک کو فارغ البالی اور خوشحالی کی زندگی بخشی۔ جامع قرطبہ کی توسیع شروع کی۔ عبدالرحمٰن ثانی کے عہد میں سلطنت کے شان و شکوہ میں بڑا اضافہ ہوا اور تہذیب و تمدن کی نئی راہیں کھل گئیں۔ اس نے ۳۱ برس کی حکومت کے بعد ۸۵۲ء میں وفات پائی۔

عبدالرحمٰن ثانی کے بعد اس کا بیٹا محمد تخت نشین ہوا۔ امیر محمد نے تقریباً ۳۷ برس حکومت کی، لیکن سارا وقت شورشوں اور فتنوں کو ختم کرنے میں صرف ہو گیا۔ اس نے باغیوں کو کچل کر از سر نو طلیطلہ، برشلونہ، اشبیلیہ، سرقسطہ اور قرطاجنہ کو فتح کیا اور بحری بیڑا تیار کیا۔ اس نے ۸۸۶ء میں وفات پائی۔

امیر محمد کے بعد اس کے دو بیٹے منذر (۸۸۶۔۸۸۸ء) اور عبداللہ (۸۸۸۔۹۱۲ء) یکے بعد دیگرے حکمران بنے۔ ان کے عہد حکومت بھی شورشوں اور فتنوں کی نذر ہو گئے۔ عمرو بن حفصون کی بغاوت نے زیادہ خطرناک صورت اختیار کر لی، لیکن آخر کار شاہی افواج اسے کچلنے میں کامیاب ہو گئیں۔ امیر عبداللہ نے ۹۱۲ء میں وفات پائی۔

عبدالرحمٰن الناصر (۳۰۰۔۳۵۰ھ / ۹۱۲۔۹۶۱ء)۔

۳۰۰ھ/۹۱۲ء میں امیر عبدالرحمٰن الناصر (ثالث) قرطبہ کے تخت حکومت پر بیٹھا۔ اس وقت سارا اندلس فتنہ و فساد کی نذر ہو چکا تھا۔ امیر عبدالرحمٰن اگرچہ اکیس بائیس

برس کا نوجوان تھا' لیکن عزم و استقلال اور ہمت و جرأت میں نظیر نہ رکھتا تھا۔ اس نے بڑی بہادری اور شجاعت سے تمام داخلی فتنوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ فساد اور بدامنی کو مٹا کر ملک میں امن و امان قائم کر دیا۔ اس کی مستعدی اور ہمت دیکھئے کہ ایک طرف بربروں کی بغاوت کو فرو کیا' دوسری طرف عمرو بن حفصون کے حامیوں اور ساتھیوں کا سر کچل کر رکھ دیا۔ ملک کا کھویا ہوا وقار از سر نو بحال کیا۔ حکومت کا نظم و نسق قائم کر کے رعایا کو امن و آسودگی بخشی۔ شاہراہوں پر پولیس کی چوکیاں قائم کیں۔ تمدنی اور معاشی ترقی کی طرف خاص توجہ دی۔ آب پاشی کا تسلی بخش انتظام کر کے زراعت کو بڑی ترقی دی پھلوں کی پیداوار میں اضافہ کیا۔ تجارت' صنعت و حرفت اور علوم و فنون نے بڑا فروغ حاصل کیا۔ بیرونی ممالک میں بھی اس کی حکومت کا وقار بڑھ گیا اور مختلف ملکوں کے سفیر اور نمائندے آنے جانے لگے۔ اس کا انتقال ۳۵۰ھ / ۹۶۱ء میں ہوا۔

الحکم الثانی: المستنصر باللہ (۳۵۰ھ / ۹۶۱ء تا ۳۶۶ھ / ۹۷۶ء)

اندلس کے عظیم المرتبت حکمرانوں میں سے تھا۔ اس کا عہد حکومت سب سے زیادہ پر امن اور خوشحال تھا۔ اس کے زمانے میں قرطبہ ایک علمی مرکز کی حیثیت سے بہت مشہور ہوا۔ اس کے دور حکومت میں ولندیزیوں نے ۳۶۰ھ / ۹۷۱ء میں حملہ کیا' مگر منہ کی کھائی۔

وہ بڑا علم پرور اور علما کا قدر دان تھا۔ وہ علما کو کتابیں لکھنے کی ترغیب دیتا تھا۔ اس نے دوسرے ملکوں سے کثیر تعداد میں کتابیں خرید کر اپنے کتاب خانے میں جمع کر رکھی تھیں' اس نے بہت سے نمائندے مقرر کر رکھے تھے جو نایاب اور کار آمد کتابیں خلیفہ کے لیے فراہم کرتے رہتے تھے۔ اس نے قرطبہ کے اپنے محل میں ایک دارالکتب قائم کیا۔ جس میں چھ لاکھ کتابیں جمع کیں۔ ان کتابوں کے نام چوالیس جلدوں پر مشتمل فہرست میں درج تھے۔ اس طرح خلیفہ حکم مشرقی ممالک میں وفود بھیج کر کتابوں کی نقلیں حاصل کیا کرتا تھا۔ صرف ایک کتاب "الاغانی" مؤلف ابو الفرج اصفہانی ایک ہزار دینار (سونے کا سکہ) کے عوض حاصل کی تھی۔ خلیفہ نے کتابوں کی جلد سازی کے لیے بڑے ماہر کاتب اور جلد

ساز بھی جمع کر رکھے تھے۔

خلیفہ علوم و فنون کی ترقی میں مصروف تھا' لیکن بعض خود غرض سرداروں اور عہدے داروں نے اقتدار حاصل کر کے سلطنت پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی۔

ہشام بن حکم

خلیفہ حکم نے ۹۷۶ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا نابالغ بیٹا ہشام بارہ برس کی عمر میں تخت حکومت پر بیٹھا' لیکن سارے اختیارات اس کی ماں کے ہاتھ میں تھے۔ حکومت کا سارا نظم و نسق محل کے داروغہ محمد بن ابی عامر المنصور کے سپرد تھا۔ ابن ابی عامر نے آہستہ آہستہ حاجب اور وزیر کے عہدے سنبھال لیے۔ ہشام صرف نام کا خلیفہ تھا۔ کاروبار سلطنت ابن ابی عامر کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ سکّے پر بھی خلیفہ ہشام کے نام کے ساتھ ابن ابی عامر کا نام درج ہونے لگا۔ خطبہ میں بھی اس کا نام لیا جاتا تھا۔

ابن ابی عامر نے فوج کو از سر نو منظم کر کے عیسائی سرداروں کو پے در پے شکستیں دیں۔ فرانس کے اقتدار کو آس پاس کے جزیروں سے ختم کر دیا اور افریقہ پر چڑھائی کر کے بہت سا حصہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس نے اپنے لیے ایک شہر بسایا اور اس کا نام الزاہرہ رکھا اور لقب منصور مشہور ہوا۔

ابن ابی عامر کی وفات کے بعد اس کے بیٹے مظفر اور پھر عبدالرحمٰن سلطنت کا کاروبار چلاتے رہے' لیکن اندلس میں اموی خلافت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ ہر طرف فتنۂ و فساد اور بد نظمی و انتشار نے سر اٹھایا۔ بربر' عرب اور اندلسی مسلمان جنگ اقتدار کی نذر ہو گئے۔ ہر طرف فساد اور قتل و غارت گری شروع ہو گئی اور مسلمانوں کی شان و شوکت کا جنازہ مسلمانوں نے اپنے ہاتھ سے نکال دیا۔ بنو عباد اشبیلیہ اور مغربی اندلس کے حاکم بن گئے۔ بنو ذی النون طلیطلہ میں خود مختار ہو گئے۔ بنو نصر نے غرناطہ کی حکومت سنبھال لی۔ اس کے علاوہ اور کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔

قرطبہ کی شان و شوکت

اموی امرا اور خلفا بالخصوص عبدالرحمٰن الداخل، عبدالرحمٰن الناصر (ثالث) اور حکم ثانی نے قرطبہ کی شان و شوکت میں بڑا اضافہ کیا۔ بڑے بڑے محلات، شاندار عمارتیں، خوبصورت اور وسیع مسجدیں، سرسبز و شاداب باغات اور نہایت نفیس حمام تعمیر کیے گئے۔ شہر کی شادابی اور رونق کے لیے پانی کی فراوانی کا انتظام کیا گیا۔ شہر کے اکثر حصوں میں فوارے قرطبہ کے حسن و جمال میں اضافہ کرتے تھے۔ صاف ستھرا شہر، پختہ بازار اور گلی کوچے۔ بازاروں اور منڈیوں میں تجارت کی وجہ سے ہر وقت ریل پیل رہتی تھی۔ صنعت و حرفت نے شہر کی رونق میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ قرطبہ میں ہر قسم کی سہولت میسر تھی۔ ہزار ہا دکانیں سیکڑوں مساجد اور حمام شہر کی رونق کو دوبالا کرتے تھے۔ شہر میں روشنی کا معقول انتظام تھا۔ دس بارہ میل تک چراغوں کی قطار رات کو دن بنا دیتی تھی۔ خلیفہ کا محل صنعت و کاریگری کے لحاظ سے عجائبات کا نمونہ تھا۔ قرطبہ کی جامع مسجد بھی حسن و جمال اور تزئین و آرائش میں قابل دید تھی۔ اس مسجد کو عبدالرحمٰن اول نے شروع کیا اور بعد کے خلفا اس کی تکمیل و توسیع اور تزئین و آرائش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ بالآخر یہ مسجد مسلمانوں کی صناعی کا ایک حیرت انگیز نمونہ بن گئی۔ مسجد میں سنگ مرمر کے بارہ سو ترانوے ستون تھے۔ چھت دس گز اونچی تھی۔ اس کے وسط میں ایک جواہر نگار شمع دان تھا۔ جس میں موم اور کافوری شمعیں روشن ہوتی تھیں۔ تین سو خادم عنبر و عود جلانے اور روشنی کا انتظام کرنے کے لیے مقرر تھے۔ سات برس کی محنت سے ایک بیش بہا منبر تیار ہوا جو قیمتی لکڑی، ہاتھی دانت، سیپ کے ٹکڑوں اور بیش بہا قیمتی جواہرات سے تیار کیا گیا تھا۔

قرطبہ کی یونیورسٹی اور شاہی دارلکتب بھی شہر کی شان و شوکت کا موجب تھے۔

مدینۃ الزہراء

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر (ثالث) جہاد اور غزوات سے فارغ ہو کر شاندار عمارت

اور محلات کی تعمیر کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے ایک محل' "قصر الروضۃ" کے نام سے بنایا اس طرح خلیفہ الناصر نے قرطبہ سے باہر چند میل کے فاصلے پر ایک اور محل تعمیر کیا جس کا نام اپنی بیوی کے نام پر "الزہراء" رکھا۔ یہ قصر الزہراء عجائبات کا نمونہ تھا۔ اس کی تعمیر ۹۳۶ء میں شروع ہوئی اور پچیس برس تک دس ہزار مزدور اور معمار کام کرتے رہے۔ خلیفہ الناصر کے بعد اس کے بیٹے کے عہد میں یہ محل پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس عظیم الشان محل میں سنگ مرمر کے چار ہزار تین سو ستون اور چار سو کمرے تھے۔ دلانون میں سنگ مرمر کا فرش بچھایا گیا تھا۔ دیواروں پر سنگ مرمر کی استرکاری تھی۔ محل کے دالانوں میں ایک ہزار فوارے لگائے تھے۔ فواروں کا پانی چھوٹی چھوٹی نہروں میں بہتا ہوا حوضوں میں جا گرتا تھا۔ صندل کے دروازوں پر آبنوس' ہاتھی دانت اور جواہرات سے گل کاری کی گئی تھی۔ پھر باغوں اور چمن زاروں نے ایک بہار پیدا کر رکھی تھی۔ غرضیکہ یہ محل انسانی صناعی اور دستکاری کا ایک حیرت افزا نمونہ تھا۔ خلیفہ نے کرسی حکومت کے لیے اس محل کو منتخب کیا۔ سفیروں کی آمد و رفت سے بڑی چہل پہل رہنے لگی اور محل کے ارد گرد مکانات نے ایک نیا شہر بسا دیا۔ یہ شہر مدینہ الزہراء کے نام سے مشہور ہوا۔

ملوک الطوائف

امیر عبدالرحمٰن اول (الداخل) کی قائم کردہ اموی حکومت کے مٹتے ہی سارا ملک انتشار و بدنظمی کی نذر ہو گیا۔ اندلس کا ملک کوئی بیس چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں منقسم ہو گیا۔ غرناطہ' قرطبہ' ملاغہ' سارا گوسا' طلیطلہ' اشبیلیہ' وغیرہ میں الگ الگ خودمختار حکومتیں قائم ہو گئیں۔ جن کے حکمران ملوک الطوائف مشہور ہوئے۔ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں لڑائی جھگڑے بھی ہوتے رہتے تھے۔ انجام کار بعض پر تو شمالی علاقے کے عیسائی سرداروں نے قبضہ کر لیا۔ اور بعض کو مرابطین اور موحدین نے مٹا دیا۔

یہ بات بڑی حیرت افزا ہے کہ اس بدنظمی اور انتشار و اضطرات کے زمانے میں بھی شعر و ادب اور علم و فن کی ترقی برابر جاری رہی۔ ملوک الطوائف خود عالم و فاضل تھے اور علوم و فنون کی قدردانی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

بنو عباد کی ریاست سب سے مشہور تھی۔ ان کا پایہ تخت اشبیلیہ تھا کچھ عرصے کے بعد جب بنو عباد نے قرطبہ پر بھی قبضہ کرلیا تو اندلس میں ان کو بڑی نمایاں اور ممتاز حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس خاندان کا بڑا نامور حکمران معتمد تھا۔ معتمد سیاسی قوت و سطوت کے ساتھ علمی اور ادبی ذوق و قدر دانی میں سارے اندلس میں یگانہ تھا۔

بنو جمہور نے تقریباً چالیس برس تک قرطبہ میں حکومت کی' لیکن بنو عباد نے انہیں مار بھگایا اور قرطبہ پر قبضہ کرلیا۔

بنو ھود اور بنو ذو النون طلیطلہ پر حکمرانی کرتے رہے۔ بنو نصر غرناطہ میں اپنی شان و شوکت کا ڈنکا بجاتے رہے اسی طرح بلنسیا اور دیگر ریاستوں کے حکمران اپنی اپنی حکومت میں مست تھے' تا آنکہ گیارھویں صدی عیسوی کے آخر میں افریقہ کے بربروں نے آکر ان سب پر تسلط جمالیا۔

مرابطین

مرابطین ابتدا میں دیندار اور بہادر بربروں کی ایک جماعت کا نام تھا' جس نے کچھ عرصے کے بعد شمال مغربی افریقہ میں ایک طاقتور حکومت قائم کرلی تھی۔ یوسف بن تاشفین (۱۰۶۱ء۔۱۱۰۶ء) اس خاندان کا سب سے طاقتور حکمران تھا اس کے عہد حکومت میں مرابطین کی سلطنت اوج کمال پر تھی۔

بنو عباد کے حکمران معتمد نے عیسائی حملے کی روک تھام کے لیے یوسف بن تاشفین سے مدد مانگی۔ وہ بارہ ہزار کا لشکر لے کر اندلس پہنچا۔ زلاقہ کے میدان میں بڑا معرکہ ہوا۔ عیسائی شکست کھا کر بھاگ گئے۔ جنگ کے بعد یوسف واپس چلا گیا' لیکن تھوڑا عرصہ بعد اس نے اندلس میں پہنچ کر اشبیلیہ اور غرناطہ وغیرہ ریاستوں پر قبضہ کرلیا۔

مرابطین مراکش میں بیٹھ کر اندلس پر حکومت کرتے تھے۔ اسی طرح بغداد کے عباسی خلیفہ نے اپنا اقتدار قائم کرلیا اور اس کی طرف سے یوسف بن تاشفین کو امیر المسلمین کا لقب دیا گیا تھا۔ خطبہ میں عباسی خلیفہ کا نام لیا جاتا تھا۔ مرابطین نے اندلس پر ستاون برس حکومت کی۔

موحدین (۱۱۴۷ء۔۱۲۱۲ء)

بربر کے ایک اور خاندان نے مرابطین کو نکال دیا اور خود حکمرانی کرنے لگے۔ یہ موحدین کہلاتے تھے۔ اس خاندان کا بانی محمد بن تومرت تھا جس نے مہدی ہونے کا دعویٰ کرر کھا تھا۔ اس کے پیرو موحدین کہلاتے تھے۔ محمد بن تومرت کے جانشین عبدالمئومن نے بڑی قوت حاصل کرلی اور ۱۱۴۷ء میں مراکش پر قبضہ کر کے مرابطین کو نکال باہر کیا۔ تین برس کے اندر اندر اس کا اقتدار اندلس میں بھی قائم ہو گیا۔ بعدازاں عبدالمئومن نے طرابلس، تونس اور الجزائر کو بھی فتح کر لیا۔ موحدین عباسی خلیفہ کا خطبہ پڑھتے تھے اور نہ اس کی سیادت کے قائل تھے۔ عبدالمؤمن نے ۱۱۶۳ء میں وفات پائی۔ اس کا پوتا ابو یوسف یعقوب (۱۱۸۴ء۔۱۱۹۹ء) بڑا نامور اور طاقتور حکمران ثابت ہوا۔ امیر ابو یوسف یعقوب نے اندلس سے عیسائی حکومت کو ختم کرنے کی بڑی کوشش کی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے لیے ۱۸۰ جہازوں کا بیڑا بھی روانہ کیا۔ امیر یعقوب علوم و فنون کا قدر دان تھا۔ مشہور فلسفی ابن رشد، نامور طبیب ابن زہر اور شہرۂ آفاق فلسفی اور ماہر ریاضی وہیئت ابن باجہ اسی کے عہد کی یادگار ہیں۔ امیر یعقوب نے مراکش میں ایک مشہور رباط بسایا۔ ملک میں نہریں بنوائیں۔ شفاخانے کھولے۔ اشبیلیہ میں ایک مینار سرخ اینٹوں سے تعمیر کیا۔ یعقوب کی وفات کے بعد اندلس میں اسلامی حکومت پر پھر زوال آ گیا۔

سلطنت غرناطہ

سلطنت غرناطہ کا بانی بنو نصر کا سردار محمد بن یوسف (۱۲۵۳ء۔۱۲۷۳ء) تھا جو ابن الاحمر کے لقب سے مشہور ہے۔ موحدین کے زوال کے بعد ابن الاحمر نے شہر غرناطہ پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں اردگرد کے علاقے بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔ اب سلطنت غرناطہ اچھی خاصی حکومت بن گئی تھی۔ ابن الاحمر بڑا ہوشمند مدبّر اور لائق حکمران تھا۔ اس نے مراکش کے سلاطین سے تعلقات استوار کر کے ان کی مدد سے پرتگال اور کسٹائل کے بادشاہوں کو کئی لڑائیوں میں شکست دی۔

اس خاندان کو بنو نصر اور بنو احمر بھی کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے غرناطہ میں ۲۵۰ برس تک حکومت کی اور اس خاندان کے بیس اکیس حکمران یکے بعد دیگرے تخت حکومت پر بیٹھے۔

بنو احمر کے زمانے میں غرناطہ نے بڑی ترقی کی۔ یہ شہر تجارت اور صنعت و حرفت کا مرکز قرار پایا۔ ہزاروں مسلمان عیسائی علاقوں سے ہجرت کر کے غرناطہ میں آ بسے۔ غرناطہ کی آبادی کئی لاکھ تک پہنچ گئی۔ بنو احمر (بنو نصر) نے غرناطہ میں بہت سے شاندار محل تعمیر کیے، مسجدیں، مدرسے اور شفاخانے بکثرت بنوائے۔ دل کشا باغات لگائے۔ غرناطہ میں علوم و فنون کے چرچے ہوئے اور بہت سے عالم و فاضل یہاں پیدا ہوئے۔

ابن الاحمر حکومت کا ایک شاندار کارنامہ قصر الحمراء کی تعمیر تھا۔ یہ شاندار محل غرناطہ کی ایک پہاڑی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ محل اندلسی مسلمانوں کے فن تعمیر کا ایک حیرت افزا نمونہ ہے۔ اپنی وسعت، محل وقوع، شوکت و عظمت، صناعی اور ہنرمندی کے لحاظ سے ایک لاجواب اور بے نظیر عمارت ہے۔ اگرچہ ابن الاحمر کے زمانے میں اس کی تعمیر ہو چکی تھی، لیکن اس کے جانشین الحمراء کی آرائش و تزئین اور حسن و جمال میں برابر اضافہ کرتے رہے۔ جابجا گچ کی جالیاں، نقش و نگار، حوض اور فوارے اس کے حسن و جمال اور شان و شوکت کو دوبالا کرتے تھے۔

○○○

تحریکِ خوارج : تاریخ اسلام میں نیا فکر و عمل

اسلام میں خارجیوں کی تحریک کئی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ایک نیم سیاسی، اور نیم مذہبی تحریک تھی۔ جو اسلام کے دور اول کی یادگار ہے۔ یہ تحریک اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کا فکری اور نظری پہلو بہت ترقی پسندانہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ اسلام میں پہلی منظم سازش تھی جس کی پیٹھ ٹھونکنے کے لیے بہت بڑی عسکری قوت حاصل کی گئی۔ اسی تحریک کی بدولت ہماری تاریخ پہلی مرتبہ نئے فکر و عمل سے روشناس ہوئی۔

تاریخی پس منظر

جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس دار فانی سے تشریف لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو اپنا جانشین نامزد نہ فرمایا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں جانشین یا خلیفہ رسولؐ کے بارے میں اختلاف رونما ہونے لگا۔ عہد نبوی کے مسلمان اپنی قربانی اور ایثار کے سبب دو ناموں سے یاد کیے جاتے تھے۔ مہاجرین، یعنی وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی خاطر اپنا گھربار چھوڑا اور دوسرے انصار، یعنی وہ لوگ جنہوں نے پیغمبرؐ اور اس کے مہاجر ساتھیوں کو اپنے ہاں جگہ دے کر بھائی چارے کی زندگی بسر کی۔

انصار کا یہ کہنا تھا کہ نبی کریمؐ تیرہ برس مکہ مکرمہ میں تشریف فرما رہ کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، مگر چند مقدس اور پاکباز انسانوں کے سوا کسی نے آپؐ کی آواز پر کان نہ دھرا، بلکہ دشمنان اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیفیں اور اذیتیں

پہنچاتے رہے، مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو اسلام چار دانگ عالم میں پھیلنے لگا۔ حکومت اور سلطنت کا قیام معرض وجود میں آیا۔ اسلام بحیثیت ضابطۂ حیات کے دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ انصار سے اللہ اور اس کا رسولؐ خوش رہے۔ ان وجوہ کی بنا پر خلیفہ رسول اللہ انصار میں سے ہونا چاہیے۔ اس خیال کے پیش نظر انصار نے بڑی جلد بازی سے کام لیا اور سقیفۂ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر اپنے میں سے خلیفہ منتخب کر لینا چاہا۔

دوسری جانب مہاجرین اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھنے میں حق بجانب تھے۔ انہوں نے اسلام کی راہ میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کیا اور قلت تعداد کے باوجود مخالفین اسلام کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔ نیز انہیں یہ بھی خیال تھا کہ قریشی ہونے کی وجہ سے فضیلت و شرافت اور سرداری و حکومت انہی کے حصے میں آتی ہے۔

تیسری رائے یہ تھی کہ مہاجرین اور انصار الگ الگ اپنا امیر اور حکمران منتخب کر لیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب مسلمانوں میں سیاسی اختلاف رونما ہوا۔ تاریخ اسلام میں یہ بڑا نازک اور خطرناک موڑ تھا، لیکن حضرت ابوبکرؓ کے تدبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی دوراندیشی نے حالات پر کچھ اس طرح قابو پایا کہ اختلاف دب کر رہ گیا۔ بہرکیف ابوبکر صدیقؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین چن لیا گیا۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ باری باری مسند خلافت پر بیٹھتے رہے۔

خارجی تحریک جن کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ حضرت علیؓ کے عہد میں معرض ظہور میں آئی۔

تحریک کا پہلا دن

واقعات یوں ہیں کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان حضرت عثمانؓ کی شہادت پر اختلاف رونما ہو گیا۔ جو بڑھتے بڑھتے مخاصمت اور عداوت کی شکل اختیار کر گیا اور جنگ تک نوبت پہنچ گئی۔ دونوں کی فوجیں جنگ صفین لڑ رہی تھیں کہ حضرت معاویہؓ نے اعلان کر دیا کہ آؤ جنگ بند کر دیں اور قرآن مجید کو حکم بنا کر اس کے فیصلہ کو قبول کرنے کا

اقرار کریں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں کے نمائندے مل کر جو فیصلہ کریں وہ فریقین کو منظور ہو گا۔ حضرت علیؓ کی طرف سے ابو موسیٰ اشعریؓ نمائندہ مقرر ہوئے اور امیر معاویہؓ کی طرف سے عمرو بن العاصؓ۔ حضرت علیؓ کے لشکر میں ایک گروہ نے اس تجویز کی مخالفت میں آواز بلند کرتے ہوئے کہا کہ قرآن مجید کے احکام بڑے واضح اور ان کا مطلب بالکل صاف ہے۔ اس ضمن میں کسی حَکَم اور جج کی قطعاً ضرورت نہیں۔ چنانچہ اس گروہ نے اِنِ الحُکمُ اِلاَّ لِلّٰہِ کا نعرہ بلند کیا، یعنی اللہ کا حکم ہی آخری اور قطعی ہے۔ یہ نعرہ برق رفتاری کے ساتھ فوج میں پھیل گیا اور ایک اچھی خاصی جمعیت نے اس نعرے کو اپنا لیا۔

ان لوگوں کا یہ مطالبہ تھا کہ حضرت علیؓ حکم مقرر کرنے میں اپنی غلطی، بلکہ کفر کا اقرار کریں اور امیر معاویہؓ سے جو شرائط طے ہوئی ہیں ان سے رجوع اور توبہ کریں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ہم ان کے ساتھ ہیں اور ان سے مل کر دشمنوں سے لڑیں گے، مگر حضرت علیؓ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ امیر المومنین حضرت علیؓ کے لیے بڑی مشکلات تھیں۔ امیر معاویہؓ سے ایک سیاسی معاہدہ تھا وہ اس سے روگردانی کیونکر کریں۔ اگر وہ عہد و پیان کو نظر انداز کرتے ہیں تو ضمیر کی ملامت کے ساتھ جماعت میں انتشار اور پراگندگی کا ڈر ہے۔ دوسری جانب وہ کفر کا اقرار و اعتراف کیوں کریں، جب کہ انہوں نے کسی کافرانہ یا مشرکانہ فعل کا ارتکاب نہیں کیا۔ ان لوگوں نے اِنِ الحُکمُ اِلاَّ لِلّٰہِ کا نعرہ لگا لگا کر حضرت علیؓ کو بڑا ستایا، لیکن اس کے باوجود حضرت علیؓ کے استقلال و عزیمت میں سرمو فرق نہ آیا۔ جب یہ لوگ خلیفۂ وقت کے طرز عمل سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے ایک مکان میں جمع ہو کر عوام کو خوب بھڑکایا اور کہا کہ وہ اس ظالم بستی کو چھوڑ کر کہیں اور جا آباد ہوں۔ چنانچہ سب لوگ کوفہ کے قریب حروراء نامی بستی کی طرف چل دیئے اور اسی نسبت سے ان لوگوں کو حروریہ کہا جانے لگا۔ ان کے قومی نعرے کی نسبت سے انہیں مُحکِّمَہ بھی کہتے ہیں۔ اس گروہ نے عبداللہ بن وہب الراسبی کو اپنا امیر چن لیا۔

خارجی کی وجہ تسمیہ

اس گروہ کو خارجی کہنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے حکومت وقت کے

خلاف خروج یعنی علم بغاوت بلند کیا تھا' اس لیے خارجی یعنی باغی قرار پائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ ہم اپنا گھربار چھوڑ کر اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلے ہیں۔ اس لیے ہم خارجی یعنی مہاجر اور مجاہد فی سبیل اللہ ہیں اور اپنے حق میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش کرتے تھے:

وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِہٖ مُھَاجِرًا" اِلَی اللّٰہِ (الآیہ) یعنی جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی خاطر گھربار چھوڑ کر نکل کھڑا ہو اور اس دوران میں موت اسے آلے تو اس کا صلہ اور اجر اللہ کے ذمہ ہے۔

خارجیوں کو شراۃ بھی کہتے ہیں' یعنی وہ لوگ جنہوں نے اپنی جان اللہ کی راہ میں بیچ دی۔ وہ قرآن مجید کی اس آیت سے استنباط کرتے ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ (الآیہ) "یعنی بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضامندی اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جانوں کو اس کی راہ میں قربان کرنے کا عہد و پیمان کرکے میدان جہاد میں نکل آتے ہیں۔"

خارجی میدان کارزار میں

جب حضرت علیؓ کو ان کی بغاوت اور شوریدہ سری کا علم ہوا تو انہوں نے لشکر کشی کرتے ہوئے نہروان کے مقام پر ان لوگوں کو آلیا۔ یہیں جنگ نہروان کا معرکہ پیش آیا۔ حضرت علیؓ نے خارجیوں کو شکست دے کر ان کی بڑی بھاری جمعیت کو تہ تیغ کر ڈالا' لیکن اس کے باوجود ان کا نام و نشان نہ مٹا سکے اور ان کے انداز فکر کا خاتمہ نہ کر پائے۔ اس ہزیمت نے خارجیوں کے دلوں میں حضرت علیؓ کے خلاف بغض و عداوت اور نفرت و حقارت کے جذبات کو تیز تر کر دیا۔ کمزور اور بے بس ہونے کی وجہ سے مردانہ وار میدان جنگ میں طاقت آزمائی کرنے سے تو رہے' البتہ اس دشمنی نے سازشوں اور خاموش فتنوں کی شکل اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود حضرت علیؓ اپنی جلالت قدر اور علو مرتبت کے باوجود اس سازش کا نشانہ بننے سے نہ بچ سکے۔

رفتہ رفتہ خارجی تحریک زور پکڑنے لگی اور عراق کے مشہور شہروں' یعنی کوفہ اور

بصرہ سے نکل کر عالم اسلامی میں پھیل گئی۔ یہ تحریک بنو امیہ کی خلافت میں ایک چبھتا ہوا کانٹا بن کر ہمیشہ کے لیے تکلیف اور پریشانی کا موجب بنی رہی۔ بنی امیہ کے مشہور و معروف سالار لشکر مہلب بن ابی صفرہ جیسے بہادر قائد' ان کے خلاف برسوں صف آرا رہے۔ حجاج بن یوسف جیسے مدبر اور منتظم حاکم خارجیوں کے فتنے کو ختم نہ کر سکے۔

خارجیوں نے بنو عباس کو بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ان کے عہد خلافت میں خارجی تحریک نے کرمان' سجستان' خراسان اور عراق میں بہت زور دکھایا۔ خلیفہ ہارون الرشید کو خراسانی خارجیوں نے سخت پریشان کیا۔ خلیفہ مامون کے عہد حکومت میں عراق اور خراسان میں خارجی شورشوں نے حکام کا ناک میں دم کر دیا۔ ابراہیم بن مہدی کے مختصر زمانۂ خلافت میں بھی خارجیوں نے بغداد میں علم بغاوت بلند کر کے قصر خلافت میں ہلچل ڈال دی۔

خارجی فکر و نظر

اب تک یہ مسلمہ امر تھا کہ اسلامی ریاست کا حاکم اعلیٰ یا امیر المومنین قریش میں سے ہو۔ جب اس باب میں خارجیوں نے پرانے ڈگر سے ہٹ کر سوچا تو انہوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ امیر حکومت کے لیے قریشی ہونا قطعاً" ضروری نہیں۔ ان کے نزدیک امیر المومنین کا انتخاب تمام آزاد بالغ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ وہ جسے چاہیں اپنا امیر منتخب کر لیں۔ ان کی رائے میں ایک سیاہ فام حبشی غلام بھی امیر اور خلیفہ ہو سکتا ہے۔ اگر خلیفہ یا امیر اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرے تو اسے معزول بھی کیا جا سکتا ہے۔ امیر المومنین کے انتخاب اور معزولی کے بارے میں یہ بالکل نیا انداز فکر تھا۔ اب تک مسلمان اس قسم کے فکر و نظر سے بالکل غیر مانوس تھے۔ خارجیوں نے پہلی مرتبہ جمہوری انداز فکر کی داغ بیل ڈالی۔ اس گروہ نے اپنے اس نظریہ انتخاب کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ایک غیر قریشی شخص یعنی عبداللہ بن وہب راسبی کو اپنا پہلا امیر منتخب کیا۔ یہ شخص بنو ازد میں سے تھا۔

اہل سنت یہ مانتے تھے کہ خلافت کے حقدار قریشی ہیں۔ دوسری جانب شیعہ

حضرات اس حق کو اہل بیت تک محدود رکھنے کے قائل ہیں۔ خارجیوں نے دونوں گروہوں کے نظریے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ساتھ ہی اس عہدے کے تقدس کو قائم رکھنے کے لیے معزولی کی اپج لگا دی۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے خلاف اس نظری اختلاف کی بنا پر ہمیشہ میدان کار زار گرم رہا۔

خارجیوں نے خلافت کو اپنا موضوع بحث بنایا اور حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ کے عہد خلافت پر مہر تصدیق ثبت کی۔ حضرت عثمانؓ کے پہلے دور کو درست قرار دیا' لیکن آخری دور کے بارے میں یہ فتویٰ صادر کیا' کہ انہیں معزول کر دینا چاہیئے تھا۔ اسی طرح حضرت علیؓ کی خلافت کو بھی حق بجانب قرار دیتے ہوئے یہ کہا کہ ججوں کے تقرر میں ان سے غلطی سرزد ہوئی اور یہ غلطی انہیں کفر کی حدود میں لے گئی۔ اسی طرح ان لوگوں نے جنگ جمل میں شریک ہونے والے حضرات کو بھی ہدف طعن بنایا اور ابو موسیٰ اشعریؓ اور عمرو بن عاصؓ پر کفر کا فتویٰ لگایا۔

ابتدا میں خارجیوں کی سوچ اور فکر کا مرکز و محور سیاست و خلافت تھا' لیکن خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانے میں انہوں نے دینی معتقدات کو بھی موضوع غور و فکر بنایا اور ایمان و عمل کو زیر بحث لایا گیا۔

خارجیوں نے نماز' روزہ اور صدق و عدل پر بڑا زور دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایمان محض اعتقاد کا نام نہیں ہے۔ صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہہ دینا کافی نہیں' اس اقرار کے ساتھ تمام فرائض دین پر عمل ضروری ہے۔ نیز کبیرہ گناہ کا ارتکاب مسلمانوں کو کافر بنا دیتا ہے۔ خارجی لوگ مذہب کے بارے میں غور و فکر اور اجتہاد کے بھی قائل ہیں۔

خارجیوں کی اخلاقی قدریں بھی کچھ کم جاذب نظر نہیں۔ بعض موقعوں پر ایک مسلمان کو موت کے گھاٹ اتار دینا عین کار ثواب سمجھتے اور ایک عیسائی کو بحفاظت تمام اس کے گھر پہنچا دینے کو اور اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری تصور کیا جاتا۔ ان کی اخلاقی قدروں کا یہ حال تھا کہ درخت سے گری ہوئی کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لینا جائز نہ سمجھتے

تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چند خارجیوں نے مل کر ایک درخت کی کھجوروں کا سودا کرنا چاہا۔ درخت کا مالک ایک ذمی یعنی غیر مسلم تھا۔ اس (مالک) نے کہا کہ آپ لوگوں کو جتنی کھجوریں درکار ہیں لے لیجیے۔ خارجی بولے کہ بغیر قیمت ادا کیے کھجوروں کو ہاتھ لگانا بھی ممکن نہیں۔ خارجیوں کے نزدیک جھوٹ بولنا بہت بڑا عیب ہے۔

پہلی عوامی سازش

جب خارجی نوجوانوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی وحدت کا شیرازہ اندرونی خلفشار کی نذر ہو رہا ہے۔ اسلامی سلطنت شخصی رقابتوں اور ذاتی رنجشوں کی وجہ سے پارہ پارہ ہوا چاہتی ہے۔ چند افراد کا اختلاف ملت اسلامیہ کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دینے کے درپے ہے۔ ایک جانب حضرت علیؓ کوفہ میں مسند خلافت پر تشریف فرما ہیں اور دوسری طرف دمشق اور اس کے گرد و نواح میں امیر معاویہؓ کا اقتدار اپنی الگ حکومت کا پتہ دے رہا ہے۔ تیسری جانب مصر میں عمرو بن عاصؓ اپنی سیاست اور تدبّر کے باعث عسکری قوت کا بہت اہم مہرہ بنے بیٹھے ہیں۔ خارجیوں نے کچھ اس انداز سے سوچا اور یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے کہ تمام ہنگاموں اور فتنوں کی وجہ یہی تین سیاسی شخصیتیں ہیں۔ ان لوگوں نے طے کیا کہ اگر ان تینوں سیاسی رہنماؤں کو قتل کر دیا جائے تو اسلام اور ملت کی وحدت از سر نو قائم کی جا سکتی ہے، چنانچہ یہ قرار پایا کہ رمضان المبارک کی پندرہ تاریخ کو تینوں حضرات کو صبح سویرے مسجد میں نماز کے لیے داخل ہوتے وقت قتل کر دیا جائے۔ اس قرارداد کے پیش نظر ایک آدمی کوفہ پہنچا' دوسرا مصر اور تیسرا دمشق۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ' نے جام شہادت نوش فرمایا۔ عمرو بن العاص اتفاقاً" یا عمداً" بیمار ہو گئے۔ ان کی جگہ ان کا نائب خارجہ نامی شخص وقت مقررہ پر قتل ہوا' امیر معاویہ پر تلوار کا وار تو ہوا' لیکن خالی گیا۔ البتہ ران سے اوپر کمر سے نیچے زخم آ گیا۔ جس کی وجہ سے رگ حیات آفریں کٹ گئی۔ اس حادثہ کے بعد امیر معاویہ کے ہاں کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خوارج کے مختلف فرقے

فکر و عمل کے اعتبار سے خارجیوں میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ نظریۂ خلافت اور نظریۂ ایمان پر تمام خوارج متفق اور متحد ہیں، لیکن زندگی کی دوسری تفاصیل میں ان کے درمیان اتنا اختلاف رائے ہے کہ وہ بیس کے قریب گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ان بیس گروہوں میں سے چار گروہ تو خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

پہلے گروہ کا نام ازارقہ ہے۔ یہ لوگ نافع بن ازرق کے پیرو تھے۔ نافع بن ازرق کا شمار خارجیوں کے بہت بڑے مفکروں اور قانون دانوں میں ہوتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کے پیروؤں کے علاوہ باقی تمام مسلمان کافر ہیں۔ اس نے اپنے متبعین کو حکم دے رکھا تھا کہ کسی دوسرے کے پیچھے نماز نہ پڑھیں۔ غیروں کا ذبح کیا ہوا گوشت نہ کھائیں۔ کسی غیر کے ساتھ رشتہ ناطہ نہ کریں۔ اس گروہ کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ جو آدمی جنگ میں لڑنے کی استطاعت اور طاقت کے باوجود شرکت سے گریز کرے اور میدان جہاد میں داد شجاعت دینے کی بجائے گھر کی چاردیواری کے اندر بیٹھا رہے اس کے کفر میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ ازارقہ کے نزدیک ایسے بزدل آدمی کی سزا قتل ہے اور اس کی جائیداد اور مال و دولت قابل ضبطی ہے۔

دوسرا گروہ نجدات کے نام سے مشہور ہے۔ یہ لوگ نجدہ بن عامر کے مدرسہ فکر کو مانتے تھے۔ ان کا مشہور عقیدہ یہ ہے کہ دین دو چیزوں کا نام ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی معرفت اور پہچان۔ اس گروہ کے نزدیک باقی تمام چیزیں حشو و زوائد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جمہور کے لیے ان دو چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز کا جاننا ضروری نہیں ہے۔ یہ گروہ کہتا تھا کہ جنگ میں شرکت قابل تعریف اور باعث فضیلت ضرور ہے، لیکن پیچھے رہ جانے سے کفر لازم نہیں آتا۔

تیسرا گروہ صفریہ کہلاتا ہے۔ یہ لوگ زیاد بن اصفر کے پیرو تھے۔ ان کے عقائد زیادہ تر ازارقہ سے ملتے جلتے تھے۔ مذہب اور سیاست میں تشدد اور سخت گیری ان کا امتیازی نشان تھا۔ البتہ ان لوگوں میں اتنی لچک پیدا ہو چکی تھی کہ وہ جنگ میں شرکت نہ

کرنے والے کو کافر نہ سمجھتے تھے۔

چوتھا قابل ذکر مدرسہ فکر اباضیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس فرقہ کے رہنما کا نام عبداللہ بن اباض تمیمی تھا۔ یہ لوگ قدرے رواداری سے کام لیتے اور دوسرے مسلمانوں سے رشتہ ناطہ جائز سمجھتے تھے۔ امن پسندی اور صلح جوئی کی طرف زیادہ میلان تھا۔ غیر خارجیوں کو گردن زدنی اور کشتنی قرار نہ دیتے تھے۔ اس گروہ کے نزدیک عام مسلمانوں کی بستیاں دارالحرب شمار نہ ہوتی تھیں۔ البتہ وہ یہ ضرور کہتے تھے کہ جہاں غیر خارجی بادشاہ کی فوجوں کا قیام ہو' وہ علاقہ دارالحرب یعنی دشمن کی سرزمین ہے۔ یہ فرقہ صلح کن روش اور مصالحانہ انداز فکر کی وجہ سے آج بھی خاصی تعداد میں شمالی افریقہ کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔

خارجی مذہب کی پابندی بڑی سختی سے کرتے تھے۔ عبادت میں تشدد اور انہاک کا یہ حال تھا کہ نمازوں میں لمبے سجدوں کی وجہ سے ان کی پیشانیوں اور ہتھیلیوں پر سیاہ نشانات پڑ گئے تھے جس طرح کہ اونٹ کے سینے پر سیاہ داغ ہوتے ہیں۔ نماز روزوں کی پابندی کی وجہ سے عوام انہیں نمازی اور روزہ دار کے نام سے یاد کرتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ زیاد نے ایک خارجی کو قتل کر دیا۔ پھر اس کے خادم کو بلا کو پوچھا کہ یہ کیسا آدمی تھا؟ خادم نے جواب دیا کہ وہ تو صائم الدہر تھا۔ ہمیشہ روزہ رکھتا۔ زندگی بھر کبھی دن کے وقت کھانا نہیں کھایا اور شب زندہ داری کا یہ عالم تھا کہ رات بھر جاگتا اور خدا کی عبادت کرتا رہتا۔ قیام لیل میں عزیمت و احتیاط کا یہ حال تھا کہ کبھی بستر بچھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

خارجی اپنے عقیدے میں بڑے پکّے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو تو ٹکسالی مسلمان سمجھتے۔ ان کی نیکی و بزرگی' عظمت و جلال اور خدمت و ایثار کا لوہا مانتے تھے۔ لیکن اتنے بے باک اور بے خوف تھے کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ جیسے جلیل القدر اور بلند مرتبت لوگوں کے افعال کو نہ محض ناپسند کرتے تھے' بلکہ کفر تک کا فتویٰ لگا دینے سے نہ ہچکچاتے تھے۔ اس ضمن میں نہ تو ان لوگوں کی قربانی اور ایثار یاد کر۔ ' نہ

رسول خدا سے رشتہ اور تعلق خاطر میں لاتے۔ بایں ہمہ اکابر اسلام نے اس گروہ سے بڑی رواداری برتی۔

حضرت علیؓ نے مخالفت اور نہروان کے سخت اقدام کے باوجود یہ فرمایا کہ میرے بعد خارجیوں سے جنگ نہ کی جائے' کیونکہ ان لوگوں کا جرم صرف اس قدر ہے کہ وہ حق کی تلاش و جستجو میں نکلے' مگر راہ راست سے بھٹک گئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے مقدس انسان اور نیک دل خلیفہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ مجھے اس بات کا علم ہے کہ خارجی لوگوں کا وجود دنیوی اغراض و مقاصد اور حصول عزت و جاہ کی خاطر معرض ظہور میں نہیں آیا' بلکہ ان کا ارادہ آخرت طلبی تھا۔ اس جدوجہد میں پاؤں ایسا پھسلا کہ آخرت کی راہ سے بہت دور ہٹ گئے۔

ابن عبدہٗ کی رائے ہے کہ خارجی سب فرقوں سے زیادہ بصیرت کے مالک تھے۔ اور اجتہاد اور غور و فکر کے معاملہ میں سب سے آگے تھے۔

شجاعت اور بہادری

خارجیوں کی شجاعت و بہادری بھی کچھ کم حیرت افزا نہیں۔ میدان کار زار میں بہادری کے وہ جوہر دکھاتے کہ اپنے تو اپنے پرائے بھی داد تحسین دیئے بغیر نہ رہ سکتے۔ جب میدان جنگ میں اترتے تو شیروں کی طرح بے جگری اور دلیری سے لڑتے۔ آہنی عزم و ارادہ لے کر آگے بڑھتے۔ تلوار کی طرح دشمنوں کو کاٹتے ہوئے گزر جاتے۔ دشمنوں کی صفوں کو آگ کے شعلوں کی طرح اپنی لپیٹ میں لے کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتے۔ موت کے پیچھے یوں دوڑتے جیسے دنیا کا طالب زندگی کے پیچھے دوڑتا ہے۔ خارجیوں کا نظریہ زندگی یہ تھا کہ وہ جنگوں اور لڑائیوں کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ میدان جنگ ان کے لیے دلی راحت اور قلبی سکون کا باعث تھا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ اسلم بن زرعہ دو ہزار کا لشکر جرار لے کر خارجیوں کے مقابلہ میں نکلا۔ خارجیوں کی طرف سے چالیس آدمی ابو بلال کی سرکردگی میں میدان جنگ میں اترے۔ یہ چالیس خارجی اس بے جگری اور بے باکی سے لڑے کہ دو ہزار مسلح

جوانوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اسلم کی یہ حالت تھی کہ جب کبھی بازار سے گزرتا، بچے اسے ستاتے اور آوازے کستے کہ وہ آیا ابو بلال۔

بالکل اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ ایک دن حجّاج نے حبیب الرحمٰن حکمی کی زیر قیادت تین ہزار کا لشکر خارجیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ ادھر سے تیس خارجی مقابلہ پر نکلے اور اس دیوانگی سے لڑے کہ تین ہزار سپاہیوں کے ہوش و حواس گم کر دیئے۔ چنانچہ حبیب کو یہ کہنا پڑا کہ اگر یہ خارجی تیس کے بجائے ایک سو تیس ہوتے تو آج ہمیں موت کے گھاٹ اتار دیتے۔

مہلّب جیسا بہادر سپہ سالار کہا کرتا تھا کہ مجھے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا ہے جو ڈر اور خوف کا نام نہیں جانتے اور موت کا نام سن کر خوش و خرم اور شاد کام ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ حجاج نے براء کو مہلّب کے پاس بھیجا تاکہ وہ سالار لشکر کو اکسائے کہ وہ خارجیوں کے خلاف اقدام کو تیز تر کر دے۔ جب براء نے خارجیوں کو بے جگری سے لڑتے دیکھا تو مہلّب کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ میں نے ان لوگوں سے بڑھ کر ثابت قدم، جم کر لڑنے والے اور جنگ کی مصیبتوں کو برداشت کرنے والے لوگ کبھی نہیں دیکھے۔

یہ بہادری اور جسارت صرف مردوں ہی کے حصّے میں نہ آئی بلکہ عورتوں کو بھی اس کا بہرہ وافر ملا تھا۔ وہ جنگ میں مردوں کا ساتھ دیتی تھیں۔ ان کی عزیمت و بصیرت اور استقلال و ہمت بھی قابل ستائش ہے۔ مصائب و تکالیف میں مردوں کی برابر کی شریک رہتی تھیں، بڑی سے بڑی آفت بھی ان عورتوں کی ہمتوں کو پست نہ کر سکتی تھی اور جابر سے جابر شخصیت کی موجودگی ان بہادر خواتین کے ہوش و حواس پر اثر انداز نہ ہو سکتی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک خارجی عورت کو گرفتار کر کے حجاج کے سامنے لایا گیا۔ وہ بڑی بے باکی سے حجاج کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ اس دوران ایک چھوٹے سے بچے کے رونے کی آواز نے آس پاس کے لوگوں کو ذرا پریشان کر دیا۔ وہ خارجی خاتون نہایت سکون اور وقار کے ساتھ بولی اسے رونے دو۔ رونا بچوں کے لیے مفید ہے۔ رونے سے سینا چوڑا چکلا ہوتا ہے اور آواز میں مردانگی اور بلندی آتی ہے۔ جبڑے کشادہ ہو کر رعب

و جلال اور ہیبت کا باعث بنتے ہیں۔ غور فرمائیے کہ ایک عورت وہ بھی قید کی حالت میں حاکم وقت کے سامنے کس انداز بے نیازی سے فلسفیانہ گفتگو کر رہی ہے اور حاکم بھی حجّاج جیسا باجبروت شخص۔

حسن اتفاق کہیئے کہ عوام کی طرح خارجی سالار اور قائد بڑے چالاک اور بہادر تھے۔ جنگ کی چالوں سے خوب باخبر اور بڑے مدبّر ثابت ہوتے۔ سخت کوشی' جگرداری اور عزیمت و بصیرت کے ساتھ ان کی وسعت معلومات' اطلاعات کی فراہمی اور فنون جنگ میں مہارت بڑی حیرت انگیز نظر آتی ہے۔ وہ خدعۃ الحرب' یعنی جنگی حیلہ سازی' کو خوب سمجھتے تھے' دشمن کی فوجوں کو تھکا کر اکتا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ وہ اسلحہ کی فراہمی اور ذخیرہ اندوزی سے پورا فائدہ اٹھاتے' دشمن کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے جاسوسوں کو مقرر کیا جاتا اور دشمن کو شکستہ دل کرنے کے لیے اپنی قوت غلبہ کا پراپیگنڈا کر کے مخالفین کی کمرہمت توڑنے میں خارجی سالاروں کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

خارجی سالاروں میں شبیب قطری اور ابو بلال اور مرداس تینوں بہادری جوانمردی اور شہسواری کے لیے ضرب المثل ہیں۔ شبیب بڑا زبردست' خوفناک اور بلند آواز والا سالار تھا۔ اس کی آواز میں اتنی ہیبت تھی کہ جب لشکر کے پہلو میں کھڑا ہوتا تو سپاہیوں پر سناٹے کا عالم طاری ہو جاتا۔ انہیں ہمت نہ پڑتی کہ ادھر ادھر دیکھیں۔ ایک شاعر نے شبیب کی خوفناک اور مہیب آواز کی قلمی تصویر کچھ یوں کھینچی ہے:

> "اگر تو کسی دن اسے بولتا سنے' تو یہ سمجھے کہ پہاڑ کی چٹان لڑھکتی ہوئی نیچے آ رہی ہے یا یہ کہ بڑی تند و تیز آندھی چل رہی ہے۔ یا تو یہ خیال کرے کہ سمندر کی موجیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔"

جب شبیب قتل ہوا تو حجاج نے حکم دیا کہ اس بہادر انسان کا سینہ چیر کر دیکھنا چاہیے کہ یہ کتنے بڑے دل کا مالک تھا' چنانچہ شبیب کا سینہ چاک کر کے اس کا دل باہر

نکالا گیا تو وہ اونٹ کے دل جتنا تھا۔ جب اسے زمین پر پٹختے تو فٹ بال کی طرح اوپر اچھلتا۔ اب قارئین خود اندازہ فرمائیں کہ شبیب کتنا خوفناک اور کس دل گردے کا انسان تھا۔

خارجی ادب

خارجیوں نے ایک خاص قسم کا ادب پیدا کیا۔ ان کے شعروں میں بھی زندگی کی سی حرارت اور گرمی موجود ہے۔ ان کے شاعر اور خطیب بڑے سحر طراز اور جادو بیان تھے۔ ان کے الفاظ اثر کیے بغیر نہ رہتے۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان خارجیوں کی سحربیانی کی داد دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ”مجھے گمان ہو چلا تھا کہ جنت انہیں لوگوں کے لیے بنائی گئی ہے اور جہاد مجھ پر ان سے کہیں زیادہ فرض ہے، لیکن اللہ نے مجھے ثابت قدم رکھا اور میرے دل میں حجت اور دلیل ڈال دی کہ میں حق و صداقت پر ہوں۔“

خارجی ادب و شعر ایک مستقل موضوع ہے جسے کسی اور فرصت پر اٹھا رکھا جاتا ہے۔ سردست چند اشعار کا ترجمہ ہدیہ ناظرین کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ خارجی سالار شہسوار قطری بن الفجاءہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ نامور شاعر گوئٹے نے اس نظم کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایک بزدل سے بزدل انسان بھی ان شعروں کو پڑھ کر دیوانہ وار میدان جنگ میں کود پڑنے پر مجبور ہو جائے:

”جب میرا دل بہادر شاسواروں کے خوف کے مارے ہوش و حواس کھو بیٹھا تو میں نے اس سے کہا: ارے کمبخت! مت ڈر۔“

”کیونکہ اگر تو اپنی مقررہ زندگی سے ایک دن بھی زائد مانگے تو تیری التماس درخور اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔“

”بہتر یہ ہے کہ میدان موت میں صبر سے کام لے، کیونکہ ہمیشہ کی زندگی ناممکن ہے۔“

”بقاء و دوام عزت کی نشانی نہیں اگر ایسا ہوتا تو پھر ہر ذلیل و کمینہ اور ڈرپوک انسان اس دنیا سے اٹھا لیا جاتا۔“

”ہر انسان بلکہ ہر زندہ چیز کو موت کی راہ پر گامزن ہونا ہے اور یہی اس کا انجام

ہے۔ موت کی طرف دعوت دینے والا ساری کائنات کو اس طرف بلانے والا ہے۔"

جو آدمی جوانی میں نہیں مرتا تو زندگی سے تنگ آجاتا ہے تو بوڑھا ہو جاتا ہے پھر انجام کار موت اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔"

"جب انسان کا وجود بیکار سمجھا جائے تو پھر اس کے لیے زندگی میں کوئی فائدہ نہیں۔"

شعر و شاعری کا بہرہ وافر خارجی عورتوں کے حصہ میں بھی آیا تھا۔ خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں خارجیوں کا سردار ولید بن طریف شاہی فوجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے یزید بن فرید کے ہاتھوں مارا گیا تو اس کی بہن لیلیٰ نے بھائی کا مرثیہ لکھا جس کے چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"وہ ایسا جوانمرد تھا جسے تقویٰ کے سوا اور کوئی زاد راہ پسند نہ تھا۔ نہ نیزۂ و تلوار کے سوا کوئی اور مال و دولت پسند تھا۔"

"جب تک زندہ رہا بڑی سخاوت کرتا رہا۔ اس کی موت کے ساتھ سخاوت بھی ختم ہو گئی ہے۔"

"وہ زندگی بھر دشمنوں کے لیے وبال جان بنا رہا اور کمزور و ناتواں لوگوں کا ملجا و ماویٰ۔ اگر آج یزید بن فرید نے اسے ہلاک کر دیا ہے تو کیا ہوا' وہ بھی لشکروں کے لشکر تہ تیغ کر ڈالا کرتا تھا۔"

○○○

عربی و فارسی ثقافتوں کا امتزاج

جب مختلف ملکوں اور عقیدوں کے لوگ آپس میں ملتے جلتے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے تھوڑی بہت چیزیں ضرور لیتے ہیں۔ ان کے کھانے پینے کے طور طریقے، رہنے سہنے کے انداز، عقائد و عبادات، علم و ادب، ہنروفن، اخلاق و عادات اور خیالات و افکار بھی کسی نہ کسی رنگ میں ایک دوسرے کے اثرات قبول کرتے ہیں اور یہی ثقافتوں کا امتزاج ہے۔

عربوں اور فارسیوں کے باہمی میل جول کی داستان خاصی پرانی ہے۔ اسلام سے پہلے بھی دونوں قوموں کے آپس میں سیاسی تعلقات اور تجارتی مراسم تھے۔ حیرہ کی ریاست عربوں کے تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی۔ یہ ریاست فارس کی سرحد پر واقع تھی اور ایک لحاظ سے حیرہ کے لخمی حکمران کسرے ایران کے زیر نگیں تھے۔

ابن خلدون کا کہنا ہے کہ تجارتی تعلقات کی بنا پر حیرہ کے بہت سے لوگ فارسی زبان جانتے تھے اسی طرح اہل فارس میں بھی عربی جاننے والے موجود تھے۔

شاہ بہرام گور کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ یونانی زبان کے علاوہ عربی بھی خوب جانتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب یزدگرد کی وفات پر بہرام اور اس کے بھائی میں تخت نشینی کے بارے میں جھگڑا ہوا تو عربوں نے اسی لسانی تعلق کی بنا پر بہرام کا ساتھ دیا۔

جب بہرام گور سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے بھی عربوں کے اس احسان کو فراموش نہ کیا۔

عربوں پر فارسی ثقافت کے اثرات زمانۂ جاہلیت میں بھی کچھ کم نہ تھے۔ اہل فارس میں قدیم زمانے سے مظاہر طبعی کی پرستش کا رواج چلا آتا تھا۔ نکھرا ہوا آسمان، روشنی، آگ، پانی اور ہوا سب ان کے نزدیک لائق عبادت سمجھے جاتے تھے۔ زردشت نے آکر مجوسیت کی تعلیم دی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام سے پہلے عرب قبائل میں مجوسیت اور مظاہر قدرت کی پرستش موجود تھی۔

ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں ذکر کیا ہے کہ قبائل عرب اور بالخصوص بنو تمیم میں مجوسیت رواج پا چکی تھی اور مشہور ترین مجوسیوں میں زرارہ' حجب بن زرارہ اور اقرع بن حابس کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

فرزدق شاعر نے مہلب بن ابی صفرہ کی ہجو کہتے ہوئے اسے طعنہ دیا تھا کہ وہ آتش پرستوں کی اولاد ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بنو ازد بھی آتش پرست تھے۔

ابن رستہ نے اپنی کتاب "اعلاق النفیسہ" میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں زندقہ بحیثیت عقیدہ عرب میں فارس سے بواسطہ اہل حیرہ داخل ہو کر قریش میں رواج پا چکا تھا۔ نیز اس کا کہنا ہے کہ عربوں نے فن کتابت بھی حیرہ کے فارسی باشندوں سے سیکھا تھا۔

جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور عرب فارس اور دوسرے ملکوں میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوئے تو بہت سے اہل فارس عرب گھرانوں میں مولیٰ' غلام یا جنگی قیدی کی حیثیت میں رہنے لگے۔ یہ نو وارد لوگ اپنے ساتھ ادبی' اجتماعی اور اقتصادی اثرات لائے اور صنعت و حرفت کے علاوہ علوم و فنون میں بھی ان عجمیوں نے گہرے نقوش مرتسم کیے۔

بنو امیہ کے عہد خلافت میں عربوں کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اہل فارس اپنی ذہانت اور تہذیب کے بل بوتے پر عربوں پر چھا جائیں گے۔

چنانچہ پہلی صدی ہجری میں عربوں نے ہر چند کوشش کی کہ اپنی انفرادیت اور عربیت کو قائم رکھیں مگر وہ غیر شعوری طور پر فارسیوں سے باہمی میل جول کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔

بنو امیہ کے آخری عہد تک عربوں نے فارسی اثرات کو روکنے اور ان سے بچنے

کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن طبعی نتائج کو روکنا اور فطری اثرات سے بچنا کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔

عربوں نے اپنی ثقافت کو بیرونی اثرات سے بچانے کے لیے عجیب و غریب طریقے اختیار کیے۔ انہوں نے عجمیوں کے لیے حکمرانی اور سیادت و قیادت کے تمام دروازے بند کر دیئے۔

عربوں کے ہاں لونڈیاں اور غلام بکثرت اہل فارس میں سے تھے۔ اموی عہد میں ان کے لیے ترقی کی راہیں محدود کر کے معاشرہ میں انہیں اچھوت قرار دیا گیا تاکہ وہ کسی صورت میں بھی عربوں پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔

عرب کہا کرتے تھے کہ اگر گدھا، کتّا، یا غلام کسی نمازی کے آگے سے گزر جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

حجاج جیسا بیدار مغز حاکم اپنے عہد حکومت میں یہ حکم نافذ کرتا ہے کہ کسی غیر عرب کو نماز میں امامت کا استحقاق نہیں۔

ابن عبدربہ نے العقد الفرید میں لکھا ہے کہ بنو امیہ لونڈیوں کے بیٹوں کو خلیفہ یا امیر و حاکم مقرر نہ کیا کرتے تھے۔

اسی جذبہ کے زیر اثر حضرت امام حسنؓ کے پوتے امام محمد بن عبداللہ خلیفہ ابو جعفر منصور کو طعنہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میری رگوں میں لونڈیوں کا خون نہیں ہے اور تو اور امیر معاویہؓ جیسے دانا اور ہوشمند حکمران نے ایک دن زیاد کو بلا کر کہا کہ مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ اہل فارس عربوں کی ثقافت اور حکومت پر چھا جائیں گے۔

میں چاہتا ہوں کہ ان میں سے ایک حصہ تو بالکل ختم کر دوں اور ایسے لوگ باقی رہنے دوں جو منڈیوں کو چلاتے رہیں اور کام کاج میں عربوں کا ہاتھ بٹاتے رہیں۔ زیاد کے سمجھانے پر امیر معاویہؓ کو اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔

ان سب کوششوں اور ارادوں کے باوجود ثقافتی امتزاج رنگ لایا۔ عربوں اور فارسیوں کے امتزاج و اختلاط سے دونوں ملکوں کے حکیمانہ اقوال، ضرب الامثال، شاعری،

نثر نگاری اور عادات و خصائل کا ایک دوسرے پر بہت اثر پڑا' سیاست' معاشرہ اور عقل و فکر کوئی بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔

جب ابتدائے عہد اسلام میں عربوں اور فارسیوں کا باہمی میل جول زیادہ ہو گیا تو عرب مزدکی نظریہ زہد و قناعت کے علاوہ مزدکی نظریہ مال و دولت سے بھی متاثر ہوئے۔ مؤرخ اسلام امام طبری رقمطراز ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے اپنے زمانہ قیام شام میں دولت مند طبقہ کے خلاف ایک مہم شروع کی تھی۔

یہ مہم ایک مستقل تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ اس تحریک نے غریبوں کو سرمایہ داروں کے خلاف اتنا اکسایا کہ عوام نے دولت مندوں کے لیے جینا محال کر دیا۔

انہوں نے تنگ آکر امیر معاویہؓ والئِ شام سے شکایت کی' چنانچہ امیر معاویہؓ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو گرفتار کر کے خلیفۂ وقت حضرت عثمانؓ کے پاس مدینہ منورہ میں بھیج دیا اور اس طرح شام کی سرزمین بلکہ اسلامی خلافت کو ایک آنے والے خطرے سے بچا لیا۔

طبری کا یہ بھی کہنا ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے یہ نظریہ دولت ایک فارسی النسل شخص ابن السوداء سے لیا تھا یہ بھی معلوم ہے کہ مزدک کے ماننے والے اسلامی عہد میں بھی موجود تھے۔

ہمارے مشہور سیاح اور جغرافیہ دان الاصطخری اور ابن حوقل ہمیں بتاتے ہیں کہ کرمان کے گردونواح میں مزدک کے معتقد پائے جاتے تھے۔

یہ ثقافتی اثرات عربی ادب اور بالخصوص ابتدائی عہد اسلامی کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔ عربی زبان بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ چنانچہ آلات موسیقی اور کھانے پینے کی اشیاء کے نام تو عربوں نے فارسیوں سے بکثرت لیے۔

عیون الاخبار' التاج اور العقد الفرید وغیرہ کتابوں میں اس بات کی کافی شہادت موجود ہے کہ عربوں کے حکیمانہ اقوال اور ضرب الامثال فارسیوں سے بہت ملتے جلتے ہیں اور دونوں نے ایک دوسرے سے بکثرت چیزیں لی ہیں۔

عربوں کی موسیقی بھی فارسی ثقافت کی رہین منت ہے۔ ابو الفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی میں رقم کیا ہے کہ عربی موسیقی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں موجود تھی۔ اس وقت تک عربوں کی موسیقی نصب و حداء تک محدود تھی۔ ان کے ہاں انشاد یعنی محض اونچی آواز سے پڑھنا ہی گانا سمجھا جاتا تھا۔

عربوں کا پہلا موسیقی کار اور گیتوں کا موجد سعید بن مسجح تھا' جو ایک فارسی غلام تھا۔ کتاب الاغانی میں مرقوم ہے کہ امیر معاویہؓ نے اپنے مکان کی تعمیر کے لیے عراق سے فارسی معماروں کی خدمات حاصل کیں۔ وہ معمار تعمیر کے دوران میں فارسی گیت گایا کرتے تھے۔ سعید بن مسجح ان فارسی معماروں کے پاس آیا جایا کرتا اور ان کے گیت بڑے شوق اور توجہ سے سنتا تھا۔ جو گیت اسے پسند آجاتا وہ اسے عربی زبان میں منتقل کر دیتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اسی انداز واسلوب میں عربی گیت کہنے لگا۔

کتاب الاغانی میں یہ بھی مرقوم ہے کہ عربوں کا پہلا نغمہ منبع ابن محرز تھا جس نے چنگ و رباب کا استعمال کیا۔ یہ شخص بھی فارسی النسل تھا اور مکہ مکرمہ میں سکونت پذیر تھا۔ اپنی چنگ نوازی کی وجہ سے صناج العرب کہلایا۔

عربوں کا رسم الخط اور اسلوب نگارش بھی فارسی اثرات سے بچ نہ سکے۔ ابن خلکان اپنی کتاب وفیات الاعیان میں رقم طراز ہے کہ عبدالحمید کاتب فن کتابت اور علم وادب کا امام تھا۔ عربی رسائل و خطوط میں اطناب و طوالت اور ابتداء میں لمبی چوڑی حمد وثنا اسی کی ایجاد ہے اور ابن خلکان کا یہ بھی کہنا ہے کہ عبدالحمید کاتب موصوف انبار (فارس) کا رہنے والا تھا۔

ابو ہلال عسکری نے اپنی کتاب دیوان المعانی میں تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ عبدالحمید کاتب نے فارسی طرز انشا اور اسلوب نگارش کو عربی زبان میں رائج کیا۔

جب حکومت بنو امیہ کے ہاتھوں سے نکل کر بنو عباس کے ہاتھ آئی تو یہ ثقافتی امتزاج اور بھی بڑھ گیا۔ اس ضمن میں دیگر اسباب کے علاوہ دو چیزیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں: (۱) منصب وزارت کی ابتداء اور (۲) دارالخلافہ کی تبدیلی' یعنی دمشق کی بجائے

بغداد علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کا مرکز قرار پایا۔

تاریخ اسلام میں منصب وزارت بنو عباس کے عہد کی یادگار ہے۔ اس سے پہلے وزیر کی جگہ کاتب ہوا کرتا تھا۔

خلیفہ ابو العباس سفاح پہلا حکمران ہے جس نے وزیر مقرر کیا اور ابو سلمہ خلال پہلا وزیر ہے جس نے قلمدان وزارت سنبھالا۔ پھر اکثر بیشتر وزیر اہل فارس میں سے ہوئے۔ یہ وزیر فارسی ثقافت پھیلانے میں بڑے معاون ثابت ہوئے۔ ہر وزیر بذات خود بہت بڑا انشا پرداز ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر وزیر کے ساتھ ایک کاتب بھی ہوتا تھا جو اپنی معلومات کے اعتبار سے چلتا پھرتا دائرۃ المعارف ہوتا۔

ان کاتبوں کے نام پر ایک خاص قسم کا ادب معرض وجود میں آیا جو ادب الکاتب کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سلسلے میں ابن قتیبہ اور ابو بکر الصولی کے اسما خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پھر یہی کاتب عربی اور فارسی ثقافتوں کے امتزاج کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئے۔ ان ثقافتوں کے امتزاج نے نظریۂ ادب میں بڑی وسعت پیدا کر دی۔ عرب کہنے لگے کہ **ان الادب الاخذ من کل شی بطرف**' یعنی ہر چیز سے کچھ نہ کچھ اپنانے کا نام ادب ہے۔

عباسی وزیر حسن بن سہل کہا کرتا تھا کہ ادب کے دس شعبے ہیں: تین شعبے شہر گانی ہیں اور ان میں ساز کا بجانا' شطرنج اور پولو کے کھیل شامل ہیں۔ تین شعبے نوشیروانی ہیں جو طب' ہندسہ اور شہسواری پر مشتمل ہیں۔ تین شعبے عربی ہیں جو شعر و شاعری' نسب اور ایام' یعنی جنگی کارناموں' کو حاوی ہیں اور دسویں شعبے میں لطائف و ظرائف' قصے کہانیاں اور مجلسی باتیں شامل ہیں۔ ادب کے اسی وسیع نظریے کا اثر تھا کہ جاحظ نے کتاب البیان والتبیین' مبرد نے کتاب الکامل اور ابن قتیبہ نے عیون الاخبار جیسے ادبی شاہکار تالیف کیے۔

عباسی عہد میں ثقافتوں کے امتزاج سے فارسی ادب نے عربی ادب میں راہ پائی حکیم بزرجمہر کے اقوال و امثال عربی کتابوں میں شامل کیے گئے۔ اہل فارس کے تاریخی

قصے اور کہانیاں بھی عربی مؤلفات میں بکثرت درج ہونے لگیں۔

فارسی اور عربی ثقافتوں کے امتزاج میں دارالخلافہ کی تبدیلی کو بھی بڑا دخل ہے عباسیوں کی سیاسی دانشمندی تھی کہ انہوں نے دمشق کی بجائے بغداد کو خلافت کا مستقر بنایا۔ عراق مختلف قوموں اور ثقافتوں کا مرکز تھا۔ عراق میں کلدانی بھی بستے تھے اور سریانی بھی، لیکن فارسی ثقافت سب سے زیادہ غالب تھی۔

عباسی عہد میں زیب وزینت، کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں کے نام، نیز آلات موسیقی اور نظام حکومت کے مختلف شعبوں کے نام عربی ادب میں بغداد ہی کی یادگار ہیں۔ اسی طرح کوفہ کے لوگ فارسی ثقافت کے زیر اثر خربوزے کو بطیخ کی بجائے خربز، کدال کو مساۃ کی بجائے یال، چوک کو چہارسو، بازار کو سوق کی بجائے وازار اور کھیرے کو قثاء کی بجائے خیار کہنے لگے۔ یہ سب الفاظ یعنی خربز، یال، چہار سو، وازار اور خیار فارسی ہیں۔ جاحظ نے البیان والتبیین میں اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

یہ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ زمانۂ جاہلیت اور اموی عہد میں بھی باہمی میل جول سے کچھ فارسی الفاظ عربی زبان میں رواج پاچکے تھے، لیکن عباسی عہد میں فارسی الفاظ عربوں کے ہاں عام استعمال ہونے لگے اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہوئی کہ عربی زبان عرب کی حدود سے نکل کر تمام عالم اسلامی کی علمی اور ادبی زبان بن چکی تھی۔

مزید براں فارسی تہذیب و ثقافت اتنی ہی قدیم اور وسیع تھی جتنی کہ ان کی سلطنت و حکومت بھلا اہل فارس کو کب گوارا تھا کہ ان کی ثقافتی میراث یونہی ضائع ہو جائے، چنانچہ وطنی اور قومی جذبے سے سرشار فارسیوں نے اپنے علوم و فنون کو عربی زبان میں منتقل کرنا شروع کیا۔

فارسی علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنے والوں میں عبداللہ بن المقفع خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ابن المقفع نے خدائی نامہ کو تاریخ ملوک الفرس کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا اور طبری نے ساسانیوں پر انحصار کی تاریخ لکھتے ہوئے اپنی کتاب تاریخ الرسل و الملوک میں اسی کتاب ملوک الفرس پر انحصار و اعتماد کیا ہے۔ اسی طرح ابن المقفع نے

آئین نامہ کا ترجمہ بھی عربی زبان میں پیش کر کے عربوں کے علم و ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ امام المؤرخین مسعودی نے مروج الذہب میں رقم کیا ہے کہ ابن المقفع نے قدیم فارسی بادشاہوں کے حالات میں کتاب "الکبکین" کا بھی عربی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اور بہت سی کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ ابن سالم نے کتاب رستم و اسفندیار اور کتاب بہرام شوس کو عربی میں ترجمہ کیا۔ ادب کی دوسری کتابوں میں ہزار افسانہ کا ترجمہ خاص طور قابل ذکر ہے اور یہی کتاب الف لیلیٰ کی بنیاد بنی۔

اہل فارس کی دینی کتابوں کے ترجموں میں کتاب مزدک اور کتاب اختساتیر اور اس کی کئی شرحیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کتاب مزدک کے ذریعے عرب پہلی مرتبہ مزدک کی سیرت و عقائد سے تفصیلی طور پر آگاہ ہوئے اور کتاب اختساتیر نے انہیں زردشتی مذہب سے روشناس کیا۔

عربوں اور ایرانیوں کا باہمی میل جول اجتماعی اور معاشرتی زندگی پر بھی اثر انداز ہوا۔ قدیم اہل فارس کی طرح عباسی عہد میں جشن سال نو منانے لگے۔ اس طرح ایرانیوں کی اقتدا میں امرائے سلطنت لمبی لمبی ٹوپیاں اور کلاہ زیب سر کرتے اور گانے بجانے اور پینے پلانے کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ الجہشیاری رقم طراز ہے کہ سبز رنگ مجوسیوں اور شاہان ایران کو بڑا مرغوب اور پسند ہے۔ خلیفہ مامون کا وزیر فضل فارسی النسل ہونے کے علاوہ فارسی ثقافت کا بڑا علمبردار تھا۔ خلیفہ نے اپنے وزیر کے کہنے پر اپنے جھنڈوں اور عماموں کا رنگ سیاہ کی بجائے سبز کر دیا تھا اور اس وقت سے سبز رنگ قومی شعار بن گیا۔

اہل فارس قدیم زمانے سے گانے بجانے اور پینے پلانے کے بڑے شوقین تھے۔ اصفہانی کا کہنا ہے کہ بہرام گور نے اپنے عہد حکومت میں یہ حکم نافذ کیا تھا کہ لوگ آدھا دن خوب کام کیا کریں اور باقی نصف دن آرام اور راحت اور عیش و نشاط میں صرف کریں اور آرام و عیش کی یہ صورت تجویز کی کہ خوب کھائیں پئیں اور کھیلیں کودیں۔

بالخصوص گانے بجانے کی طرف زیادہ توجہ دیں۔ عباسی عہد میں جب فارسیوں کو اقتدار حاصل ہوا تو پھر وہی بہرام کے عہد کی وثنیت عود کر آئی۔ چنانچہ نبیذ نوشی' گانے بجانے' رقص و سرود اور عیش و نشاط کی محفلیں عام ہونے لگیں۔ ابراہیم موصلی اور اسحاق جیسے ماہرین موسیقی نے بڑی شہرت پائی۔

بشّار بن برد فارسی نے عربی غزل میں اس طرح نو ڈال کر بے راہ روی اور بد اخلاقی کی دعوت دی۔ اس کے بعد صریع الغوانی اور ابو نواس سب اسی کے نقش قدم پر چلے۔ ابو نواس نے اہل فارس کی پیروی میں غزل مذکور کو عربی میں رواج دیا۔ اس عیش و نشاط کی شاعری کے مقابلے پر ابو العتاہیہ نے فارسی میں زھد و تقویٰ اور موت و ترک دنیا کے پیغام سے لبریز شاعری عربی زبان میں پیش کی۔ نیز عربی شاعری میں دینی فکر و فلسفہ بھی ابو العتاہیہ کا رہین منت ہے۔ عربوں نے اہل فارس کو اپنا دین دیا اور ان سے اپنی زبان کا لوہا منوایا۔ اس ثقافتی امتزاج نے بے شمار علما پیدا کیے۔ جنہوں نے عربی علم و ادب اور اسلامی علم و فنون کو چار چاند لگا دیئے۔

○○○

امام ابُوحنیفہؒ اور اُن کا فکری مقام

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات اور دستور زندگی ہے۔ قرآن و حدیث کی بدولت مسلمانوں کو علم و فن اور فکر و عمل کی لازوال وراثت ملی ہے۔ اسلام نے علما اور مفکرین کی ایک ایسی عظیم الشان جماعت پیدا کی ہے، جس کی مثال نہیں ملتی۔ اسلامی تاریخ میں فکر و عمل کے ہر میدان میں ایسے عظیم المرتبت اور جلیل القدر مفکرین اور علما بکثرت نظر آتے ہیں جنھوں نے ہماری فکری تاریخ میں بڑے گہرے نقوش مرتسم کیے ہیں اور جن کی علمی کاوشیں اور فکری کارنامے ملت اسلامیہ کے لیے رہتی دنیا تک باعث عزت و افتخار ہیں۔ مسلمان مفکرین نے ایسے ایسے شاہکار اپنی یادگار چھوڑے ہیں، جنھیں دیکھ کر آج بھی علمی دنیا محو حیرت و استعجاب ہے۔اسی کاروان فکر و علم کے ایک عظیم سالار امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ ایک عظیم مفکر اور یگانہ رزگار فقیہ تھے۔ فقہی اور فکری اعتبار سے وہ بڑے بلند قامت امام اور اسلامی قانون کے ماہر تسلیم کیے گئے ہیں۔ اپنے اور بیگانے سب ان کی عظمت شان اور جلالت قدر کے قائل اور معترف ہیں۔ حضرت امامؒ زندگی بھر مسائل حیات کے ذکر و بیان اور فقہی گتھیوں کے افہام و تفہیم میں مصروف رہے۔ قیاسات و ضوابط کی وضع و تدوین اور احکام کے اسباب و علل کے استنباط اور قوانین شریعت کی توضیح و تنقیح میں اتنی خدمات انجام دیں کہ دنیا نے آپ کو قیاس و اجتہاد کا امام تسلیم کرلیا۔ آپ وفور عقل اور کثرت علم اور تقویٰ و دیانت اور ورع و امانت کے باعث بڑی امتیازی شان کے مالک ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا اسم گرامی نعمان بن ثابت ہے اور آپ امام اعظمؒ کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ ۸۰ھ / ۶۹۹ء میں عراق کے مشہور شہر کوفے میں پیدا

ہوئے۔ اس عہد میں کوفہ علم فقہ کا مرکز تھا۔ خلیفہ ثانی امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (م ۳۲ھ) کو معلم اور قاضی بنا کر کوفے بھیجا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دن رات محنت کر کے اس شہر میں قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم عام کر دی۔ آپ کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد شہرت دوام کے مالک بنے۔ آپ کے نامور شاگردوں میں حضرت علقمہ نخعیؒ، حضرت مسروقؒ ہمدانیؒ قاضی شریح کندیؒ، ابراہیم نخعیؒ اور حضرت حماد بن ابی سلیمانؒ وغیرہ شامل ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے تو علم کلام کا مطالعہ کیا۔ پھر کوفی فقہ اپنے استاد حماد بن ابی سلیمان (م ۱۲۰ھ) سے سیکھی۔ امام موصوف ریشمی کپڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ تجارتی ذہن، اقتصادی فہم و فراست اور علم الکلام نے مل کر حضرت امام میں صحیح اور پختہ رائے پیدا کر دی تھی۔ معاملہ فہمی، جریت فکر اور آزادی رائے نے آپ کو یہ صلاحیت عطا کی کہ مسائل جدیدہ میں قیاس سے کام لے کر احکام شرعیہ کو عملی زندگی میں جاری کر سکیں اور اسی وجہ سے آپ کے مدرسہ فکر کو مذہب اہل الرائے کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

بقول ابن عبدالبر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: جب کوئی مسئلہ قرآن و سنت میں نہ ملے تو میں اقوال صحابہ پر غور کرتا ہوں اور اقوال صحابہ کے ساتھ کسی کے قول کو قابل اعتماد نہیں سمجھتا۔ ابراہیمؒ، شعبیؒ، ابن سیرینؒ، عطاءؒ اور سعیدؒ بن مسیب نے بھی اپنے اپنے عہد میں اجتہاد کیا۔ میں بھی انہی کی طرح اجتہاد کرتا ہوں۔

امام موصوف کے تبحر علمی کی داد دیتے ہوئے امام شافعیؒ نے فرمایا کہ جو علم فقہ سیکھنا چاہے وہ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا محتاج ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بڑے ذہین تھے، سرعت فہم، میں تو آپ کی نظیر نہیں ملتی۔ جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو فوراً

جواب دیتے گویا کہ پہلے سے جواب سوچ رکھا تھا۔

بنو امیہ کے آخری عہد میں عراق کے گورنر ابن ھبیرہ نے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو عہدۂ قضاۃ (چیف جج) پیش کیا تو آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح عباسی عہد میں خلیفہ ابو جعفر منصور نے بھی آپ کو قاضی (جج) مقرر کرنا چاہا تو پھر بھی آپ نے انکار کر دیا۔ آپ نے زدو کوب کی تکالیف اور حبس دوام کے آلام و مصائب کو برداشت کرنا گوارا فرمایا، لیکن سرکاری عہدوں کو قبول نہ کیا اور قید خانے میں ۱۵۰ھ / ۷۶۷ء میں انتقال فرمایا۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ احادیث کے بارے میں بڑے محتاط تھے اور صرف وہی احادیث قبول کرتے تھے جو مستند اور پختہ ذرائع سے پہنچتی ہوں۔ آپ کی احتیاط کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ جس دور میں گزرے ہیں وہ دور سیاسی فتنوں اور سازشوں کا دور تھا۔ اموی سلطنت کو ختم کر کے عباسی حکومت کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ خاندانوں اور جماعتوں کے سامنے اپنے اپنے مفادات تھے اور عوام کے جذبات سے کھیلنے کے لیے ہر گروہ جعلی اور وضعی حدیثیں پیش کر کے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس گڑ بڑ اور انتشار کے زمانے میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی احتیاط سے کام لیا، لیکن اس کے باوجود آپ کے رفقا اور تلامذہ نے آپ کے ایسے پندرہ سولہ مجموعے روایت کیے ہیں جن کے راویوں کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم تک پہنچتا ہے۔ ان مجموعوں کو قاضی القضاۃ ابو المئوید خوارزمی (م ۶۵۵ھ) نے جامع المسانید میں جمع کر دیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد رشید میں امام ابو یوسفؒ (۱۱۳ تا ۱۸۲ھ) امام محمدؒ (۱۳۲ تا ۱۸۹ھ) اور امام زفرؒ (۱۱۰ تا ۱۵۸ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ بغداد میں عہدۂ قضا پر فائز رہے۔ خلیفہ ہارون الرشید کی خلافت میں چیف جج مقرر ہوئے۔ ان کے عہد قضا میں اکثر قاضی حنفی مسلک کے مقرر ہوتے رہے۔ اس لیے حنفی مذہب کو فروغ پانے کا موقع مل گیا۔ امام ابو یوسفؒ نے کئی مسائل میں صحیح احادیث کی بنا پر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف بھی کیا۔ ان کے اقوال فقہ حنفی کی کتابوں اور

امام شافعی کی کتاب الام کے آخر میں مذکور ہیں۔ ان کی ایک گراں قدر تصنیف کتاب الخراج بھی ہے۔ اس کتاب میں امور مالیات اور محصولات وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب خلیفہ ہارون الرشید کے ایماپر لکھی گئی تھی۔

امام محمد بن حسن شیبانیؒ نے ایک طرف تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے تحصیل علم کیا اور دوسری طرف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مدینہ منورہ میں پہنچ کر علم حدیث پڑھا۔ اور امام اوزاعیؒ سے بھی حدیث سنی۔ آپ حنفی فقہ کی تدوین اور استخراج مسائل کے لیے مشہور ہیں۔ آپ کی تصانیف میں المبسوط' الجامع الصغیر' الجامع الکبیر' کتاب السیر الکبیر' کتاب السیر الصغیر' اور الزیادات مشہور ہیں۔ ان کتابوں کو علمائے احناف کے ہاں کتب ظاہر الراویۃ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے' کیونکہ یہ کتابیں معتبر راویوں نے امام محمد سے روایت کی ہیں۔ ابوالفضل حاکم الشہیدؒ (م ۳۴۴ھ) نے ان چھ کتابوں کو اپنی تالیف کتاب الکافی میں جمع کر دیا ہے اور اس کتاب کی مفصل شرح امام سرخسی نے اپنی مشہور کتاب المبسوط میں کی ہے' یہ شرح تیس جلدوں میں حیدر آباد سے چھپ چکی ہے۔

امام محمد نے امام مالک کے شہرۂ آفاق مجموعہ حدیث الموطا کو بھی اپنے انداز میں ترتیب دیا ہے۔

امام زفر خالص عربی النسل عالم ہیں۔ قیاس میں بڑے ماہر تھے۔ ان کے والد بصرہ یا بقول ابن الندیم اصفہان کے والی تھے۔ وہ بڑے وجیہ اور فصیح تھے۔ دلیل و حجت میں استاد مانے گئے ہیں۔ قیاس میں اپنا نظیر و سہیم نہیں رکھتے تھے۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اہل حدیث علما و فقہا سے میل جول کی بدولت فقہی مسائل میں اختلاف اور محدثین کے اختلاف کو ایک حد تک کم کر دیا اور صحیح احادیث پر عمل پیرا ہو کر رائے اور قیاس کے دائرے کو تنگ کرنے کی کوشش کی۔ حنفی مدرسۂ فکر میں حدیث کو رواج دینے کا سہرا انہی دو بزرگوں کے سر ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فضل، عقل و خرد، فہم و شعور اور فکر و نظر کا چرچا ان کی زندگی ہی میں عام ہو گیا تھا۔ آپ کے معاصرین آپ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ آپ کے ہمعصر صوفی بزرگ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ عظیم فقیہ، کثیر المال اور صاحب جود و کرم بزرگ تھے۔ رات دن مطالعہ کتب میں مصروف رہتے۔ جب حلال و حرام کا مسئلہ پیش آتا تو حق گوئی سے وضاحت فرماتے۔ سلطان کے مال سے آپ کو نفرت تھی۔

جعفر بن ربیع کہتے ہیں کہ میں پانچ سال تک آپ کی خدمت میں حاضر رہا۔ میں نے آپ سے زیادہ کم گو کسی کو نہیں دیکھا۔ جب مسائل فقہ پر گفتگو فرماتے تو علم کا بحر مواج نظر آتے اور آواز میں گھن گرج پیدا ہو جاتی۔

آپ کے ایک اور ہم عصر ابن وکیعؒ فرماتے ہیں: "امام ابو حنیفہ امین اور بہادر تھے۔ خدا کی رضا کو ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے۔ راہ خدا میں تلوار کے زخم بھی برداشت کر لیتے تھے۔ بڑے نیک آدمی تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے اور ان سے راضی ہو۔"

اسی طرح دوسرے بے شمار معاصرین آپ کے علم و فضل، جلالت و عظمت اور فکر و نظر کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں عظیم فقیہ اور نابغۂ روزگار قرار دیتے ہیں۔

آپ کی علمی اور فکری خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ آپ متکلمین سے بحث و مباحثہ کرتے، اہل بدعات کی تردید کرتے، مخالف فرقوں سے مناظرہ کرتے، علم کلام کے مسائل پر اپنی قیمتی رائے کا اظہار فرماتے، علم حدیث کے الفاظ کی نسبت سے احکام کے علل و اسباب استنباط کرتے اور اصلی مفہوم تلاش کرتے، علت کا استخراج کرتے، اشباہ و نظائر سے اس کا ربط قائم کرتے اور اس کے اصول و ضوابط معلوم کر کے دیگر مسائل کے لیے اسے اساس قرار دیتے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ آپ اپنے شاگردوں کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ ان کی مالی اعانت فرما کر انہیں زندگی کی ضرورتوں سے بے نیاز کر دیتے۔ شادی بیاہ کے لیے وسائل مہیا کر کے ان کی شادی کر دیتے۔ ہر

شاگرد کی مالی کفالت فرماتے تھے۔ آپ اس بات کا بھی خیال رکھتے تھے کہ طلبہ میں علمی غرور و نخوت پیدا نہ ہونے پائے۔

○○○

حجاج بن یوسف : تاریخ و تنقید کی روشنی میں

حجاج بنو امیہ کے عہد میں پروان چڑھا اور انہیں کی سلطنت اور حکومت کے استحکام کا باعث ہوا اور سوئے اتفاق ملاحظہ ہو کہ بنو امیہ کے عہد اور خلافت راشدہ کے زمانے میں، زمانی فاصلہ تو کوئی زیادہ نہیں، لیکن حالات اور انقلابات کی برق رفتاری کو کیا کہیئے کہ دونوں زمانوں کی اخلاقی قدروں میں اچھا خاصا بُعد اور تفاوت نظر آتا ہے۔ خلافت راشدہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب اور ارباب اختیار کے تقدّس نے مقدس تر بنا دیا۔ اگر ہمیں بنو امیہ کے عہد میں خلفائے راشدین کا سا خلوص اور بے لوث جذبۂ خدمت خلق مفقود نظر آتا ہے تو یہ چنداں تعجب اور حیرت کی بات نہیں جب ہم انسانی فطرت کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہیں، تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جوں جوں لوگ اپنے قائد سے زمان و مکان کے اعتبار سے دور ہوتے جاتے ہیں ان کے خلوص اور عمل میں کمی واقع ہوتی جاتی ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ بنو امیہ کو پیش رو ایسے ملے جن کی نظیر محال ہے، ورنہ وہ کونسی خوبی ہے جو بنو امیہ میں نہ تھی اور ان میں کونسی برائی تھی جو ان کے جانشینوں (بنو عباس) میں بدرجہ اتم نہ پائی گئی، لیکن اس کے باوجود ہمیں بنو عباس سے عقیدت ہے اور بنو امیہ سے نفرت۔

بنو امیہ کی غیر ہردلعزیزی کی دوسری وجہ یہ ہوئی کہ ان کے عہد میں چند ایسے ناخوشگوار واقعات پیش آگئے جن کی وجہ سے وہ بدنام ہو گئے۔ اس سلسلے کی آخری کڑی کربلا کا افسوسناک حادثہ المیہ تھا۔

اس ضمن میں ہم بھی مورد الزام ٹھہرتے ہیں کہ ہم نے تاریخ کو ایک آنکھ سے نہیں دیکھا، بلکہ جب ہم اسلامی تاریخ کا مطالعہ شروع کرتے ہیں تو صدر اول یعنی خلافت

راشدہ کے عہد کو تقدس اور معصومیت کو عینک سے دیکھتے ہیں، حالانکہ وہاں بھی ہمیں کچھ کم افسوسناک واقعات دکھائی نہیں دیتے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت، جنگ جمل، جنگ صفین، واقعہ نہرواں وغیرہ اتنے ہی المناک اور کرب انگیز ہیں جتنا کوئی عہد امیہ کا بڑے سے بڑا ناخوشگوار واقعہ، لیکن ہمارا انداز اور رجحان طبیعت ملاحظہ ہو کہ جب امیر معاویہؓ کے عہد حکومت پر نگاہ پڑی تو فوراً تعصب کی عینک لگا لی اور اتنی کڑی تنقید شروع کر دی کہ گویا ہم انسانوں کی تاریخ نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ چند بے جان و بے روح لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ جہاں انسان بستے ہوں وہاں رائے کا اختلاف، خواہشات کا تفاوت اور لائحہ عمل کا فرق ضروری ہے۔ حصول مقصد کے لیے قربانی، خون ریزی، جنگ اور قتل و غارت گری فطرت انسانی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے اور یہ چیز ہمیں ہر ملک ہر خاندان اور ہر حکومت میں نظر آتی ہے۔

بنو امیہ سے نفرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تاریخ نویسی اور سیرت نگاری عباسیوں کے عہد حکومت میں شروع ہوئی۔ یا یوں کہیے کہ تاریخ و سیرت کی کتابیں جو ہم تک پہنچی ہیں وہ سب بنو عباس کے زمانے میں لکھی گئیں۔ بنو عباس اور بنو امیہ کی دشمنی کا تقاضا یہ تھا کہ کوئی مؤرخ اموی خلفا کی تعریف کے جرم کا مرتکب نہ ہو۔ عباسی خلفا کی ناراضگی اور عتاب مول لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جب حالات یہ ہوں تو ہم کس طرح توقع کر سکتے ہیں کہ کوئی مؤرخ اموی حاکموں سے انصاف کر سکتا تھا۔

حجّاج کی اہمیت

بہرکیف حجاج بن یوسف کی تاریخ فرد واحد کی تاریخ نہیں، بلکہ اس پورے عہد کی تاریخ ہے۔ اگر حجاج جیسا بلند پایہ عسکری مدبر اور سیاسی مفکر اسلام کو نہ ملتا تو اسلامی تاریخ کے وہ اوراق جنہیں ہم سنہری اوراق کے نام سے یاد کرتے ہیں آج ہمارے سامنے نہ ہوتے اور اسلامی فتوحات کا شاندار سلسلہ بالکل مفقود نظر آتا۔ حجّاج بیک وقت قائد عسکر بھی ہے اور سیاسی مفکر بھی۔ اس کی سیمابی روح، عقابی نظر، عسکری دل اور انتظامی دماغ ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ بہت بلند پایہ ادیب اور اقلیم خطابت کا تاجدار ہے۔

اس کی شعلہ مقالی اور آتش بیانی کی دھوم سارے عالم میں ہے۔ وہ اپنے زور بیان اور الفاظ کے جادو سے سامعین کو مسحور کرلیتا تھا۔ وہ ایک عادل حاکم ہے' جو باغیوں سے کسی قسم کی رعایت روا نہیں رکھتا۔ وہ شفیق فرما نروا ہے جسے اپنی رعایا کی حاجتیں اور ضرورتیں بے چین کردیتی ہیں۔ وہ میری اور آپ کی طرح کا ایک انسان ہے جو خوش بھی ہوتا ہے اور ناراض بھی۔

آج سے ایک ہزار تین سو ساٹھ برس پہلے یعنی ۴۱ھ میں حجاز کے مشہور شہر طائف میں بنو ثقیف کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا' جس کا باپ سکول میں بچوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ عربی رسم و رواج کے مطابق حجاج کو تعلیم و تربیت دی گئی۔ جوان ہوا تو باپ کا پیشہ اختیار کیا اور تھوڑے عرصے میں اپنی ذہانت و قابلیت اور نظم و نسق کی وجہ سے مشہور ہو گیا۔

مذہبی اور سیاسی پس منظر کا جائزہ

جب حجاج نے آنکھیں کھولیں تو تقریباً سارے عرب میں ایک گوناگوں سیاسی انتشار پھیلا ہوا تھا۔ حکومت کی کوتاہیاں' عوام کی بے باکیاں' اکابر کی چشم پوشی' علما کی خاموشی اور صلحا کی خودفراموشی نے عربوں کے سیاسی اور دینی اتحاد کو پارہ پارہ کردیا تھا۔ اتحاد کے خیال کے فقدان نے ذہنی انتشار اور عملی کوتاہی پیدا کردی تھی۔ تقدس کے غلط تصوّر اور حکومت کی بے جا نرمی نے حکومت کے اقتدار کو نہ صرف کم کردیا' بلکہ حکومت کے کل پرزوں کو کمزور سے کمزور تر کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فتنوں اور سازشوں نے سر اٹھایا۔ کسی خلیفہ وقت کو گھر کی چاردیواری میں محصور کر کے شہید کردیا اور کسی کو صبح کی تاریکی میں مسجد میں داخل ہوتے ہوئے ایسی بری طرح زخمی کیا کہ وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔

ابھی حجاج کی جوانی انگڑائیاں لے رہی تھی کہ مختلف سیاسی اور مذہبی تحریکوں نے شیرازہ ملت کو کچھ اس طرح پریشان کردیا کہ اسلامی سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ تندو تیز جھونکوں کی تاب نہ لاکر بجھا چاہتا تھا۔ عقل محو حیرت ہو کر رہ گئی۔ ضرورت اس بات کی

تھی کہ عشق میدان ابتلا میں کودے اور تمام فتنوں کو جو دین اور حقوق کے نام پر کھڑے کیے گئے تھے کچل کر رکھ دے۔

یہ غیر موزوں نہ ہو گا کہ حجاج پر کچھ کہنے سے پہلے چند ان سیاسی اور مذہبی تحریکوں کا ذکر کر دیا جائے جن سے حجاج کو سابقہ پڑنے والا تھا اور اگر حجاج سے پہلے امیر معاویہؓ کی دانشمندی' تدبر اور سیاسی بصیرت آڑے نہ آتی تو شیرازۂ ملت اس طرح بکھر جاتا کہ ایک ایک ورق فتنوں کی نذر ہو جاتا اور پھر حجاج کے سنبھالے بھی نہ سنبھل سکتا۔

خلیفہ عبدالملک بن مروان کی حکومت کو ایک طرف تو خارجیوں سے مقابلہ کرنا پڑا جو ایک نیم مذہبی اور نیم سیاسی گروہ تھا جو حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں پیدا ہوا۔ حکومتوں کی سخت گیر پالیسی کے باوجود ان کا فتنہ فرو نہ ہو سکا۔ اس گروہ کے سیاسی عقائد میں چند چیزیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں: مثلاً" (۱) دنیا میں خدا کی بادشاہی اور حکومت کا قیام ان کا مقصد اولین تھا۔ ان کا قومی نعرہ اِنِ الحُکمُ اِلّا للّٰہ' یعنی صرف خدا کی حکومت تھا؛ (۲) ان کے نزدیک خلافت قریش تک محدود نہ تھی بلکہ ہر مسلمان خواہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو' خلیفہ منتخب ہو سکتا تھا' (۳) اس گروہ کی رائے تھی کہ اگر خلیفہ احکام خدا کی پابندی اور اطاعت نہ کر سکے تو اسے معزول کر دیا جائے۔

اس گروہ نے بنو امیہ اور بنو عباس کے خلاف ہمیشہ علم بغاوت بلند کیے رکھا' کیونکہ دونوں خاندان خارجیوں کی نظر میں خلافت اور حکومت کے حقدار نہ تھے۔ خارجیوں سے مختلف فرقے اور مدارس فکر پیدا ہو گئے اور مذہبی اور اعتقادی امور میں بھی دخل دینے لگے ان فرقوں میں ازارقہ (اتباع نافع بن الازرق) نجدات (اتباع نجدہ بن عامر) (اباضیہ) اتباع عبداللہ بن اباض تمیمی صفریہ (اتباع زیاد بن الاصفر)' اور شراۃ (وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ) ان لوگوں میں ایسے بھی تھے جو حضرت علیؓ اور عثمانؓ کو کافر سمجھتے تھے۔ ان کے عقائد سے قطع نظر یہ لوگ بڑے بہادر' جانباز اور نڈر واقع ہوئے تھے۔ بڑی بے جگری سے لڑتے۔ حکومت وقت کے لیے ہر آن ایک مستقل خطرہ تھے۔

اس کے بعد دوسرا اہم سیاسی اور مذہبی گروہ' جس سے بنو امیہ کو دوچار ہونا پڑا' شیعوں کا تھا جن کا خلافت کے مسئلے میں اختلاف رائے شروع ہوا اور حادثہ کربلا اس اختلاف کی آخری کڑی ثابت ہوا۔ بنو امیہ کے خلاف یہ سب سے بڑا محاذ تھا۔ نام کے تقدس' مقصد کی جاذبیت اور رسالت سے قرابت داری نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔

ان تحریکوں کے علاوہ ایک سیاسی گروہ بھی اپنے حقوق کی خاطر بنو امیہ سے برسر پیکار نظر آتا ہے۔ جب غیر عربی لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوا کہ ان کے حقوق و واجبات کیا ہیں؟ عرب اپنے آپ کو سب سے بلند و بالا اور افضل و اعلیٰ سمجھتے تھے۔ اسلام کے بار بار اعلان مساوات کے باوجود عربوں میں قومی عصبیت کا جذبہ موجود رہا۔

ان جماعتوں کے علاوہ ایک اور بہت بڑا خطرہ تھا' جس سے خلیفہ عبدالملک کو دوچار ہونا پڑا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حجاز میں' جو اسلامی روایات کا مرکز تھا' اپنے لیے خلافت کا اعلان کر دیا۔ حجاز کی مرکزیت اور اس کا تقدس ابن زبیرؓ کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت داری ان کے ارد گرد صحابہ کرامؓ کا ہجوم۔ یہ سب چیزیں عبدالملک کی خلافت کو ختم کرنے کی کافی ضمانت تھیں۔

جمہور کی طبیعتیں ان اہم حوادث و واقعات کے اثرات سے کس طرح محفوظ رہ سکتی تھیں۔ حکومت کے خلاف بددلی' اطاعت و فرماں برداری میں کوتاہی' خلیفہ وقت کی خفت' ذمہ داری کے احساس کا فقدان' فتنہ و فساد کی طرف میلان' سازشوں کا شوق اور حکام کی تذلیل و توہین زندگی کا معمول بن چکا تھا۔

آپ غور فرمائیے کہ ان تمام حالات کے پیش نظر انتظام امور سلطنت' شہری امن و حفاظت اور اسلامی حکومت کی حدود کی توسیع کے لیے کس آہنی عزم اور پتھر دل منتظم کی ضرورت تھی۔ کیا ایک معمولی قابلیت کے انسان کے لیے ممکن تھا کہ وہ ان تمام مخالف قوتوں سے ٹکرائے اور کامیابی اس کے قدم چومے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر حجاج جیسا سخت گیر اور لائق منتظم اپنی مخصی خدمات پیش نہ کرتا تو اپنوں کی سازشیں اور غیروں کی

عداوتیں اسلامی سلطنت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتیں۔

اس لمبی، لیکن ضروری، تمہید کے بعد اب حجاج کی زندگی کے چند پہلو بے نقاب کیے جاتے ہیں۔ جنہیں تعصب اور غلط ذہن نے کئی پردوں میں چھپا رکھا ہے۔

مختصر حالات زندگی

حجاج نے درس و تدریس چھوڑ کر حکومت کی نوکری اختیار کر لی اور معمولی سپاہی کی حیثیت میں زندگی کا آغاز کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ پولیس کا ذمہ دار افسر بن کر خلیفہ عبدالملک کے بھائی ابان بن مروان کے ساتھ فلسطین چلا گیا۔ ان دنوں ابان فلسطین کا گورنر تھا۔ (انساب الاشراف)۔ بعد ازاں حجاج خلیفہ عبدالملک کے وزیر روح بن زنباع کے ساتھ پولیس افسر کی حیثیت میں عرصہ تک کام کرتا رہا۔ اس دوران میں حجاج نے اپنی دیانت داری، لیاقت، حسن انتظام، بے لوث خدمت اور اعلیٰ نظم و نسق کا ایسا شاندار ثبوت دیا کہ روح بن زنباع حجاج کی خوبیوں کا بے حد معترف اور مدّاح ہو گیا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ خلیفہ عبدالملک نے اپنے وزیروں کے سامنے شکایت کی کہ بعض اوقات لشکروں کی روانگی، سفر اور منزل پر پہنچ کر قیام کرنے میں بہت سی بے قاعدگیاں ہو رہی ہیں اور بتایا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو لشکر روانہ ہو جانے کے بعد بھی خیموں میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ روح بن زنباع نے کہا اے امیرالمومنین! میرے ماتحت ایک پولیس افسر ہے۔ جس کا نام حجاج بن یوسف ہے۔ اگر امیرالمومنین لشکر کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دیں تو وہ سب کچھ درست کر لے گا۔ خلیفہ اس بات پر رضامند ہو گیا۔ چنانچہ فوجوں کا نظم و نسق حجاج کے سپرد کر دیا گیا۔ جب فوجی سپاہیوں نے حجاج کا نام سنا تو چوکنے ہو گئے اور بے قاعدگیوں کو خیرباد کہہ دیا۔ فوج کے ایک دستے میں روح بن زنباع کے کچھ دوست احباب بھی تھے اور روح بن زنباع کی دوستی کا خیال ان کے سر پر سوار تھا۔ ایک دن حجاج نے دیکھا کہ لشکر کی روانگی کے بعد کچھ لوگ پیچھے رہ گئے ہیں۔ حجاج ان کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ کھانا کھانے میں مشغول ہیں۔ حجاج نے باز پرس کی تو انہوں نے ٹال مٹول سے کام چلانا چاہا۔ حجاج نے فوراً آنکھیں بدل لیں اور نظم و نسق اور ضبط و وقار کو قائم رکھنے کے خاطر

سزا کے طور پر ان پیچھے رہ جانے والوں کو کوڑے لگوائے۔ انہیں ذلیل و رسوا کیا گیا اور سارے لشکر میں ان کی تشہیر کرائی گئی۔ ساتھ ہی روح بن زنباع اور اس کی ساتھیوں کے خیموں کو نذر آتش کر کے راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ روح یہ دیکھ کر لال پیلا ہو گیا۔ مگر کچھ پیش نہ گئی۔ آخر خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر زار وقطار رویا۔ خلیفہ نے پوچھا کہ کیا بات ہوئی۔ روح نے درد بھری آواز میں عرض کیا کہ ایک دن وہ بھی تھا کہ حجاج میرے نوکروں کے زمرے میں شمار ہوتا تھا۔ آج اس کو اتنی جرأت ہو گئی ہے کہ اس نے میرے خیموں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا ہے۔ خلیفہ عبدالملک نے حکم دیا کہ حجاج کو میری خدمت میں پیش کیا جائے۔ جب حجاج کو حاضر کیا گیا تو خلیفہ نے پوچھا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ حجاج نے عرض کیا کہ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ خلیفہ نے دریافت کیا کہ آخر یہ خیمے کس نے جلائے ہیں؟ حجاج نے جواب دیا' امیر المومنین نے۔ بخدا! میرا ہاتھ خلیفہ کا ہاتھ ہے اور میرا کوڑا خلیفہ کا کوڑا' پھر یہ بھی عرض کیا کہ میں نے یہ سب کچھ خلیفہ کا اقتدار اور فوجی وقار قائم رکھنے کی خاطر کیا ہے۔ اب امیرالمؤمنین کو اختیار ہے کہ روح بن زنباع کے نقصان کی تلافی کر دے اور ایک خیمہ کے بدلے دو خیمے اور ایک غلام کے بدلے دو غلام عطا کر دے' لیکن جو کچھ میں نے کیا ہے وہ نظم و نسق کے لیے ازبس ضروری تھا۔ (العقد الفرید)۔

ایک گودڑی میں سو فقیروں کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے' لیکن ایک ملک اور ایک سلطنت میں دو بادشاہوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ اوپر اشارتاً ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حجاز میں اپنی خلافت قائم کر رکھی تھی۔ عبدالملک ہر وقت اسی فکر میں رہتا تھا کہ ابن زبیرؓ سے کس طرح مخلصی پائی جائے۔ جیش بن دلجہ کی قیادت میں ایک لشکر عبداللہ بن زبیرؓ سے لڑنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ اس لشکر میں حجاج اور اس کا باپ یوسف دونوں شریک تھے۔ جنگ شروع ہوئی۔ فریقین زور آزمانے لگے۔ ختنف اور اس کے کچھ ساتھی گھات میں چھپے بیٹھے تھے۔ موقع پا کر عبدالملک کے لشکر پر پل پڑے۔ سالار جیش کو قتل کر دیا اور اس کے لشکریوں کو بڑی بے دریغی سے قتل کرنے لگے۔

عبدالملک کے بے شمار سپاہی میدان جنگ میں کام آئے۔ پانچ سو سے زیادہ جنگی قیدی بنا لیے گئے اور تین صد کے قریب بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ نکلے۔ ان بچ نکلنے والوں میں حجاج اور اس کا باپ یوسف بھی شامل تھا۔ باپ بیٹا ایک گھوڑے پر سوار ہو کر اسے برابر تیس میل تک سرپٹ دوڑاتے چلے گئے۔ آخر گھوڑے کی طاقت نے جواب دے دیا۔ تیس میل کا فاصلہ طے کر چکنے کے بعد بھی حجاج کے دل و دماغ پر دشمن کا بھوت سوار تھا اور اسے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ دشمن کے تیر ہمارے شانوں کو زخمی کر رہے ہیں۔ حجاج کو اس ہزیمت کا بڑا قلق ہوا۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ یہ ہزیمت کتنی شرمناک اور ذلت آمیز ہے (انساب الاشراف)۔

اس ہزیمت نے دیر تک حجاج کو بے چین کیے رکھا۔ وہ ہر چند یہ چاہتا کہ اس کا انتقام جلد از جلد لیا جائے۔ ۷۳ھ میں ایک دن حجاج نے خلیفہ عبدالملک سے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں عبداللہ بن زبیرؓ کی کھال کھینچ رہا ہوں۔ میری درخواست ہے کہ مجھے اس کے مقابلے پر روانہ کیا جائے۔ خلیفہ رضامند ہو گیا۔ حجاج ایک ہزار کا لشکر جرار لے کر طائف پہنچا۔ وہاں پہنچنے کے بعد خلیفہ کی طرف سے لڑائی شروع کرنے کا حکم بھی مل گیا۔ حجاج نے ابن زبیرؓ کا محاصرہ کر کے اسے قتل کر دیا (کتاب المعارف' لابن قتیبہ)

اس فتح کے بعد حجاج تین سال تک حجاز کا گورنر رہا اور ہر سال حج کے موقع پر امامت کے فرائض انجام دیتا رہا۔

ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں ذکر کیا ہے کہ سب سے پہلے حجاج کو تبالہ کا والی بنا کر بھیجا گیا۔ جب حجاج وہاں پہنچا تو جگہ پسند نہ آئی' اسے چھوڑ کر واپس چلا آیا۔

ابن عبدربہ نے العقد الفرید (۲:۲۶۷) میں بیان کیا ہے کہ جب عبدالملک بن مروان کی خلافت اور بیعت کا اعلان ہو چکا تو اس نے مصعب بن زبیرؓ پر حملہ کی ٹھانی۔ اہل شام کی خواہش تھی کہ وہ اس جنگ میں اپنا دامن آلودہ نہ کریں۔ حجاج کو شامیوں کا الگ تھلگ رہنا پسند نہ تھا۔ وہ اسے سیاسی مصلحت کے خلاف سمجھتا تھا۔ اس نے خلیفہ سے درخواست کی کہ مجھے وہاں بھیجا جائے۔ حجاج نے شام پہنچ کر لوگوں کو لڑائی کے لیے

بھرتی کرنا شروع کیا۔ حجاج نے یہاں بھی رعب اور دبدبے سے کام لیا اور جو آدمی جنگ میں شرکت کرنے سے گریز کرتا ہوا بھاگ جاتا تو حجاج اس کے مکان کو نذر آتش کر دیتا۔

حجاج کی عمر تیس برس کی تھی کہ اسے عراق جیسے فتنہ انگیز اور شوریدہ سر علاقے کا گورنر بنا دیا گیا۔ عراق اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اسے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ تمام بیرونی ممالک سے تعلقات قائم کرنے اور مخالف و برسر پیکار علاقوں سے جنگ لڑنے کے لیے بڑا موزوں اور مناسب مقام تھا۔ اسلامی سلطنت کی حدود کی توسیع یہیں بیٹھ کر سوچی جاتی اور تمام اسلامی فوجوں کی رہنمائی اور امداد اسی جگہ سے کی جاتی تھی' لیکن غیر موافق حالات نے اس اہم فوجی مرکز کو فتنوں اور سازشوں کا گھر بنا دیا تھا۔ ہر بغاوت اور ہر فتنہ اسی سرزمین سے اٹھتا۔ حجاج نے اس پر آشوب و فتنہ انگیز صوبے میں برابر بیس برس تک حکومت کی اور اس کامیابی کے ساتھ کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بیس سال کی اس طویل مدت میں حجاج نے بہترین انتظامی قابلیت کا ثبوت دیا۔ تمام داخلی فتنوں کو کچل کر رکھ دیا اور سازشوں کو اس طرح دبایا کہ ان میں پھر اٹھنے کی سکت باقی نہ رہی۔ وہ فوجی قیادت میں اتنا ماہر ثابت ہوا کہ صف اول کے قائدین میں شمار ہونے لگا۔ اس کے زمانے اور اس کی نگرانی میں بے شمار علاقے فتح ہوئے جن میں سندھ' خراسان' طالقان' نسف' فرغانہ' سمرقند' بخارا' سجستان' خوارزم' ماوراءالنہر انطاکیہ اور اندلس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حجاج محض ایک سیاسی مبصر اور بہترین منتظم ہی نہ تھا' بلکہ بڑا جانباز فوجی سپاہی اور عسکری مدبر بھی تھا۔ عراق میں بیٹھ کر سندھ میں لڑنے والے اسلامی لشکروں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ محمد بن قاسم کو ہدایات بھیجی جا رہی ہیں۔ اتنے فاصلے پر ہوتے ہوئے بھی سپاہیوں کی نقل و حرکت پر کڑی نگرانی ہے۔ انہیں تفصیلی احکام بھیجے جا رہے ہیں۔ داخلی فتنوں اور بغاوتوں کی سرکوبی کے لیے لشکروں کی قیادت خود کرتا ہے۔ اس کی مہموں اور معرکوں کی فہرست تو بڑی طویل ہے' لیکن چند واقعات کی طرف اشارہ ضروری ہے:

داخلی فتنے

حجاج کو مشکلات و مصائب کے پہاڑوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بڑے بڑے جلیل القدر بزرگان قوم اور عالمان دین کے عتاب سے دوچار ہوا، مگر تمام مخالفتوں کے باوجود اس کے عزم اور ارادے میں سرمو فرق نہ آنے پایا۔ ہر مہم کے بعد اس کی ہمت اور بلند نظر آتی ہے اور ہر معرکہ اس کے ارادے کو پہلے سے زیادہ مضبوط و محکم بنا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حجاج نے روز اوّل سے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر جمہور اور اکابر شرافت و وفاداری اور فرمانبرداری کا اظہار کریں گے تو حسن سلوک اور نظر عنایت کے حق دار ٹھہریں گے اور اگر دشمنی، سرکشی اور عناد سے کام لیں گے تو تلوار اور انتقام کے مستحق ہوں گے۔ (العقد)۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حجاج زندگی بھر اس طریق کار پر عمل پیرا رہا اور یہی لائحہ عمل اس کی کامیابی اور بلندی کا ضامن تھا۔

۶۶ھ میں مختار بن ابی عبید ثقفی نے سرزمین کوفہ میں علم بغاوت بلند کیا۔ حجاج گھوڑوں کو اڑاتا ہوا وہاں پہنچا اور باغیوں کو مناسب سزا دی۔ ۷۱ھ میں مصعب بن زبیر کی لشکر کشی کی خبر پہنچی تو حجاج وہاں بھی صف آرا نظر آتا ہے۔ ۷۵ھ میں شبیب خارجی نے ایک لشکر جرّار جمع کر لیا۔ نڈر حجاج نے خبر ملتے ہی اسے جا لیا۔ کئی خون ریز معرکوں کے بعد شبیب ہزیمت خوردہ ہو کر بھاگا اور پل پر سے گر کر دریا میں ڈوب مرا۔ اسی سال عبدالرحمٰن بن الاشعث نے علم بغاوت بلند کیا۔ ابن اشعث آندھی کی طرح چھا گیا۔ برق رفتاری کے ساتھ کوفہ اور خراسان پر قبضہ کر لیا۔ ان کامرانیوں اور ظفرمندیوں نے ابن اشعث کو اور سرکش بنا دیا۔ متذبذب اور کمزور طبیعت لوگ، جو ہر وقت کسی موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک جم غفیر کی شکل میں اس کے ساتھ ہو لیے۔ بھلا حجاج کیسے خاموش تماشائی بن سکتا تھا؟ محکم ارادہ لے کر اٹھا اور اس بے جگری سے لڑا کہ چند ہی معرکوں میں ابن اشعث کے دانت کھٹے کر دیئے۔ ابن اشعث شکست کھا کر جان بچاتے ہوئے ترکی کی طرف بھاگ نکلا۔ حجاج نے اسے وہاں بھی آرام سے بیٹھنے نہ دیا تو خوف کے مارے مکان کی چھت سے کود کر خودکشی کر لی (ابو الفداء، ص ۱۹۷)۔

یہ چند تاریخی اشارات ہیں اور یہی وہ واقعات ہیں جن کی بنا پر لوگوں نے حجاج کو ظالم اور سفاک کے القاب سے یاد کیا۔ ذرا ایک لمحہ کے لیے سوچیے کہ ایک حکومت ہے' باضابطہ اور باقاعدہ آئینی حکومت' بالکل اسلامی حکومت۔ امیر یا خلیفہ مسلمان' رعایا مسلمان' آئین اسلامی ہے۔ جن کی شاندار فتوحات کو یاد کر کے لوگ فخر اور سربلندی محسوس کرتے ہیں۔ اس اسلامی عہد حکومت میں حجاج ایک ذمہ دار حاکم ہے۔ وہ دنیا کی واحد اسلامی حکومت کے استحکام اور بقا کی خاطر سلطنت کے نظم و نسق کو بحال کرنے اور امن عامہ کو برقرار رکھنے کے لیے فتنوں کو کچلتا ہے۔ سازشوں کو دباتا ہے۔ حکومت کے باغیوں کی سرکوبی کرتا ہے۔ اندورون ملک میں امن و امان بحال کر کے اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع تر کرتا چلا جاتا ہے۔ کیا ان حالات میں آپ اس کی ان خدمات کو ظلم اور سفاکی سے تعبیر کرنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں؟ ایک لمحہ کے لیے فرض کیجئیے کہ وہ ان تمام فرائض سے کوتاہی اور سیاسی و ملکی حالات سے چشم پوشی کرتا تو کیا عدل و انصاف اور قانون و آئین کی نظر میں وہ بے وفائی بدعہدی اور غدّاری کا مرتکب نہ ہوتا اور کیا وہ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے اور مجرمانہ غفلت برتنے کی پاداش میں سنگین ترین سزا کا مستوجب نہ ٹھیرتا؟ آپ اپنے ضمیر کا جائزہ لیجئیے' دل کو ٹٹولیے اور خود فیصلہ فرمایئے۔

حضرت سعید بن جبیرؒ کا قصہ

حجاج پر سب سے بڑا الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ اور اکابر ائمہ تابعینؒ سے بدسلوکی بلکہ ظلم و ستم کرتا تھا۔ اس نے بڑے بڑے علمائے دین کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہ کیا۔ اب چند لمحوں کے لیے تاریخ کے ان حقائق پر بھی بڑے سکون اور ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کریں۔ ہمیں نہ تو حجاج کی حمایت مقصود ہے۔ نہ بزرگان دین اور صلحا و اتقیا سے عداوت و کد' ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ وہ تاریخی واقعات جن کی بنا پر ایک فیصلہ صادر کیا گیا ہے ان کی تاریخی حقیقت و اصلیت کیا ہے۔ کیا وہ فیصلہ حقائق و واقعات کی روشنی میں کیا گیا ہے یا کسی خاندانی تعصب اور نسلی عداوت کی

بنا پر؟۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے خلیفہ عبدالملک نے بعض بزرگوں کی بابت حجاج کو خاص ہدایات دے رکھی تھیں کہ ان سے ہمیشہ بہترین سلوک اور نرمی روا رکھی جائے' البتہ ایک بزرگ ہیں حضرت سعید بن جبیرؓ۔ ان کے قتل کی وجہ سے ہمارے واعظ اور صوفی منش لوگ حجاج سے بہت بگڑتے ہیں اور اسے برا بھلا کہتے ہیں' لعنتیں بھیجتے ہیں' بھری محفلوں میں تبرا کہنے سے بھی نہیں چوکتے اور خدا جانے کن کن القاب اور ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج کی صحبت میں اس حقیقت کو ضرور بے نقاب کیا جائے اور حضرت سعید بن جبیرؒ کے طرز عمل اور حجاج کے مواخذہ کو آپ حضرات کے فیصلے پر چھوڑا جائے۔

یہ درست ہے کہ سعید بن جبیرؒ بڑے متقی اور پرہیز گار انسان تھے۔ ان کی پارسائی اور علم میں دوسرا کوئی تابعی شریک نہیں۔ یہ بھی بجا ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے جلیل المرتبت بزرگوں سے علم دین حاصل کیا۔ امام احمد بن حنبل کا یہ فرمان بھی سر آنکھوں پر کہ سعید بن جبیر اتنا رفیع الشان عالم تھا کہ کوئی انسان اس کے علم سے بے نیاز نہیں ہو سکتا' مگر اس کا کیا جائے کہ وہ اپنی علمی رفعت و عظمت کے باوجود عبدالرحمٰن بن الاشعث کے ساتھ مل کر حکومت وقت کے خلاف بغاوت کے جرم میں گرفتار ہو کر کورٹ مارشل کے بعد ۹۵ھ میں قتل کر دیئے جاتے ہیں۔

حالات یوں ہیں کہ حجاج عراق کا وائسرائے ہے۔ سندھ' خراسان اور سجستان کے صوبے بھی اسی کے زیر فرمان ہیں۔ حجاج نے سعید بن جبیر کو سجستان کی فوجوں میں تنخواہیں بانٹنے کا حاکم اعلیٰ (یعنی (Paymaster) بنا کر بھیجا۔ عبدالرحمٰن بن اشعث سجستان میں اسلامی فوجوں کی قیادت کر رہا تھا۔ ابن اشعث نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ بغاوت کی وجوہات کچھ بھی ہوں۔ یہ جرم اتنا سنگین ہے کہ کوئی فوجی قانون اور شہری آئین اس جرم کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ سعید بن جبیر نے ابن اشعث کا ساتھ دیا۔ دونوں نے مل کر ایک متوازی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ اب

دیکھیے کہ دونوں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ حکومت کے ملازم ہیں۔ کفار سے جنگ ٹھنی ہوئی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان حالات میں فوجی مدبّر اور انصاف پسند حکومت ایسے سنگین جرم کو معاف کر سکتی ہے؟

ابن اثیر نے اپنی تاریخ الکامل (۴: ۳۰) میں بیان کیا ہے کہ جب سعید بن جبیر کو گرفتار کر کے حجاج کے سامنے پیش کیا گیا تو حجاج نے سعید بن جبیرؓ کو جرم کی نوعیت سے آگاہ کرنے کے لیے چند سوالات کیے اور سعید ان سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ یہ غیرموزوں نہ ہو گا کہ اس مکالمے کا کچھ حصہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں تاکہ آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو سکے۔

حجاج نے سعید سے مخاطب ہو کر کہا: کیا میں نے اپنی قیادت کی ذمہ داریوں میں تمہیں شریک نہیں کیا تھا؟ کیا ایک اہم سرکاری عہدہ تفویض نہیں کیا تھا؟ سعید نے اعتراف کیا تو حجاج نے پوچھا۔ پھر یہ بغاوت کیوں؟ سعید نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں اور مجھ سے غلطی بھی سرزد ہو سکتی ہے۔ حجاج نے پھر پوچھا کہ سعید بھلا یہ تو بتاؤ کہ جب میں نے مکہ میں عبداللہ بن زبیرؓ کو قتل کیا اور اس کے خاندان سے خلیفہ کے لیے بیعت لی تو کیا تم نے امیرالمومنین عبدالملک کی وفاداری کا حلف نہیں اٹھایا تھا؟ سعید نے حلف وفاداری اٹھانے کا اقرار کیا۔ حجاج بولا جب میں عراق کا والی ہو کر کوفے پہنچا تو کیا تم سے دوبارہ امیرالمومنین عبدالملک کی بیعت نہیں لی تھی۔ جب سعید نے اس کا بھی اعتراف کیا تو حجاج نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ تم نے دو مرتبہ بیعت کرنے کے بعد بھی اسے توڑ ڈالا۔ تمہارے اس جرم کی سزا قتل کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

قارئین اس تاریخی شہادت کے بعد آپ چاہیں تو سعید بن جبیر کے علم و تقویٰ کا پاس کرتے ہوئے حجاج کو ظالم و سفّاک قرار دیں یا جرم کی نوعیت پر غور کرتے ہوئے حجاج کو حق بجانب سمجھیں، بہرکیف فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

نفسیاتی مطالعہ

حجاج کے ظلم و ستم کی داستانیں افسانوں سے زیادہ مشہور ہو گئیں اور ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ اس شخص کے پہلو میں پتھر کا دل ہے تھا یا ہماری طرح گوشت اور خون کا ایک ٹکڑا۔ ہم نے کبھی غور نہ کیا کہ اس شخص کی زندگی کا کوئی اور پہلو بھی ہو سکتا ہے۔ قارئین میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ حجاج کی زندگی کے دوسرے گوشے کہیں زیادہ دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں۔

حجاج کو انسانی نفسیات میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ بڑا مردم شناس تھا۔ اور مختلف طبقوں کے مزاج کو خوب سمجھتا تھا۔ چند لمحوں میں قوموں اور آدمیوں کے مزاج کو بھانپ لیتا تھا۔ اس کے مصاحبوں میں عراقی بھی شامل تھے اور شامی بھی۔ حجاج کی مردم شناس نگاہوں نے چند عراقیوں کو منتخب کر رکھا تھا۔ اور جو کام بھی ان عراقیوں کے سپرد کیا جاتا وہ بڑی گرم جوشی اور تندہی سے انجام دیتے۔ مسعودی نے مروج الذہب (۳۸۰:۸ تا۳۸۱) میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے جو حجاج کی بصیرت اور نفسیاتی علم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حجاج کے شامی مصاحبوں کو یہ بات بڑی شاق گزری کہ ہر اہم کام عراقیوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ وہ باتیں بنانے لگے۔ حجاج کے اس طرزِ عمل پر نکتہ چینی شروع ہو گئی۔ جب حجاج کو معلوم ہوا تو اس نے دونوں گروہوں کے کچھ آدمی ساتھ لیے اور صحرا کی طرف چل نکلا۔ جب کافی دور چلا گیا تو صحرا میں اونٹوں کا ایک قافلہ نظر پڑا۔ حجاج نے ایک شامی مصاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ جاؤ دیکھو کہ کیا معاملہ ہے اور واپس آکر تفصیل پیش کرو۔ تھوڑی دیر کے بعد اس شامی نے واپس آکر اطلاع دی کہ کچھ اونٹ گزر رہے ہیں۔ حجاج نے پوچھا کہ کوئی سامان لے کر جا رہے ہیں۔ شامی نے بوکھلا کر کہا کہ یہ تو میں نے خیال نہیں کیا۔ البتہ اب جا کر دیکھ آتا ہوں پھر حجاج نے ایک عراقی کو بھیجا اور اسے وہی الفاظ کہے جو پہلے شامی سے کہے تھے' جب عراقی واپس آیا تو حجاج نے شامیوں کے روبرو پوچھا۔ تم نے کیا دیکھا؟ عراقی نے جواب دیا۔ اونٹوں کا قافلہ۔ پوچھا کتنے اونٹ تھے۔ کہا تیں' پوچھا: کیا لے جا رہے تھے؟ کہا کہ تیل۔ پھر سوال

کیا۔ کہاں سے آئے ہیں؟ اس نے جگہ کا نام بتایا۔ پوچھا کہاں جا رہے ہیں؟ اس نے پھر جگہ بتائی۔ حجاج نے اونٹوں کے مالک کا نام پوچھا تو عراقی نے وہ بھی بتا دیا۔ اب حجاج نے شامیوں سے مخاطب ہو کر کہا اہل عراق میں اتنی خوبیاں ہیں کہ میں ان لوگوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

حجاج بمشکل پچیس (۲۵) برس کا تھا کہ وہ سرکاری ملازم ہو گیا اور اپنی خداداد قابلیت اور طبعی ذہانت سے عراق کی گورنری کے عہدے تک جا پہنچا۔ البلاذری نے انساب الاشرف میں لکھا ہے کہ عراق کے وائسرائے کی حیثیت میں حجاج کی سالانہ تنخواہ پانچ لاکھ درہم تھی۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حجاج برابر بیس سال تک اس عہدے پر فائز رہا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ بڑا مالدار، کھاتا پیتا، فارغ البال اور خوش حال آدمی تھا۔

عمدہ کھانوں کا شوق

جاحظ نے تاج، ابن عبد ربہ نے العقد اور مسعودی نے مروج الذہب میں بیان کیا ہے کہ بعض مسلمانوں کو عمدہ اور نفیس کھانوں کا بڑا شوق تھا۔ وہ لوگ کھانے کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ کھانوں کے شوقینوں کی ایک فہرست بھی درج کی ہے، جس میں امیر معاویہ، حجاج، عبداللہ بن زیاد، خلیفہ سلیمان بن عبدالملک اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے نام خاص طور قابل ذکر ہیں۔ حجاج تو صدر اول کے بہترین کھانے والوں میں شمار ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس دستر خوان پر بہترین کھانے چنے جاتے تھے۔ وہ خوب مزے سے اور پیٹ بھر کر کھاتا۔ کھانے کے دوران میں بڑی دلچسپ باتیں کرتا، لطیفے کہتا، تاریخی باتوں کا تذکرہ کرتا اور کبھی کبھی عمدہ کھانے والوں کا ذکر خیر بھی کیا کرتا تھا۔

نیکی اور خدا خوفی

حجاج کا طرز عمل اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ وہ بنو امیہ کا بڑا وفادار اور خیر خواہ تھا۔ اس کے ثبوت کے لیے کسی مزید توضیح اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ البتہ خلیفہ منصور کی یہ رائے بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ مسعودی رقمطراز ہے کہ عباسی خلیفہ

منصور نے ایک دن دربار میں بیٹھے ہوئے حجاج کو یوں خراج تحسین ادا کیا۔ **واللہ ما رایت رجلا انصح من الحجاج لبنی مروان**" (بخدا میں نے حجاج سے زیادہ بنو مروان کا کوئی خیر خواہ نہیں دیکھا اس وفاداری اور خیر خواہی کے باوجود حجاج نیک دل مرد مومن تھا۔

اس کے پہلو میں ایسا دل تھا۔ جس میں خوف خدا اور تقویٰ بسا تھا۔ حجاج کی زندگی کا یہ پہلو بڑا دلچسپ ہے کہ وہ بڑا خدا ترس اور رقیق القلب انسان تھا۔ ارکان اسلام' یعنی نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ کا بڑا پابند تھا۔ اکثر قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتا۔ ابن اثیر نے الکامل (۱۳۲:۴) میں ابن عوف کا قول نقل کیا ہے کہ جب میں حجاج کو قرآن پڑھتے سنتا تو خیال کیا کرتا تھا کہ وہ ہر وقت تلاوت قرآن میں مشغول رہتا ہے۔

مسعودی نے مروج الذہب (۵۹:۹ ـ ۶۰) میں بیان کیا ہے کہ حجاج مسلسل تین برس تک یعنی' ۷۲ھ' ۷۳ھ' ۷۴ھ میں حج کے موقعہ پر لوگوں کی قیادت اور امامت کے فرائض انجام دیتا رہا۔

البلاذری نے انساب الاشراف (ص ۳۷۳) میں ذکر کیا ہے کہ جب حجاج کو عبداللہ بن زبیرؓ کے معاملے سے فراغت حاصل ہوئی تو بیت اللہ شریف کی صفائی اور مرمت کی طرف توجہ کی۔ جنگ کی وجہ سے جو جگہ پتھر' یا خون وغیرہ سے آلودہ ہو چکی تھی۔ اسے صاف کرایا۔ پتھر اٹھوائے اور مسجد حرام کو از سر نو تعمیر کرایا۔ ابو الفداء نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ تعمیر نو کے وقت حجاج نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ مسجد حرام کا انداز اور نمونہ بالکل وہی ہو جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا۔ ابن اثیر کی روایت ہے کہ جب تک حجاج زندہ رہا' امامت کے فرائض خود ادا کرتا رہا اور جب موت کا وقت قریب آ پہنچا تو اپنے بیٹے عبداللہ کو امام نماز مقرر کر دیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک روایت ہے کہ جب آپ کسی قبر کو دیکھتے یا اس کا ذکر کرتے تو دل پر اتنی رقت طاری ہو جاتی اور آپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ یہ وہ دلی کیفیت ہے جو ہر انسان کو ہر وقت میسر نہیں آ سکتی۔ ابن اثیر اپنی تاریخ

الکامل میں بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ حجاج تقریر کر رہا تھا دوران تقریر میں قبر کا ذکر آ گیا۔ حجاج بار بار قبر کا لفظ دہراتا اور کہتا رہا کہ وہ تنہائی کی جگہ ہے اور وحشت کا گھر ہے۔ وہاں آدمی بالکل غریب الوطن اور بے یار و مددگار ہو گا۔ وہاں نہ تو کوئی انیس اور دوست ہو گا نہ مونس و غمگسار۔ حجاج ان الفاظ کو بار بار دہراتا خود بھی روتا اور دوسروں کو بھی رلاتا رہا۔ اگرچہ بظاہر یہ چیز معمولی سی نظر آتی ہے، لیکن اس کی پہنائیوں میں حجاج کے دل مضطر اور قلب متقی کے کوائف و احوال کی بے پناہ موجیں محسوس کی جا سکتی ہیں۔

خاندان ابو طالب سے حسن سلوک

حجاج کا سیاسی ماحول کچھ اس قسم کا تھا کہ حضرت علیؓ کے خاندان کی حمایت کر کے حکومت سے وابستگی اور خوشگوار تعلقات استوار رکھنا ممکن نہ تھا۔ اس خاندان سے عداوتیں حد سے بڑھ چکی تھیں۔ خاندان ابو طالب کے کسی فرد سے حسن سلوک یا ہمدردی کرنا مستحسن نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علویوں اور ان کے رشتہ داروں کو اذیت اور دکھ سے محفوظ رکھنا بھی بہت بڑا کارنامہ تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ حجاج کی پارسائی اور تقویٰ کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ اس نے حکومتوں کے اختلاف اور عداوتوں کے باوجود اپنے سارے عہد حکومت میں ابو طالب کے خاندان جس نے کسی فرد کو نہیں ستایا اور نہ کسی کو دکھ دیا (العقد، ۲:۲۶۳)

ایک دن حجاج نے کھڑے ہو کر اعلان کیا جس نے شجاعت و بہادری کا کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو وہ سامنے آئے ہم اسے دلیری اور جرأت کا صلہ دیں گے۔ ایک آدمی اٹھ کر کہنے لگا کہ میں نے زندگی میں ایک بڑا شاندار کارنامہ کیا ہے۔ حجاج نے اس کی نوعیت پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ میں نے امام حسینؓ کو قتل کیا تھا۔ میرے اس کارنامے میں کسی اور شخص کو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ سن کر حجاج کا خون کھولنے لگا۔ لال پیلا ہو کر حجاج نے کہا میری آنکھوں سے دور ہو جا تو اور حضرت امام حسینؓ ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ یہ کہہ کر اسے مجلس سے نکال دیا اور کوڑی تک نہ دی (ابن الاثیر: الکامل، ۴: ۱۳۲)

حضرت عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب خلیفہ عبدالملک کی بے اعتنائیوں کی وجہ

سے بڑے زیر بار ہو گئے۔ انہوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ اپنی لخت جگر ام کلثوم کا نکاح حجاج سے کر دیا جائے۔ حجاج بھی رضامند ہو گیا۔ حجاج نے اپنے سسرال سے بڑا فیاضانہ سلوک کیا۔ ان پر لاکھوں روپے خرچ کیے۔ ان کے افلاس اور تنگدستی کو خوشحالی اور فارغ البالی سے بدل دیا۔ آٹھ ماہ گزرنے کے بعد خلیفہ عبدالملک کے بیٹے ولید نے اس نکاح پر نکتہ چینی شروع کر دی اور محاذ جنگ یہ قرار دیا کہ عربوں کی معزز ترین خاتون اور بنو عبد مناف کی سیدہ کو بنو ثقیف کے حجاج جیسے معمولی فرد سے بیاہ دیا گیا ہے۔ اس شادی کو انمل جوڑ قرار دے کر عبدالملک کو برابر اکساتا رہا اور اس وقت تک چین نہ لیا۔ جب تک کہ حجاج کے نام خط لکھوا دیا کہ ام کلثوم کو فوراً طلاق دے دو (العقد ۱:۱۹۱)

بظاہر تو حضرت عبداللہ بن جعفر کے خاندان کی سیادت کا اعتراف اور شرافت کی حفاظت اور حمایت مقصود ہے، لیکن ہوشمند لوگ سمجھتے ہیں کہ کتنے سیاسی اور نفسیاتی محرکات اس "نیک جذبے" کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

حجاج کی مجبوریاں بھی ہمارے سامنے ہیں وہ خلیفہ کی حکم عدولی نہیں کر سکتا اور اگر کرے تو صرف زندگی کی نعمتوں سے ہی نہیں، بلکہ زندگی سے بھی محروم ہوتا ہے۔ بہرحال اس نے طلاق دے دی، لیکن اس مرد مجاہد کو آفرین کہنا چاہیے کہ تعلقات منقطع کر لینے کے بعد بھی بڑی مروت، فیاض دلی اور حسن سلوک کا ثبوت دیا، جب تک حجاج زندہ رہا۔ ام کلثوم کے سارے اخراجات کا کفیل رہا اور جب تک عبداللہ بن جعفر زندہ رہے۔ حجاج بڑی فیاضی اور فراخ دلی سے ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا رہا (العقد ۱:۱۱۹)

رقت قلب

حجاج کی خدا خوفی اور رقت قلب سے متعلق ابن اثیر (الکامل ۴: ۱۳۳-۱۳۴) نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ خلیفہ عبدالملک نے حجاج کو لکھا کہ ایک شخص اسلم نامی کے بارے میں مجھے یہ خبر ملی ہے اور ساتھ ہی حکم لکھ بھیجا کہ اسلم کو قتل کر دیا جائے۔ حجاج نے اسلم کو بلایا اس نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ امیر المومنین تو تشریف فرما نہیں ہیں، مگر آپ تشریف رکھتے ہیں اللہ کا فرمان ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے جب کوئی فاسق تمھارے

پاس کسی قسم کی خبر لائے۔ تو اچھی طرح تحقیق کر لو۔ مقصد یہ ہے کہ امیر المومنین کو جو اطلاع پہنچی ہے وہ غلط ہے۔ آپ امیر المومنین کی خدمت میں لکھ کر بھیجیں کہ مجھ پر چوبیس عورتوں کی روزی اور خوراک کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ عورتیں باہر دروازے پر کھڑی ہیں۔ آپ انہیں بلا بھیجیں۔ انہیں اندر بلایا گیا تو کوئی تو اس کی ماں تھی کوئی خالہ' کوئی چچی' کوئی بیوی اور کوئی بیٹی۔ سب سے آخر میں ایک دس سالہ بچی داخل ہوئی۔ حجاج نے چھوٹی بچی سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ اللہ آپ کا بھلا کرے میں تو اس کی بیٹی ہوں۔ پھر اس بچی نے شعروں میں چند معروضات پیش کیں' جن کا مفہوم یہ ہے:

"اے حجاج! اگر تو نے اسے قتل کر دیا تو تو محض ایک آدمی کو قتل نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کے ساتھ خاندان کے چوبیس افراد کو بھی قتل کر دے گا۔

اے حجاج! اس کے قتل کے بعد ہمارا کفیل کون ہو گا؟

اے حجاج! یا تو ہم پر احسان و کرم کر دے یا ہم سب کو اکٹھا قتل کر دے۔

یہ سن کر حجاج کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ اس نے سارا ماجرا خلیفہ کو لکھ بھیجا۔ خلیفہ نے جواب دیا کہ اگر یہی بات ہے پھر اس آدمی سے حسن سلوک کیا جائے۔

سخاوت' دیانت اور پاس عہد

حجاج بڑا دیانت دار اور امین تھا۔ اسے وعدوں کا پاس تھا۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتا کہ وہ کسی کے عہد کو نہ توڑے' اسے یہ بات بھی گوارا نہ تھی کہ کوئی دوسرا آدمی بدعہدی کرے۔ البلاذری نے انساب الاشراف میں ایک واقعہ لکھا ہے جس سے حجاج کی امانت و دیانت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک شخص حجاف نامی حجاج کے پاس آیا۔ قتل و خون کے سلسلے میں حجاف کے ذمہ بہت سی رقوم واجب الادا تھیں۔ اس نے حجاج سے روپے مانگے۔ حجاج نے کہا کہ میرے پاس اللہ کی امانت ہے۔ میں اللہ کے مال میں ایک پیسے کی بھی خیانت نہیں کر سکتا۔ اس نے عرض کیا کہ آپ سرکاری خزانے سے نہیں دینا چاہتے تو نہ سہی اللہ نے آپ کو بہت کچھ دے رکھا ہے آپ کی تنخواہ بڑی معقول ہے مجھے اپنی جیب خاص سے کچھ

رقم عطا کرو۔ یہ کہہ کر اس نے حجاج کی امانت اور دیانت کی تعریف شروع کر دی۔ بالآخر حجاج نے اسے ایک لاکھ درہم اپنے پاس سے دے دیئے۔

حجاج کی سخاوت کا یہ حال تھا کہ ہر روز دس غریبوں مسکینوں کو کھانا کھلایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حجاج نے سجستان کے حاکم رتبیل سے معاہدہ کیا کہ وہ سجستان پر سات برس تک حملہ آور نہ ہو گا اور رتبیل نے وعدہ کیا کہ وہ نو لاکھ درہم کی رقم سالانہ ادا کرے۔ یہ ادائیگی نقدی کی صورت میں نہ تھی' بلکہ بصورت جنس تھی۔ جب معاہدے کی میعاد ختم ہو گئی تو حجاج نے اشھب بن بشیر کلبی کو سجستان کا والی مقرر کر کے بھیجا۔ اشھب نے رتبیل کو جنس کے بارے میں تنگ کرنا شروع کیا۔ رتبیل نے حجاج سے شکایت کی حجاج نے اشھب کو معزول کر دیا (فتوح البلدان ص ۴۰۷)۔

جب تک حجاج زندہ رہا اس کے دبدبے اور رعب و جلال کی وجہ سے اپنے پرائے سب معاہدوں اور سیاسی فیصلوں کی پابندی کرتے رہے' لیکن حجاج کی موت کے بعد وعدوں کی پابندی چنداں ضروری نہ سمجھی گئی۔ حجاجؒ کی ہیئت اور سختی کے باوجود غیر مسلم حکمرانوں اور جمہور کو اس بات کا اعتراف تھا کہ اسے اپنے الفاظ کا بڑا پاس ہے۔ ایک دفعہ بات منہ سے کہہ دی پھر کیا مجال جو سر مو بھی انحراف ہو جائے۔ دشمن یہ بھی خوب جانتے تھے کہ وہ لشکر کشی اور مہم کو سر کرنے کے لیے روپیہ پیسہ بڑی بے دریغی اور بے جگری سے خرچ کرنے والا حاکم ہے۔

عنان حکومت یزید عبدالملک کے ہاتھ میں تھی۔ حاکم سجستان نے زرصلہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ جب اس سے تقاضا کیا گیا تو رتبیل نے دریافت کیا کہ ان لوگوں کو کیا ہوا جو خالی پیٹ آیا کرتے تھے۔ نمازیں پڑھنے کی وجہ سے ان کی پیشانیوں پر سیاہ رنگ کے نشان پڑ گئے تھے۔ رتبیل کو بتایا گیا وہ لوگ تو موت سے ہم آغوش ہو چکے ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ لوگ تم سے زیادہ ایفائے عہد اور وعدوں کا پاس کرنے والے تھے۔ وہ تم سے زیادہ بہادر اور طاقت ور تھے۔ رتبیل سے پوچھا گیا کہ کیا بات ہے کہ تم حجاج کو تو زرصلح ادا کرتے تھے' لیکن ہمیں ادا نہیں کرتے۔ اس نے جواب دیتے ہوئے بڑے پتے کی

بات کہی۔ کہا کہ حجاج بلا کا آدمی تھا جب وہ کسی چیز کے حصول میں کامرانی اور فتح مندی سے ہم کنار ہوتا تو پھر وہ بڑی سے بڑی رقم خرچ ہو جانے کی مطلق پروا نہ کرتا۔ خواہ مہم کے بدلے میں کچی کوڑی بھی وصول نہ ہو اور تمہاری یہ حالت ہے کہ تم ایک روپیہ خرچ کر کے اس کے بدلے میں دس روپوں کی امید رکھتے ہو۔ چنانچہ رتبیل نے بنو امیہ اور ابومسلم خراسانی کے والیوں میں سے کسی کو بھی زر صلح کی ایک پائی ادا نہیں کی (فتوح البلدان، ص ۴۰۸)

جذبہ اطاعت قرآن

دوسری گوناگوں خوبیوں کے ساتھ حجاج میں یہ خوبی بھی بڑی نمایاں تھی کہ ایک فیصلہ صادر کر دینے کے بعد جب اسے قرآنی حکم معلوم ہو جاتا تو وہ فوراً قرآن مجید کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا۔ ایک مرتبہ سلیک بن سلکہ حجاج کے پاس آیا اور اس نے شکایت کی کہ مجھ پر فلاں فلاں شخص نے ظلم و ستم کیا ہے۔ میرا مکان منہدم کر دیا ہے۔ یہ سن کر حجاج نے ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ دنیا میں یہی دستور رہا ہے۔ قصوروار کی جگہ بے قصور پکڑا جاتا ہے اور مجرم کے بجائے معصوم انسان مارا جاتا ہے۔ اس پر سلیک نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھتے ہوئے کہا کہ قرآن کا ارشاد تو کچھ اور ہے:

يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ الآية

یعنی اے والا جاہ! اس کا باپ بوڑھا ہے اس کی بجائے ہم میں سے کسی کو پکڑ لیجیے ہم آپ کو احسان کرنے والوں میں سے سمجھتے ہیں۔ جواب ملا کہ اللہ اس بات سے "بچائے کہ ہم کسی اور کو پکڑیں سوائے اس شخص کے جس کے پاس ہماری چیز ملی ہے ورنہ ہم تو ظالموں میں شمار ہوں گے۔" جب حجاج نے یہ آیت سنی تو سر جھکا دیا۔ یزید بن مسلم کو بلا کر حکم دیا کہ اس شخص کے ساتھ جو جو ظلم اور زیادتی ہوئی ہے اس کا ازالہ کیا جائے۔ ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی صادر کر دیا کہ اس کا مکان تعمیر کرا دیا جائے اور اعلان کر دیا جائے کہ شاعر نے جھوٹ اور غلط کہا ہے اور اللہ کی بات سچی ہے (العقد، ۱: ۱۱)

امن عامہ کا خیال

حجاج کو امن عامہ کا بڑا خیال رہتا۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں نہ ہونے پائیں۔ راستے پر امن رہیں۔ عوام کی شہری زندگی خطروں سے پاک نظر آئے اور جمہور محسوس کریں کہ ان کی زندگی امن و امان سے گزر رہی ہے۔ جب کبھی کوئی چوری یا ڈکیتی کا واقعہ پیش آتا تو حجاج سنگین ترین سزا دینے سے بھی گریز نہ کرتا۔ حجاج نے خراسان کے گورنر قتیبہ بن مسلم کو خط لکھا کہ وکیع بن حسّان بصرہ میں رہتا تھا۔ پھر سجستان جا کر چوری کی واردتیں کرنے لگا۔ اب وہ خراسان میں سکونت رکھتا ہے۔ میرا یہ خط پہنچتے ہی اس کا مکان منہدم کر دو (العقد' ۱:۱۷) ۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حجاج کو معلوم ہوا کہ چند عربوں نے راستوں کو مسافروں کے لیے مخدوش بنا رکھا ہے تو اس نے ڈاکوؤں کو لکھ کر بھیجا کہ تم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ فتنۂ و فساد کوئی معمولی چیز ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ شہسواروں کا ایک دستہ بھیج کر تمھارا مال و دولت نیست و نابود کر دوں۔ تمھاری عورتوں کو بیوہ بنا دوں اور تمھارے بچے یتیم چھوڑ دوں۔ جب انہیں یہ خط پہنچا تو انہوں نے راستوں کے امن و امان کو بحال کر دیا اور اپنی جان بچانے کی خاطر اپنے گھروں کی راہ لی (العقد' ۱۰:۱۷)۔

انسانی جذبات

حجاج ہماری طرح کا ایک انسان تھا جب اس کے جذبات کو اکسایا جاتا اور اس کے خاندان کی بزرگی اور اس کے عہدے کی جلالت قدر کا واسطہ دیا جاتا تو وہ درخواست کنندہ کی درخواست پر ہمدردانہ غور کرنے کے لیے آمادہ و تیار ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ امام شعبی نے حجاج سے کسی چیز کے لیے درخواست کی' لیکن حجاج نے اس کی درخواست کو درخورِ اعتنا نہ سمجھ کر کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھا۔ امام شعبی نے دوبارہ لکھا مگر اس مرتبہ علم نفسیات کی روشنی میں معروضات پیش کیں۔ تارِ رگِ جان کو چھیڑنا تھا کہ سازِ دل بجنے لگا' امام شعبی نے لکھا کہ آپ عراق کے حاکم اعلیٰ ہیں۔ حجاز کے نامور بزرگ

حضرت عروۃ بن مسعود ثقفیؓ کے نواسے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں آپ معذور تصور نہیں کیے جا سکتے۔ یہ الفاظ پڑھ کر حجاج کا چہرہ خوشی اور مسرت سے تمتمانے لگا اور حکم دیا کہ شعبی کی حاجت فوراً پوری کردی جائے (العقد ۱: ۷۷) ۔

بحیثیت خاوند

حجاج کی زندگی کا یہ پہلو بھی بڑا شاندار ہے کہ وہ انسانوں اور قوموں کی نفسیات کو خوب سمجھتا تھا اور وہ ہر آدمی سے گفتگو اور سلوک کرتے وقت اس کی استعداد اور رجحانات کا خاص خیال رکھتا تھا۔ بیویوں کے معاملے میں بھی وہ اسی اصول پر کاربند تھا۔

ایک دفعہ حجاج کے ہاں محفل جمی ہوئی تھی۔ عورتوں کا ذکر خیر ہونے لگا۔ حجاج نے کہا کہ میری چار بیویاں ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) ہند بنت مہلب (۲) ہند بنت اسماء (۳) ام الجلاس بنت عبدالرحمٰن (۴) امت الرحمٰن بنت جریر الجبلی۔ نام بتانے کے بعد ہر بیوی سے اپنا سلوک اور معاشرتی تعلقات بیان کرتے ہوئے نہایت لطیف انداز میں ہر ایک پر نفسیاتی تنقید کی، کہنے لگا کہ جب میں ہند بنت مہلب کے پاس ہوتا ہوں تو میری جذباتی کیفیت اس نوجوان بدو کی طرح ہوتی ہے جو اپنے نوجوان ساتھیوں کے ساتھ مل کر خوب کھیلے کودے۔ جب ہند بنت اسماء کے پاس ہوتا ہوں، تو میں شاہانہ شان و شکوہ کا مالک ہوتا ہوں اور میری حالت اس تاجدار کی طرح ہوتی ہے جو بڑے وقار اور تمکنت کے ساتھ دوسرے بادشاہ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہو۔ جب میں ام الجلاس کے پاس ہوتا ہوں تو میری مثال اس بدو کی طرح ہوتی ہے جو دوسرے بدوؤں کی محفل میں بیٹھ کر بڑے چٹخارے لے لے کر شعرو شاعری کر رہا ہو۔ قصے کہانیاں اور لطائف و ظرائف کہہ سن رہا ہو۔ جب میں امت الرحمٰن بنت جریر کے پاس ہوتا ہوں تو علم و فقہ کے چرچے ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عالم دوسرے علما اور فقہا کی مجلس میں بیٹھے باتیں کر رہا ہے۔ (العقد، ۳: ۳۲۴)

اصلاحات

حجاج کے شاندار کارناموں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ وہ بڑا مہربان اور وفادار شخص تھا۔ وہ غریبوں اور محتاجوں کا ہمیشہ خیال رکھتا۔ اس نے داخلی اور خارجی فتنوں کا سدباب کیا۔ اسلامی فتوحات کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ حجاج پہلا حاکم تھا جس نے درہم پر قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ لکھا۔ صحابہ کے بعد وہ پہلا آدمی تھا جس نے فوجی ضرورتوں اور عسکری مصلحتوں کے پیش نظر شہر واسط کی بنیاد رکھی۔

وہ بڑا غیرت مند اور بہادر انسان تھا۔ مسلمان عورتوں کی عصمت بچانے اور انہیں ڈاکوؤں کی پنجے سے رہائی دلوانے کی خاطر سندھ پر لشکر کشی کی اور ستر لاکھ درہم خرچ کر کے انہیں غیر مسلموں کے ہاتھ سے نجات دلائی۔

حجاج حسابات کی باقاعدگی کا بڑا خیال رکھتا اور پڑتال وغیرہ کے معاملے میں بڑا محتاط تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات بڑی ضروری تھی کہ حسابات ایسی زبان میں لکھے جائیں جو ہر آدمی کے لیے قابل فہم اور آسان ہو۔ حجاج کے وقت تک عراق کی آمد و خرچ کا حساب فارسی زبان میں لکھا جاتا۔ حجاج نے عراق کے انتظامات کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی زادان فرخ اور صالح بن عبدالرحمن کے تعاون سے دیوان عراق کو عربی زبان میں منتقل کر دیا۔

وہ عربوں کے وقار اور عربی کا بڑا حامی تھا اور عربی زبان تو اس کے احسان سے کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتی۔ حجاج کے اپنے زمانے تک یہ رواج تھا کہ عربی لکھتے وقت نقطے اور زیر، زبر، پیش وغیرہ مفقود ہوتی تھیں لیکن حجاج نے عوام کی سہولت کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن مجید کے پڑھنے کو آسان بنا دیا۔ اس پر زبریں، زیریں اور پیشیں وغیرہ لگا دیں۔ نقطے لکھ دیئے اور قرآن مجید کی اشاعت میں بہت حصہ لیا۔

ملکی امن و امان قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ حجاج کو اس بات کا بڑا شوق تھا کہ ملک ترقی کی طرف گامزن ہو۔ وہ ہر وقت جمہور کی فلاح و بہبود کی فکر میں رہتا۔ چنانچہ زراعت کی ترقی کے لیے نہریں کھودیں۔ پرانی نہروں بالخصوص نہر دجلہ و فرات کو مرمت کر کے نئے سرے سے جاری کیا۔ بہت سی نئی نہریں تیار کرائیں۔

حجاج کو زرعی ثروت اور پیداوار کو بڑھانے کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اس مقصد کے نظر نہریں بنوانے کے علاوہ حجاج نے یہ حکم نافذ کر دیا کہ کوئی شخص کھیتی باڑی چھوڑ کر شہری زندگی اختیار نہ کرے' تاکہ زرعی پیداوار میں کمی نہ ہونے پائے۔

حجاج نے عراق میں نیا بندوبست جاری کیا۔ زمینوں کی پیمائش کر کے ہر شخص کی زمین کی حدود مقرر کر دیں۔

حجاج نے بہت سی بے آباد زمینوں کو آباد کر کے کھیتی باڑی شروع کرا دی۔ جوہڑوں اور زیر آب زمینوں کو خشک کرانے کے بعد انہیں قابل زراعت بنا کر ملک کی پیداوار میں معتدبہ اضافہ کیا۔

عراق کے شہروں میں یہ دستور تھا کہ ہر شہر کے ناپ اور تول الگ الگ تھے۔ حجاج نے حکم نافذ کر کے سارے عراق کے پیمانے' ترازو اور باٹ ایک جیسے مقرر کر دیئے۔

حجاج نے شہروں کی صفائی اور لوگوں کی صحت کے لیے کئی قانون بنائے۔ اس نے شہر واسط کے بازاروں اور گلی کوچوں میں پیشاب کرنے کی ممانعت کر دی اور خلاف ورزی کرنے والے کو قید کی سزا دی جاتی تھی۔ شہر میں آوارہ کتے قتل کرا دیئے گئے۔

حجاج نے فوج میں بھرتی کے لیے عمر مقرر کر دی۔ وہ عمر رسیدہ اور کمزور لوگوں کو بھرتی نہ کیا کرتا تھا۔ حجاج فوج کے لیے نو عمر' تندرست اور تنومند جوانوں کو پسند کیا کرتا تھا۔ بھرتی کے وقت حجاج امیدواروں کے کپڑے اتروا کر انہیں ادھر ادھر دوڑاتا اور جسمانی صحت کا بڑی سختی سے امتحان لیتا تھا۔

ملکی امن و امان کو بحال رکھنے کے لیے حجاج نے سرزمین عراق میں کرفیو آرڈر نافذ کرتے ہوئے یہ حکم دیا تھا کہ کوئی شخص نماز عشا اور نماز فجر کے درمیان گھر سے باہر نہ نکلے۔ خلاف ورزی کرنے والوں کی سزا موت تھی۔

حضرت ابن زبیرؓ نے یزید کے عہد حکومت میں کعبہ کو از سر نو تعمیر کرتے ہوئے اس کی عمارت میں توسیع کرا دی۔ بڑے بڑے ستون بنائے' اس کی دیواروں کو گلکاری اور پچکاری سے مزین اور خوشنما بنا دیا۔ حجاج کے نزدیک ابن زبیرؓ کی تعمیر و توسیع اور تزئین سے

کعبہ کی تاریخی اور اثری اہمیت کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ حجاج نے کعبہ کی عمارت کو گرا کر عہد نبوی کی طرز پر دوبارہ تعمیر کیا۔

اسی طرح حجاج نے مدینہ شریف میں بنو مسلمہ کی بستی میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔

حجاج کی قابلیتوں اور کامیابیوں کو دیکھ کر لوگ اسے ساحر و جادوگر کہنے لگے۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ حجاج کو اسم اعظم معلوم ہے۔

مختصر یہ کہ حجاج کے کارنامے اتنے شاندار' اس کا کردار اتنا بلند اور اس کی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ اسلامی تاریخ اور عربی ادب اس کے احسانات سے کبھی عہدہ براء نہیں ہو سکتے۔ اس کی قابلیت' ہنرمندی اور ذہنی و انتظامی خوبیوں کا اعتراف اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ خلیفہ منصور عباسی جیسا دانشمند اور لائق حکمران یہ آرزو کرتا ہے کہ کاش مجھے حجاج جیسا انسان مل جائے جو حکمرانی اور انتظام سلطنت میں میرا ہاتھ بٹائے۔

○○○

شیخ الرئیس ابنِ سینا: نامور فلسفی اور عالم

سن ہجری کے لحاظ سے ابن سینا کو پیدا ہوئے ایک ہزار برس سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ جس زمانہ میں ابن سینا پیدا ہو کر پروان چڑھا' خلافت عباسیہ دم توڑ رہی تھی۔ خلیفہ کا نام محض تقدس کی حیثیت رکھتا تھا سلطنت پارہ پارہ ہو چکی تھی نظم و نسق کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ بڑے علاقہ میں ایک خود مختار سلطنت کی باگ ڈور سنبھالے نظر آتا تھا۔ اگر خلیفہ بغداد سے کسی قسم کا تعلق تھا بھی تو محض روحانی۔

علمی مقام

ابن سینا فلاسفۂ اسلام کی صف اول میں شمار ہوتا ہے۔ وہ ان معدودے چند دانایان عالم میں سے ہے جنہوں نے علم کلام کے اصول اور مبادیات وضع کیے۔ شیخ الرئیس ابن سینا ان پیش رو حکمائے اسلام میں سے ہے جنہوں نے فلسفہ اور دین کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ وہ فلسفہ و حکمت' طب و نجوم اور طبعیات و الٰہیات میں یگانۂ روزگار اور علامۂ زمان کہلایا۔ اس کی شہرت مشرق و مغرب میں پھیلی اور وقت کی مقبول ترین علمی زبان' یعنی لاطینی میں اس کی فلسفیانہ تصانیف اور طبی کتب کے ترجمے کیے گئے۔ شیخ الرئیس کی شہرہ آفاق کتاب ''القانون فی الطب'' پندرھویں صدی عیسوی کی آخر میں دس مرتبہ لاطینی زبان میں شائع ہوئی۔ سولھویں صدی میں بیس سے زائد مرتبہ زیور طبع سے آراستہ ہوئی اور یورپ کی تمام یونیورسٹیوں اور درس گاہوں میں معالجات کے نصاب میں شامل رہی۔ اس امر سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابن سینا یورپ میں کتنا ہردلعزیز رہا۔

ابن سینا ایک ممتاز ذہنی انفرادیت رکھتا ہے۔ اس نے تو ابن رشد کی طرح ارسطو کے فلسفہ کی کورانہ تقلید نہیں کی اور نہ ابو نصر فارابی کے تمام فلسفیانہ خیالات کو اپنایا' بلکہ اس نے تو ابن رشد اور فارابی کو ارسطو کی بے جا تقلید پر مورد عتاب ٹھیرایا۔ ابن سینا کو ارسطو سے جہاں کہیں اختلاف ہوا' اس نے' بڑی دیانت داری کے ساتھ پیش کیا۔ اگرچہ ارسطو اور ابن سینا کا انداز اصول و مبادیات میں یکساں ہے' لیکن اغراض و انجام استنباط میں دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

خاندان و ماحول

ابن سینا ایسے علم دوست گھرانے میں پیدا ہوا جہاں فلسفۂ و حکمت کے چرچے دن رات رہتے تھے۔ مصر سے اسماعیلی مبلغ اور علما آتے تو ابن سینا کے والد کے ہاں قیام کرتے۔ ابن سینا کہتا ہے کہ میرا والد اسماعیلی عقائد رکھتا تھا اور میں نے اپنے گھر کی محفلوں میں بڑے بڑے علما اور عقلا کی زبان سے نفس اور عقل کے بارے میں گفتگو اور بحث سنی۔

پیدائش اور نام و نسب

ابن سینا کا باپ عبداللہ حسن بن علی بلخ کا رہنے والا تھا۔ سامانی حکمران نوح بن منصور کے عہد حکومت میں وہ بخارا کے ایک شہر "خرمتین" کا حاکم مقرر ہوا۔ بالآخر اسی گاؤں کی ایک نوجوان لڑکی مسمات ستارہ سے عقد نکاح ہو گیا اور اس خاتون کے بطن سے اسلام کا شاندار حکیم اور طب مشرق کا شیخ الرئیس ماہ صفر ۳۷۰ھ میں عدم سے منصۂ شہود میں آیا۔ والدین نے حسین نام رکھا' ابو علی کنیت مشہور ہوئی۔ دنیائے علم و فضل میں ابن سینا کے لقب سے شہرت دوام کا مالک قرار پایا۔ اور شیخ الرئیس کے معزز خطاب سے زبان زد عام و خاص ہوا۔

تعلیم اور اساتذہ

ابن سینا کی عمر پانچویں بہار تھی کہ اس کے باپ نے بخارا میں جاکر مستقل سکونت

اختیار کرلی۔ ہونہار بچے نے ہوش سنبھالا تو گھر میں علم و حکمت کے چشمے ابل رہے تھے۔
ابن سینا نے دس برس کی عمر تک قرآن مجید و ادب پڑھا۔

اس عرصے میں قرآن مجید حفظ کرلیا اور ادب مین خاصی مہارت پیدا ہو گئی تھی۔
بعدازاں ابو بکر احمد بن محمد خوارزمی سے علم لغت اور صرف و نحو حاصل کیا اور اسمٰعیل زاہد سے فقہ۔ حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ ابو عبداللہ ناقلی جیسا شہرۂ آفاق استاد' جو علوم منطق و ریاضی میں بے نظیر سمجھا جاتا تھا ان دنوں اس کا بخارا میں گزر ہوا۔ ابن سینا کے باپ نے یہ موقع غنیمت سمجھتے ہوئے ابو عبداللہ ناقلی کو کچھ عرصہ کے لیے اپنے ہاں ٹھہرا لیا۔ ابو عبداللہ ناقلی کا چند روزہ قیام ابن سینا کے لیے ازحد مفید ثابت ہوا۔ ہونہار اور ذہین طالب علم نے ابو عبداللہ ناقلی سے منطق کی مشہور کتاب "ایسا غوجی" اور ہیئت و جغرافیہ میں بطلیموس کی کتاب "المجسطی" سبقاً پڑھی۔

ابن سینا نے اٹھارہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے علوم منطق' حکمت نجوم' ریاضی اور طب میں بڑا کمال اور نام پیدا کرلیا تھا۔

شوق مطالعہ

ابن سینا کے شوق تحصیل علم اور انہماک مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ زمانہ طالب علمی میں کبھی رات بھر سونا نصیب نہ ہوا۔ اکثر آدھی رات تک پڑھتا رہتا۔ سارا دن کتاب بینی اور مطالعہ کی نذر ہو جاتا۔

طالب علم بڑا ذہین اور تیز فہم تھا۔ شروع ہی سے جسمانی قوت صحت کے ساتھ ذہنی استعداد سے بھی بہرہ وافر پایا تھا، چنانچہ بہت جلد علوم و فنون کی منازل طے کرلیں۔
ابن سینا کو علم طب میں تو کوئی زیادہ دقت پیش نہ آئی۔ اس نے جب عملی طور پر مطب میں بیٹھ کر مریضوں کو دیکھنا اور ان کا علاج معالجہ شروع کیا تو معلومات اور تجربات میں گراں قدر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تھوڑے عرصہ میں یہ کیفیت ہو گئی کہ ابن سینا کے اردگرد طبیبوں کا ہجوم رہنے لگا۔

فارابی سے استفادہ

البتہ اسے مابعد الطبیعیات علوم کو سمجھنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ ابن سینا پریشانی کی حالت میں اس شعبہ علم کو سمجھنے سے قطعاً" مایوس ہو گیا۔ مگر اس کی خوش نصیبی کہ یہ پریشانی زیادہ دیرپا ثابت نہ ہو سکی۔ مابعد الطبیعیات کو سمجھنے میں ابو نصر فارابی کے چند مسائل نے بڑی رہنمائی کی۔ اگر سچ پوچھے تو ابن سینا کی مابعد الطبیعی الجھنوں کو دور کرنے میں جتنا دخل فارابی کی تصانیف کو رہا ہے اتنا کسی اور کو نہیں رہا۔ یہ سب منزلیں اٹھارہ برس کی عمر تک طے ہو چکی تھیں۔

سلطان بخارا کا کتب خانہ

خدا کی قدرت دیکھئے کہ ذہانت' حافظہ اور شاہ دماغی کے ساتھ حالات بھی ایسے سازگار اور موافق ہو رہے تھے کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یاقوت رومی کو مرو کا شاہی کتب خانہ میسر آگیا تو اس نے شہروں اور ملکوں کی ضخیم ترین لغات "معجم البلدان" کے نام سے لکھ ڈالی۔ اور ساتھ ہی ادیبوں اور شاعروں کے حالات پر ارشاد الاریب یعنی معجم الادباء بھی تیار کرلی یہی حسن اتفاق ابن سینا کو بھی نصیب ہوا۔

واقعات یوں بیان کیے جاتے ہیں کہ سلطان بخارا نوح بن منصور بیمار ہو گیا۔ ابن سینا کو علاج کو موقع ہاتھ آیا۔ تشخیص اور دوا تیر بہدف ثابت ہوئی۔ سلطان صحت یاب ہو گیا۔ نوجوان طبیب کی شہرت اور اعزاز میں چار چاند لگ گئے۔ سلطان بخارا کا ایک بڑا شاندار اور نایاب کتب پر مشتمل عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ ابن سینا کو ذاتی اثر و رسوخ کے باعث وہاں تک رسائی حاصل ہو گئی۔ قوت حافظہ اور تحصیل علم کے لیے تو ابن سینا مشہور تھا ہی' اس موقع کو غنیمت جان کر خوب فائدہ اٹھایا۔ اپنے زمانے کے تمام مروجہ علوم یعنی منطق' طبیعات' ریاضیات' نجوم' الٰہیات اور فلسفہ و حکمت میں اتنی گہری نظر پیدا کرلی کہ اس نوجوان فلسفی اور طبیب کو دنیا کے سائنس دانوں اور داناؤں کی صف اول میں بڑی ممتاز مسند پر جگہ ملی۔

پریشان حالی

ابن سینا کی عمر بائیس برس کی ہوئی تو والد کا انتقال ہو گیا۔ باپ کا سایہ اٹھ جانے کے بعد ابن سینا کی زندگی میں بڑی تبدیلی رونما ہوئی' اگرچہ نوجوان حکیم مشرق ہر وقت اپنے کام کاج اور مطالعہ میں مستغرق رہتا' لیکن اس کی پریشانی اور مایوسی میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔

جب ذرا سکون نصیب ہوا اور جرجان' رے، ھمذان اور اصفہان کے حاکموں کے درباروں میں رسائی ہوئی تو اس نے اپنی معرکہ آرا کتابیں قلمبند کیں۔ ان کتابوں میں اس کی شہرۂ آفاق فلسفیانہ تصنیف "کتاب الشفاء" اور طب پر جامع تالیف "القانون فی الطب" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جب ابن سینا جرجان پہنچا تو بڑی خستہ حالت تھی۔ ابو محمد شیرازی نے اپنے پڑوس میں ایک مکان خرید کر اسے وہاں ٹھہرایا تاکہ وہ ابن سینا کے علم و فضل سے استفادہ کر سکے۔

قلمدان وزات

جرحان سے رے پہنچا تو شمس الدولہ کے دربار میں بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ شمس الدولہ اس وقت قولنج کی بیماری سے صاحب فراش تھا۔ ابن سینا نے اس کا علاج معالجہ کیا تو وہ بالکل تندرست ہو گیا۔ انعام و خلعت سے نوازا گیا۔ اور چالیس دن تک وہیں قیام رہا۔ شمس الدولہ دانائے مشرق کی خداداد قابلیتوں اور استعدادوں سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ابن سینا کو وزیر دفاع مقرر کر دیا۔ ابن سینا نے نظم و نسق برقرار کرنے کے لیے سختی سے کام لینا چاہا' نتیجہ یہ ہوا ابن سینا کے خلاف فوج میں بڑا احتجاج ہوا۔ ستم یہ ہوا کہ عام بغاوت پھوٹ پڑی۔ باغیوں نے ابن سینا کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اس کا سارا سامان اور مال و متاع لوٹ لیا۔ ساتھ ہی بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ ابن سینا کو قتل کر دے۔ شمس الدولہ نے اپنی فوج کی خاطر ابن سینا کو جلاوطن کر دیا' لیکن بعد ازاں اسے دوبارہ بلا بھیجا اور قولنج کا علاج کراتا رہا۔ یہاں تک کہ دوبارہ قلمدان وزارت ابن سینا کے سپرد کر

دیا گیا۔

ابن سینا کا ذوق علمی ملاحظہ ہو کہ دوران وزارت میں بھی علمی مشاغل نہ چھوڑے۔ دن بھر تو حکومت کے کام کاج میں مصروف رہتا اور رات کے وقت درس و تدریس میں مشغول ہو جاتا۔

قید و بند میں

شمس الدولہ کی وفات کے بعد حالات نے پھر پلٹا کھایا۔ ابن سینا کو ایک سازش کے الزام میں گرفتار کر کے قلعہ فردحان میں قید کر دیا گیا۔ اس قلعے میں چار مہینے تک قیام رہا اور یہیں ابن سینا نے اپنی مشہور کتاب "حی بن یقظان" تصنیف کی۔ اس کتاب میں ابن سینا کی قید و بند کی مشقتوں اور صعوبتوں اور صوفیانہ رموز کی طرف کافی اشارات پائے جاتے ہیں۔

قید سے چھٹکارا نصیب ہوا تو صوفیوں کے بھیس میں اصفہان کا رخ کیا۔ وہاں سلطان علاؤ الدولہ تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔

شوق تصنیف

ابن سینا کو تصنیف و تالیف میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ نہایت قلیل مدت میں کتاب لکھ ڈالتا۔ کبھی تو اس نے کتابیں جیل خانے میں لکھیں، کبھی سفر میں لکھیں، کبھی رات کے وقت اور کبھی محفل رقص و سرود میں۔ اس کی کتاب پڑھنے اور لکھنے میں بلا کی رفتار تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ابن سینا کے عزیز شاگرد ابو عبید جوزجانی نے ابن سینا سے درخواست کی کہ وہ کتاب الشفا کی تکمیل کر دے۔ ابن سینا نے فوراً قلم دوات اور کاغذ منگوایا اور لکھنے بیٹھ گیا۔ آن واحد میں کتاب کے سارے عنوان ضبط تحریر میں لے آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ابن سینا پچاس ورق یعنی سو صفحات روزانہ لکھا کرتا تھا۔

ابن سینا کی زندگی بڑی مصروف زندگی تھی۔ تکالیف و مصائب کی کثرت فرصت و فراغت کی قلت، خواہشات کے بے پناہ ہجوم، آرزوؤں اور امیدوں کا وفور اور ذوق میں

متنوع تھا۔ وہ مشکل سے مشکل کتاب اٹھاتا اور ایک ہی نظر میں اہم ترین مواقع اور مشکل ترین مسائل پر عبور حاصل کر لیتا۔ وہ تصنیفات و تالیفات کو دہرانے اور نظرثانی کرنے کا عادی نہ تھا۔ ابن سینا کی تصنیفات اس کے وسیع مطالعہ، گہری نظر، ہمہ گیر معلومات اور شاہ دماغی کی کھلی شہادت ہیں۔ ابن سینا نے فلسفہ، طب اور نجوم میں اتنا نام پیدا کیا کہ قرون وسطیٰ میں اس کی تالیفات بالخصوص کتاب الشفاء کتاب الاشارات، القانون اور کتاب النجاۃ علمائے مشرق و مغرب کا مرجع اور سرمایہ علم بنی ہیں۔

فلسفہ اور طب کے علاوہ ابن سینا کو علم نجوم سے بڑا شغف تھا۔ اسی انہماک و شغف کے پیش نظر سلطان علاؤالدولہ والی اصفہان نے زر کثیر صرف کر کے ابن سینا کے لیے ایک رصد گاہ تعمیر کروائی جہاں ابن سینا ستاروں کا مطالعہ کیا کرتا تھا، مگر یہ مطالعہ کوئی اہم نتیجہ خیز نئے تجربات اور معلومات فراہم نہ کر سکا، البتہ عیون الانباء کے مصنف کا کہنا ہے کہ ابن سینا نے فلکیات پر نہایت محققانہ اور پر مغز کتابیں لکھیں اور ایسے آلات رصدیہ ایجاد کیے کہ اس سے پہلے اس قسم کے آلات ایجاد نہ ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے قرون وسطیٰ میں یورپ کے لوگوں میں ابن سینا فلسفہ و حکمت کی نسبت علم نجوم میں بہت زیادہ مشہور و معروف تھا۔

ابن سینا نے قیام اصفہان کے دوران میں ایک بے نظیر عربی لغات کی داغ بیل ڈالی۔ مؤلف نے اس لغات کا نام "لسان العرب" رکھا۔ یہ عجوبۂ روزگار لغات ابن سینا کے اپنے مسودے تک ہی محدود رہی۔ کسی شخص کو اس کی ترتیب اور انداز کا علم نہ ہو سکا۔

بہرحال ابن سینا کی ذہانت اور جودت طبع کی یہ دلیل کافی ہے کہ اس نے علم و فن کے ہر شعبہ میں بڑی گراں قدر اور بلند پایہ تالیفات و تصنیفات چھوڑیں۔ اس مختصر مقالے میں یہ گنجائش تو نہیں ہے کہ اس دانائے علم کی تصانیف کی پوری فہرست یہاں درج کی جائے البتہ مختصراً عرض ہے کہ ابن سینا کی پچیس تیس کتابیں تو شائع ہو چکی ہیں۔ ایک سو بیس کے قریب مخطوطات کی صورت میں دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں محفوظ پڑی ہیں۔ جن میں فلسفہ و الٰہیات پر ۲۹، علم نجوم و طبیعات پر ۱۱، علم طب پر ۴۳، اور شعر و نظم

پر ۴ ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی پونے دو سو کتابیں ضائع ہو چکی ہیں' ان کے وجود کا کچھ علم نہیں۔ صرف ان کے نام تاریخ و سیرت کی کتابوں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ پونے دو سو کتابیں ضائع نہ ہوتیں تو ہمارے پاس علم و حکمت کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو جاتا۔

اسلوب نگارش

ابن سینا کی تمام تصانیف میں ایک ہی اسلوب نگارش نہیں ہے۔ بلکہ مختلف کتابوں میں مختلف انداز بیان نظر آتا ہے۔ کتاب الشفاء کی عبارت میں پختگی کم دکھائی دیتی ہے۔ اس کے مقابلے پر اس کی کتاب الاشارات کی عبارت بڑی فصیح و بلیغ اور مسجع ہے۔

اسلوب بیان میں اس اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شیخ الرئیس نے کتاب الشفاء تو عنفوان شباب میں لکھی جب کہ تحریر میں پختگی کم تھی اور اشارات عمر کے آخری دور کی یادگار ہے جب کہ اشہب قلم میدان تحریر میں ترکتازیوں کے باعث شہرت دوام کا باعث بن چکا تھا۔ کتاب الشفاء کے اسلوب کے بارے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ابن سینا نے اس کی تالیف ہمدان میں اس وقت شروع کی جب وہ قلمدان وزارت سنبھالے ہوئے تھا۔ سب سے پہلے طبیعات پر قلم اٹھایا۔ پھر الہٰیات پر۔ ان اسباب کے پیش نظر کتاب الشفاء اور اشارات کے اسلوب نگارش میں اختلاف چنداں تعجب انگیز نہیں رہتا۔

ابن سینا کے اسلوب کے سلسلے یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اس نے اپنے اکثر فلسفیانہ تصانیف میں بڑا علمی اور محکم انداز بیان اختیار کیا ہے۔ فلسفہ کی اصطلاحات دل کھول کر استعمال کی ہیں۔ اس کی تحریر میں بڑا اختصار ہے۔ اس نے اجمال پسندی کے ساتھ مترادف الفاظ اور تکرار بیان کو پاس تک آنے نہیں آنے دیا۔ اس وجہ سے عبارت بڑی مشکل اور مغلق ہو گئی ہے۔

اسلوب نگارش کے ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ابن سینا نے بعض چھوٹے چھوٹے رسائل میں رمز و کنایہ سے کام لیا ہے' مثلاً رسالہ "حی بن یقظان" اور "سلامان وابسال" اور "القدر" میں ان مختلف قصوں میں صناعت لفظی کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ الفاظ بڑے مشکل اور دقیق استعمال ہوئے ہیں۔ ان رسائل کا اسلوب بھی

علمی نہیں ہے۔ مشکل پسندی اور مغلق نویسی کا یہ حال ہے کہ ہر لفظ کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے لغت کی ورق گردانی کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔

معاصرین اور تلامذہ

ابن سینا کو اپنے عہد کے جلیل القدر اور یگانہ روزگار معاصرین سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ان کے خیالات سے اور وہ اس کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ ان نامور شخصیتوں میں ایک تو البیرونی تھا' جس کے متعلق جرمن مستشرق زخاؤ نے اظہار خیال کرتے ہوئے اسے دنیا کی سب سے بڑی عقل قرار دیا تھا۔ اسی طرح ابو سعید بن ابی الخیر سے ملاقات ہوئی۔ ابو سعید اپنے زمانے میں صوفیا کا امام تصور کیا جاتا تھا۔ فلسفہ اخلاق کا نامور عالم یعنی ابن مسکویہ کو بھی ابن سینا سے ملنے کا اتفاق ہوا اور علمی گفتگو ہوتی رہی۔

ابن سینا کے شاگردوں میں ابو عبید جوزجانی' ابو القاسم کرمانی' ابو عبداللہ معصومی اور بہمن یار بن مرزبان بڑے مشہور ہیں۔ عمر خیام نے بھی ابن سینا کو اپنے اساتذہ میں شمار کیا ہے۔ یہ سب لوگ ریاضت' طبیعات اور حکمت و فلسفہ پر صاحب نقد و نظر گزرے ہیں۔

چند علمی نظریئے

ابن سینا کے نزدیک زمین متحرک ہے' وہ کشش ثقل کا بھی قائل ہے' یعنی وہ کہتا ہے کہ چیزیں مرکز کی طرف کھنچے چلی آتی ہیں۔ علم طبقات الارض کے موضوع پر ابن سینا کی تحقیقات بڑی دلچسپ اور دقیق ہیں۔

ابن سینا کے نزدیک منطق کی حیثیت محض تعارفی علم کی ہے۔ فلسفہ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: (۱) نظری اور (۲) عملی۔ نظری فلسفے میں علم طبیعیات' علم ریاضیات اور مابعد الطبیعیات شامل ہیں۔ عملی فلسفہ علم اخلاق' اقتصادیات اور سیاسیات کو حاوی ہے۔

علم طبیعیات میں ارسطو اس کا استاد ہے۔ اگرچہ افلاطون کے اثرات بھی نمایاں ہیں' مثلاً یہ کہ ارضی واقعات ستاروں کے زیر اثر تو ہیں' مگر حرارت اور گرمی کے باعث

نہیں بلکہ نور اور روشنی کے ذریعے۔ اسی طرح افلاطون کے اثرات سے ابن سینا کے نفسیاتی نظریات بھی بچ نہیں سکے۔

ابن سینا نے ارسطو کی مابعد الطبیعیات کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے فلسفہ اور اسلامی عقائد کے درمیان یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

روح اور مادہ کے بارے میں اس کی بحث کا انداز فارابی سے زیادہ واضح ہے۔ ابن سینا کا خیال ہے کہ انفرادی روح کو موت نہیں۔

بعض غیر موافق اور خطرناک حالات میں ابن سینا کو تصوف کی پناہ لینا پڑی اور اس کے بغیر اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ کہ دشمنوں کے نرغے سے زندہ و سلامت بچ نکلتا۔ ابن سینا نے فقہ اور قرآن میں بھی دلچسپی لی۔ چند سورتوں کی تفسیر بھی لکھی، مگر اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے فلسفیانہ نظریوں کی تائید تلاش کرے۔

آب تک ابن سینا کو علم طب میں شیخ الرئیس کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے نظریات کو آخری اور قطعی سمجھا جاتا ہے۔ ابن سینا یونانی زبان جانتا تھا اور ممکن ہے کہ اس نے یونانیوں کے علوم سے بہت کچھ حاصل کیا ہو۔ بہرحال یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے اور فلسفہ و طب کے محققین کے لیے اس بارے میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔

وفات

ابن سینا نے زندگی کے آخری دن والی اصفہان سلطان علاؤ الدولہ کے سایۂ عاطفت میں گزارے۔ ۴۲۸ھ / ۱۰۳۷ء میں والی اصفہان نے ہمدان پر لشکر کشی کی۔ ابن سینا ساتھ تھا، راستے میں ایسا بیمار ہوا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔ ہمدان میں پہنچ کر جمعة المبارک کے دن ماہ رمضان ۴۲۸ھ میں جان اپنے جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اس کی قبر آج تک ہمدان میں اس فلسفی کی عظمت کا پتہ دیتی ہے۔

○○○

حکیمِ مشرق: ابونصر فارابی

حکیم مشرق فارابی کی وفات کو ایک ہزار برس گزر چکا ہے، لیکن اس کے علمی کارنامے اور حکیمانہ افکار آج بھی اپنے وہی جاذبیت ندرت اور تبحر رکھتے ہیں جس کی وجہ سے قرون وسطیٰ کے حکما اور مفکروں نے ایشیا اور یورپ کی دانس نگاہوں میں فارابی کی کتابوں کو اپنے لیے سرمایۂ عقل و دانش اور خزینۂ علم و حکمت قرار دیا تھا۔

فارابی ان مسلمان حکما میں سے ہے جن پر حکمت و فلسفہ کو ہمیشہ ناز رہا ہے۔ فارابی نے یونانی حکما کے فلسفہ کو نئی زندگی دی۔ حکیمانہ نظریۂ ریاست و حکومت سے پہلی مرتبہ مسلمان مفکروں کو روشناس کیا اور یونانی اور اسلامی اسلوب کے امتزاج سے ایک نئے مدرسۂ فکر کی بنیاد رکھی۔

ابو نصر محمد بن طرخان بن اوزلغ فارابی ۲۵۹ھ میں ترکستان کے شہر فاراب میں پیدا ہوا اور اسی نسبت سے فارابی مشہور ہوا۔ فارابی کا باپ فارسی النّسل تھا جس کا پیشہ سپہ گری تھا، لیکن ترکی سالاروں میں ابو نصر کے والد کو اتنی اہمیت حاصل نہ ہو سکی کہ تاریخ اس کے حالات محفوظ کر لیتی۔

فارابی شمع علم کا پروانہ تھا تحصیل علم کے شوق میں دنیا کی لذتوں اور آسائشوں کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ سفر کی کلفتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ گھر کی راحتوں اور ازدواجی زندگی کی مسرتوں سے یکسر محروم رہا۔ فارابی اپنے وطن میں علوم کی تحصیل سے فارغ ہو کر عراق پہنچا۔ بغداد میں سکونت اختیار کی، پھر حرّان پہنچا اور وہاں حکمت و فلسفہ کی تعلیم کے لیے یوحنا بن جیلان نصرانی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ منطق میں بھی خاصی دستگاہ پیدا کر لی، پھر بغداد واپس آیا۔ اور امام نحو ابوبکر بن السراج سے علم نحو سیکھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ فارابی اپنے معمر استاد ابن سراج سے نحو پڑھتا اور خود اسے منطق اور موسیقی میں سبق بھی دیتا تھا۔

فارابی نے دمشق میں کچھ عرصہ باغبانی بھی کی۔ جب علم و فضل کی شہرت ہوئی تو قاضی کا عہدہ سنبھالا، لیکن اسے علوم و معارف کا اتنا چسکا پڑ گیا تھا کہ عہدۂ قضا کو خیرباد کہہ کر علم و حکمت کے مطالعہ میں منہمک ہو گیا۔

بعض سیرت نگاروں کا خیال ہے کہ بغداد میں آنے سے پہلے فارابی عربی زبان سے قطعاً ناواقف تھا، یہ خیال بوجوہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ تیسری صدی ہجری میں عربی زبان تمام عالم اسلامی کی علمی زبان تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ فارابی جیسا ذہین انسان اس علمی زبان سے بالکل ناآشنا رہتا۔ اس کے علاوہ فارابی کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تحریر اور اسلوب میں بڑی پختگی ہے۔ اسے عربی زبان میں پورا عبور اور قدرت حاصل ہے۔ فارابی میں یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ مشکل ترین مطالب کو نہایت آسان اور سہل انداز میں بیان کرتا ہے۔ فارابی نے منطق و فلسفہ کی کتابوں کی شرحیں بڑے عام فہم طرز میں قلمبند کیں۔

فارابی ہفت زبان عالم تھا۔ ترکی، فارسی، یونانی، عبرانی اور عربی زبانوں میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ لفظوں کے اشتقاق کی بحث میں مختلف زبانوں کے الفاظ اس کی نوک قلم پر تھے۔ جب وہ نغموں اور موسیقی کی مختلف آوازوں کا ذکر کرتا ہے تو عربی ناموں کے ساتھ یونانی بھی درج کر دیتا ہے۔

فارابی نے حکمت و فلسفہ اور منطق میں بڑا نام پیدا کیا۔ ارسطو کی کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ موسیقی ریاضی اور طب میں بھی فارابی کی شہرت کچھ کم نہ تھی۔

اس عہد میں سیاسی فتنوں کا بڑا زور تھا۔ خلیفہ مقتدر اور اس کے جانشین بڑے کمزور ہو چکے تھے۔ مختلف امرائے بغداد کی حکومت کو حرص و آز کی نگاہوں سے دیکھتے اور مرکز پر قابض ہونے کے لیے سازشیں اور بغاوتیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد فتنوں کا گہوارہ بن کر رہ گیا۔ مذہبی تشدد پسند کچھ کم نہ تھے۔ ایک طرف حنبلیوں کے دینی تشدد سے دنیا چیخ اٹھی۔ دوسری طرف قرامطہ کی دسیسہ کاریاں رنگ لائیں۔ انہوں نے سیاسی غلبہ حاصل کر کے بحرین کے علاقہ پر قبضہ جما لیا، پھر بصرہ اور کوفہ پر ہلہ بول دیا۔ مکہ مکرمہ

میں لوٹ کا بازار گرم کیا اور بیت اللہ کی بے حرمتی کی۔

فارابی اپنی زندگی علم کی نذر کر چکا تھا' لیکن اس سیاسی خلفشار کے باعث اسے ایک جگہ سکون سے بیٹھنا میسر نہ آسکا۔ وطن چھوڑنے کے بعد چندے خراسان میں قیام کیا۔ پھر بغداد کو مسکن بنایا۔ بغداد کو چھوڑا تو حران جا پہنچا۔ کبھی حلب میں امیر سیف الدولہ بن حمدان کے دربار میں عزت پائی۔ کبھی مصر کا رخ کیا تو کبھی دمشق میں پناہ لی۔ یہی وجہ ہے کہ فارابی کی اکثر تصانیف مختصر ہیں اور اس کی بیشتر کتابیں دوران سفر میں مرتب ہوئیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک کتاب کا کچھ حصہ ایک شہر میں' کچھ حصہ دوسرے شہر میں اور کچھ حصہ تیسرے شہر میں پہنچ کر قلمبند ہوا۔

فارابی فن موسیقی میں بڑا ماہر تھا۔ اس نے قانون جیسا ساز ایجاد کرنے کے علاوہ ایک ایسا عجیب بربط اختراع کیا کہ دنیا اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اس بربط سے عجیب و غریب آوازیں پیدا ہوتی تھیں اور ان آوازوں کا اثر بھی کچھ کم حیران کن نہ تھا۔ مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ ایک دن سیف الدولہ دمشق میں علمی دربار سجائے بیٹھا تھا۔ ہر علم و فن کے ماہرین شریک محفل تھے۔ موسیقی اور گانا شروع ہوا۔ جب استادان فن اپنے اپنے ہنر دکھا چکے تو سیف الدولہ نے ابو فارابی سے پوچھا کہ کیا تمہیں موسیقی میں کچھ دستگاہ ہے؟ فارابی نے ہاں میں جواب دیتے ہوئے اپنے تھیلے سے کچھ لکڑیوں کے ٹکڑے نکال کر انہیں اس طرح ترتیب دیا کہ وہ ساز بن گیا۔ پھر فارابی کا اس ساز کا چھیڑنا ہی تھا کہ تمام حاضرین مجلس مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ فارابی نے ساز کو الگ الگ کر کے ایک دوسری شکل دی۔ ساز بجنے لگا سارے حاضرین بے ہوش ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سو گئے ہیں۔ فارابی اس محفل کو نیند کی حالت میں چھوڑ کر رفو چکر ہو گیا۔ دنیا اب تک محو حیرت ہے کہ ساز میں کیا تاثیر تھی جس نے ایک ہی محفل پر دو مختلف کیفیتیں طاری کر دیں۔

فارابی اپنے فکر و فلسفہ میں مست رہا۔ وہ دنیا کی نعمتوں سے بالکل بے نیاز رہتا۔ نہ اسے مال و دولت کی چاہت تھی نہ جاہ و مرتبہ کی محبت۔ اس نے تجرد کی زندگی قلندرانہ انداز میں بسر کر دی۔ فارابی فقیرانہ زندگی میں شان قلندری رکھتا تھا۔ اس میں ایک علمی

تمکنت مفکرانہ شان و شوکت اور حکیمانہ جاہ و جلال موجود تھا۔ فارابی کو اپنی عزت نفس کا بڑا پاس اور اپنی شرافت پر ناز تھا۔ اس مرد قلندر کو اپنے مقام علمی اور موقف فکر و حکمت کا اتنا احساس تھا کہ اس کی گردن ریاست و ثروت کے سامنے کبھی نہ جھک سکی۔ باوجود اس بات کے کہ سیف الدولہ نے بیت المال سے فارابی کے لیے معقول وظیفہ مقرر کر دیا تھا' لیکن فارابی روزانہ صرف چار درہموں پر بسر اوقات کرتا اور اس سے زیادہ بیت المال سے وصول نہ کرتا۔

فارابی طبعاً" زاویہ نشین اور عزلت پسند تھا۔ یہ گوشہ نشینی دنیا سے بیزاری یا انسانوں سے نفرت کے باعث نہ تھی' بلکہ تربیت و ریاضت اور تحکیم و تقویم نفس کی خاطر تھی' فارابی چاہتا تھا کہ تنہائی میں بیٹھ کر حقیقت و صداقت کی کنہ (حقیقت) تلاش کرے۔

مشرق کا یہ مایہ ناز فرزند ۳۳۹ھ/۹۵۱ء کو دمشق میں سفر آخرت اختیار کر گیا۔

فارابی کی تصانیف کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ ۱۱۷ کتابیں اس کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں۔ کثرت تصنیف و تالیف کے باوجود فارابی کی کتابیں سنگ میل کا حکم رکھتی ہیں۔ فارابی نے منطق فلسفہ و حکمت' شعر و خطابت' ہندسۂ و حساب' نجوم و موسیقی' طبیعیات و الہیات' نفسیات' اخلاق و سیاست اور اصول شہرت پر قلم اٹھانے کے علاوہ حکمائے یونان کی کتابوں کی بہت سی شرحیں بھی قلمبند کی ہیں۔ فارابی کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی بے نقاب ہوتی ہے کہ اسے اوسطو' افلاطون' بقراط اور جالینوس کی کتابوں اور افکار و خیالات پر بڑا عبور تھا۔

فارابی کی تصانیف میں یہ کتابیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں: فی آراء اہل المدنیة الفاضلة' احصاء العلوم' تحصیل السعادة ' معانی العقل' الجمع بین رائی الحکمیمین' السیاسة المدینة' فضیلة العلوم والصناعات' کتاب الموسیقی' رسالة الفصوص' وغیرہ۔ یہ کتابیں فارابی کا تالیفی شاہکار ہیں' حسن ترتیب' ربط موضوع اور لفظی و معنوی خوبیوں کی وجہ سے ان کتابوں کا درجہ بڑا ممتاز اور بلند تھا۔

قرون وسطیٰ میں فارابی کی بہت سی کتابوں کے ترجمے عبرانی' لاطینی اور فرانسیسی

زبانوں میں کیے گئے اور مغرب کے بہت سے فلسفیوں نے ان تراجم سے بڑا استفادہ کیا۔

فارابی کی توجہ زیادہ تر منطق پر مرکوز رہی اور اس نے بہت سے بنیادی ابواب کا اس میں اضافہ کیا۔

یونانی مفکروں میں سے حکیم ارسطو کا اثر فارابی پر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

ہمارے دانائے راز نے ارسطو کی تمام کتابوں کو بنظر غائر پڑھا۔ ایک ایک حرف پر غور و فکر کیا۔ ایک ایک کتاب کا کئی کئی مرتبہ مطالعہ کیا۔ جب تک تمام اشکال اور اسرار کو سمجھ نہیں لیا اس کتاب کو نہیں چھوڑا۔

سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ ارسطو کی کتاب النفس کو فارابی نے ایک سو مرتبہ پڑھا اور یہ واقعہ خود فارابی نے اپنے مستقل نسخہ کتاب پر رقم کیا ہے۔ اسی طرح ارسطو کی کتاب "السماع الطبیعی" کو چالیس مرتبہ پڑھنے کے بعد بھی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ کتاب فہمی کے ضمن میں اتنی بڑی عزیمت اور استقلال کی مثال فارابی کی محنت و مشقت کی شاہد عادل ہے۔ فارابی ارسطو کی کتابوں کا اتنا دلدادہ تھا اور اس نے اتنا فائدہ اٹھایا کہ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر میں ارسطو کے زمانے میں ہوتا تو اس کا سب سے بڑا شاگرد کہلاتا۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ فارابی اور ارسطو کے نظریوں میں چنداں فرق نہیں، لیکن اندلسی مفکّر اسلام ابن رشد کہتا ہے کہ فارابی اور ارسطو کے نظریوں میں خاصا فرق ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ دونوں کے فکر کی پرواز اتنی بلند تھی کہ ارسطو معلّم اول اور فارابی کو معلم ثانی کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

فارابی کا مقام علم و فکر اتنا بلند تھا کہ ابن سینا جیسے شاہ دماغ مفکروں کو بھی فارابی کی خوشہ چینی کے بغیر چارہ نہ تھا۔

اگر فارابی اپنی کتاب "التعلیم الثانی" نہ لکھتا تو ابن سینا کی کتاب "الشفا" کبھی معرض وجود میں نہ آتی۔ اگر فارابی معلم اول ارسطو کی کتاب مابعدالطبیعۃ کی اغراض پر سیر حاصل بحث اور اس کی توضیح نہ کرتا تو ابن سینا اس کتاب کو سمجھنے سے عمر بھر قاصر رہتا۔

اگر ابن رشد بھی فارابی کے نظریۂ حدوث عالم سے استفادہ نہ کرتا تو وہ بھی حکمت و شریعت میں کبھی موافقت پیدا نہ کر سکتا۔

فارابی کی یہ بڑی قابل قدر خوبی ہے کہ وہ حکمائے یونان کے مختلف نظریوں کے درمیان ایک گونہ مناسبت اور موافقت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کرتا ہے۔ فارابی نے اپنی کتاب "الجمع بین رائی الحکیمین" میں حکیم افلاطون اور ارسطو کے خیالات میں موافقت تلاش کی ہے۔ اسی طرح دوسری کتاب "فی اتفاق آراء بقراط و افلاطون" میں حکیم بقراط اور افلاطون کے افکار میں ایک مناسبت پیدا کر لی ہے اور تیسری کتاب "التوسط بین ارسطاطالیس و جالینوس" میں ارسطو اور جالینوس کے درمیان یگانگت اور ہم آہنگی ظاہر کی ہے۔ واقعی فارابی کا یہ بڑا کمال اور ہنرمندی تھی کہ اس نے اتنے مختلف نظریوں اور فلسفیوں پر اس انداز اور گہرائی سے غور و فکر کیا کہ ان کے درمیان کوئی تضاد اور باہمی اختلاف باقی نہ رہا۔

فارابی کا فلسفہ اپنے عہد کی تمام کوششوں کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ اس کے زمانے میں علم کلام اور اسلامی فرقوں کے درمیان بحث مناظرہ اپنے شباب پر تھا۔

فارابی نے ابو الحسن اشعری سے علم کلام سیکھ کر اپنے مخالفوں کے خلاف خوب استعمال کیا۔ فارابی نے باطنیوں کے اندر رہ کر ان کی مجوسیت کا قریب سے مطالعہ کیا۔

اس نے منصور حلاج کی دعوت کو سنا اور اس کا انجام بھی دیکھا۔ وہ اپنے تمام معاصر متکلمین سے بھی ملا، لیکن ان سے بڑا دل برداشتہ اور بیزار ہوا۔

فارابی صرف ان کے دلائل و براہین کو ہی ناپسند نہ کرتا، بلکہ وہ ان کی دیانت اور اخلاق سے بھی نالاں تھا۔

فارابی کا فلسفہ مختلف فلسفوں کا امتزاج ہے۔ اس میں افلاطون کا رنگ بھی جلوہ گر ہے۔ فارابی کی "مدینۂ فاضلہ" اور افلاطون کی ریاست و جمہوریت" میں بڑی ہم آہنگی نظر آتی ہے حرکت و صورت اور اجرام فلکی کے نظریئے میں وہ ارسطو کا ترجمان ہے۔ وہ اخلاقیات میں مشائی ہے۔ جدید افلاطونی مدرسہ فکر کا رنگ بھی اس کے فلسفہ میں نمایاں

ہے۔ تقدیر و اختیار کے مسئلے میں فارابی خالص اہل سنت کے زاویہ نگاہ کی وکالت کرتا ہے' وہ حشر نشر کے بعد دیدار الٰہی کا جواز بھی پیش کرتا ہے' فارابی متصوّف بھی ہے۔ وہ وحدت الوجود اور تجلی کا قائل نظر آتا ہے۔ بہرحال فارابی اپنے فکر و نظر کی وسعت کے باعث مدرسہ الٰہیات و منطق کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔

فارابی کی تصنیفات مصر و شام' بغداد و بخارا اور یورپ کے تمام علمی مرکزوں میں بڑے انہماک اور توجہ سے پڑھی جاتی تھیں۔ مشرق و مغرب کے حکما یکساں طور پر فارابی کی شمع حکمت سے مستفید ہوئے۔ مسلمان اور یہودی دانشوروں کے علاوہ قرون وسطیٰ کے عیسائی حکما بھی فارابی کے افکار و خیالات سے بہت زیادہ اثر پذیر ہوئے۔

فارابی کی رائے ہے کہ فلسفہ علم و عمل دونوں کو حاوی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فلسفہ موجودات کی حقیقت کا ایسا علم ہے جسے انسان، محنت و کوشش سے حاصل کرتا ہے۔ یہ علم یقینی ہے جو محض برہان و دلیل پر مبنی ہے' ظن اور تقلید سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ فارابی کے نزدیک فلسفی کے لیے فطری طور پر نظری علوم کی استعداد ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فلسفی کا فہم و تصور نہایت اعلیٰ اور اس کی قوت حافظہ بہت اچھی ہونی چاہیے۔ وہ تحصیل علم میں مشقت و محنت برداشت کرنے کا جذبہ رکھتا ہو' اور طبعاً" صداقت شعار اور انصاف پسند ہو۔ وہ نہ تو جھگڑالو اور ہٹ دھرم ہو نہ حریص و لالچی۔

فارابی کے نزدیک نظری فلسفہ میں علوم ریاضی۔علم طبعی اور علم الٰہی شامل ہیں اور عملی فلسفہ علم اخلاق اور علم سیاست' علوم ریاضی میں فارابی علم ہندسہ' علم عدد' علم نجوم اور علم موسیقی کو شامل کرتا ہے۔ اور علم طبیعی میں علم معدنیات' علم نباتات' علم فلکیات' علم اجسام وغیرہ کو۔

حکیم مشرق کے نزدیک نظری فلسفہ کا فائدہ یہ ہے کہ موجودات کی معرفت حاصل کر کے انسانی کمال حاصل کیا جائے اور علمی فلسفہ کا مقصد علم و عمل سے تاکہ نفس کو فضائل کا عادی بنا کر رذائل سے بچائے رکھیں۔

فارابی کے نزدیک فلسفی کا فرض ہے کہ وہ افراد کی اصلاح کرے۔ انسانی معاشرہ کو مہذب بنائے اور افراد و معاشرہ دونوں کی زمام سیاست ہاتھ میں لے کر عدل و انصاف قائم

کرے۔

فارابی کا کہنا ہے کہ زندگی کے عناصر ترکیبی علم و عمل دونوں ہیں اور جو شخص محض نظری علوم پڑھ کر فلسفی بن جاتا ہے اور اس کا دامن عمل سے بالکل تہی ہے تو ایسے فلسفی کو زندگی سے کوئی تعلق اور لگاؤ نہیں ہے۔ معلم ثانی کی نگاہ میں علم اخلاق اور سیاست عملی فلسفہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اس کا نظریہ یہ ہے کہ فلسفہ کی غرض و غایت سعادت دارین کا حصول ہے اور اس سعادت کا حصول علم سیاست اور علم اخلاق کے بغیر ناممکن ہے۔

فارابی فقہ اور کلام میں حد فاصل قائم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ فقیہ کا منصب یہ ہے کہ شارع علیہ السلام کے مسلمہ اقوال و افعال کو اصولی طور پر تسلیم کر کے دوسرے مسائل استنباط کرے، لیکن ایک متکلم کا کام محض فقیہ کے اصولوں کی اعانت کرنا ہے مسائل کا استنباط متکلم کے حیطۂ اختیار میں نہیں ہے۔

مسلمانوں میں فارابی پہلا مفکر ہے جس نے خالص فلسفیانہ زاویۂ نگاہ سے سیاست اور نظام حکومت پر بحث کرتے ہوئے ایک مثالی ریاست و حکومت کا نقشہ تیار کیا ہے۔

یہ ایسی ریاست ہے جس کا رئیس یا حکمران کائنات کا بہترین فرد ہے۔ یہ رئیس اس ریاست کا روح رواں ہے۔ اس ریاست کے جمہور و عوام سعادت دارین کے حصول میں بڑی سرگرمی سے کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس ریاست میں عدل و انصاف کا رواج ہے۔ یہاں نہ کوئی دکھیا ہے نہ مظلوم و مجبور۔

مختصر یہ کہ فارابی اپنی طرز کا ایسا مفکر و دانشور ہے کہ تاریخ اسلام میں اس کی مثال نظر نہیں آتی۔

○○○

جعفر برمکی : خلیفہ ہارون الرّشید کا وزیر

جعفر برمکی ہارون الرشید کا بڑا صاحب اقتدار وزیر تھا۔ اثر و رسوخ کے اعتبار سے عباسی عہد کا کوئی وزیر بھی اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ جب تک جعفر زندہ رہا۔ حکومت کی داخلی اور خارجی پالیسی اس کے ہاتھ میں رہی۔ اتنے اقتدار و اختیار کے باوجود اس کی خوش خلقی ضرب المثل تھی۔ وہ ہر شخص سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتا۔ وہ جود و سخاوت میں بے مثل تھا اور فصاحت و بلاغت اور زور بیان کے گھر گھر چرچے تھے۔

جعفر ایران کے مشہور خاندان برمک کا چشم و چراغ تھا۔ برمک کوئی ملکی، قبائلی یا مخصی نام نہیں، بلکہ یہ تو بلخ کے مشہور و معروف عبادت خانہ نو بہار کے بڑے پروہت و متولی کا خاندانی عہدہ اور منصب تھا۔ بعض مؤرخ نوبہار کو آتش کدہ بتاتے ہیں اور بعض بدھ مت کا مندر۔ خواہ یہ آتشکدہ نوبہار تھا یا بت کدہ نوبہار۔ یہاں کے متولی کو برمک کہتے تھے۔ نیز اس معبد کے ساتھ بہت سی جاگیر وقف تھی۔ جو مدت تک خاندان برمک کے قبضہ میں رہی۔

خالد برمکی اس خاندان کا سب سے پہلا وزیر تھا۔ جس نے خلیفہ ابو العباس سفاح کے زمانے میں قلمدان وزارت سنبھالا۔ خالد کا بیٹا یحییٰ بھی عباسی خلیفہ کے دربار میں بڑا بارسوخ اور صاحب اقتدار وزیر رہا۔ خلیفہ ہارون الرشید تو یحییٰ برمکی کا اتنا احترام کرتا تھا کہ "ابا جان" کے سوا کسی اور لقب سے یاد نہ کیا۔ جعفر برمکی اسی یحییٰ کا بیٹا تھا۔ یہ بڑی دلچسپ بات تھی کہ اسلام کے دور اول میں عہدۂ وزارت موجود نہ تھا۔ تاریخ اسلام میں یہ منصب عباسی عہد خلافت کی یادگار ہے۔

عرب، لفظ وزیر سے تو ضرور آشنا تھے، لیکن یہ لفظ معاون اور مددگار کے معنوں

میں استعمال ہوتا تھا۔ منصب وزارت خلفائے راشدین اور خلفائے بنی امیہ کے عہد میں موجود نہ تھا۔ البتہ قرآن مجید میں حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وزیر کہا گیا ہے۔ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے انتخاب کے موقع پر مہاجرین کو امیر اور انصار کو وزیر کے لقب سے یاد کیا گیا۔ ابن سعد نے طبقات میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وزیر کہا ہے۔ بنو امیہ کے عہد میں خلیفہ کا مشیر اعلیٰ کاتب کہلاتا تھا۔ بنو عباس کا پہلا خلیفہ سفاح پہلا تاجدار ہے' جس نے اپنا وزیر مقرر کیا اور ابو سلمہ خلال پہلا وزیر ہوا۔

وزارت اور اقتدار جعفر کو ورثہ میں ملے تھے۔ اس کا دادا خالد اپنی لیاقت' دانشمندی اور پختہ رائے کی وجہ سے خلیفہ کا مقبول نظر رہا۔ جعفر کا باپ یحییٰ قلمدان وزارت سنبھالتے ہی انہی اوصاف کی بدولت حاکم مطلق بن گیا۔ اس کا بھائی فضل بھی بلا کا ذہین تھا۔ فضل نے نہروان سے لے کر ترکستان تک کے علاقوں پر حکومت کی۔ خراسان میں کامیاب جنگیں لڑیں۔ خراسان میں ایک لمبی نہر کھودی۔ بخارا میں ایک شاندار جامع مسجد تعمیر کرائی اور ماہ رمضان میں مسجدوں میں روشنی کے انتظام کا رواج ڈالا۔

جعفر اپنی قابلیت' ذہانت' عقل و دانش اور اقتدار کے لحاظ سے اپنے تمام بزرگوں سے گوئے سبقت لے گیا۔ جعفر میں یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ ایک طرف تو خلیفہ کے مزاج اور طبیعت سے خوب واقف تھا اور دوسری طرف رعایا کو بھی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ذاتی وجاہت اور سیاسی اقتدار کے باعث حکمران طبقے سے جعفر کے بڑے گہرے مراسم اور دوستانہ تعلقات تھے اور حسن اخلاق' مروت اور فیاضی کی وجہ سے رعایا میں بھی بڑی ہردلعزیزی حاصل تھی۔

جعفر کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ اس کی تقریر و تحریر میں بڑا بانکپن اور حسن و جمال تھا۔ فصاحت و بلاغت میں کوئی شخص اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ جعفر کی شیریں بیانی کا یہ حال تھا کہ جب بولتا تھا زبان سے شہد ٹپکتا اور منہ سے پھول جھڑتے

تھے۔ سلاست اور سہل پسندی کا یہ عالم تھا کہ اس کی بات فوراً سمجھ میں آجاتی۔ اسے کبھی ضرورت پیش نہ آتی کہ الفاظ کو دہرائے یا مطالب کو کسی دوسرے انداز بیان میں ادا کرے۔ اس کی گفتگو میں اتنی روانی اور تسلسل ہوتا تھا کہ دوران کلام میں کبھی نہ رکتا نہ کھانستا' الغرض وہ بڑا قادر الکلام شخص تھا۔ موزوں اور مناسب الفاظ ہر وقت اس کی زبان پر ہوتے تھے۔ اثنائے گفتگو میں کبھی بات سوچنے کی حاجت نہ ہوئی۔ اس کی باتوں میں تکلّف کا نام تک نہ تھا۔ جعفر کی باتیں اتنی دلچسپ اور پر تکلف ہوتیں کہ سننے والے ہر لحظہ نئے لطف و سرور سے بہرہ اندوز ہوتے۔ امام ادب الجاحظ نے ثمامہ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے جعفر بن یحییٰ سے زیادہ فصیح اور شستہ کلام آدمی نہیں دیکھا۔

جعفر برمکی نے اپنے تدبر و سیاست اور عقل و دانش سے خلیفہ ہارون کو اس درجہ مسحور و فریفتہ کر لیا تھا کہ خلیفہ کو اس سے ایک لمحہ کی جدائی بھی گوارہ نہ تھی۔ جعفر بھی اپنے اقتدار کی خاطر دارالخلافہ کو چھوڑنے کا نام نہ لیتا' تھا باوجودیکہ جعفر کو کئی مرتبہ مختلف علاقوں کی حکومت تفویض کی گئی' لیکن ہر مرتبہ اس نے اپنے نائب مقرر کر دیئے اور خود ان صوبوں میں نہ پہنچا۔

ابتدا میں وزیر کے فرائض دیوان الرسائل تک محدود تھے۔ دیوان الرسائل خاص شاہی دفتر تھا اور اس محکمہ کے سپرد یہ کام تھا کہ ایوان خلافت سے جس قدر روزانہ احکام جاری ہوں ان کا اجرا کرے۔ بعد میں جب کاروبار سلطنت بڑھ گیا تو وزیر کو دیگر دفتری اور مالی انتظامات بھی سونپ دیئے گئے۔ جب خلیفہ ہارون الرشید نے جعفر برمکی کو لوگوں کی عرضداشتوں پر فیصلے لکھنے کا اختیار تفویض کر دیا تو وزیر سلطنت کے اختیارات بہت وسیع ہو گئے۔ جعفر تمام ملکی معاملات میں خلیفہ کا قائم مقام تھا۔ وہی فوجوں کی نگرانی کرتا' مالی امور کی دیکھ بھال بھی اسی کا فرض تھا۔ وہی مختلف اطراف و اکناف میں خطوط بھیجتا اور حاکم عادل کی حیثیت میں عوام کی عرضیوں اور درخواستوں پر فیصلے ثبت کرتا تھا۔ علوم و فنون کی سرپرستی بھی اسی کے فرائض میں شامل تھی۔

عباسیوں کے عہد میں یہی دستور تھا کہ ایک وزیر تمام معاملات کو سرانجام دے۔

تقسیم کار کے خیال سے مختلف امور سلطنت کو مختلف وزیروں میں تقسیم کرنے کا سہرا خلفائے اندلس کے سر ہے۔ وزیر مالیات، وزیر مواصلات، وزیر عدل و انصاف، وزیر دفاع اور وزیر سرحدات، یعنی امور خارجہ سب وزارتیں تاریخ اسلام میں اولاً" اندلس میں پیدا ہوئیں، لیکن جعفر برمکی تنہا ان سب وزارتوں کو سنبھالے ہوئے تھا۔

جعفر کی شخصیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید جہاں کہیں جاتا جعفر کو ساتھ رکھتا۔ خلیفہ اور وزیر کا کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا اور سونا جاگنا ایک تھا۔ دونوں ایک ہی قسم کا لباس پہنتے۔ گھڑ دوڑ میں دونوں کے گھوڑے دوڑتے تھے اور بازی لگائی جاتی تھی۔ قصر خلافت میں کسی خاتون کا جعفر سے پردہ نہ تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید اپنے وزیر کی قابلیت اور ذہانت پر ہمیشہ ناز کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں میں سب سے قابل قدر اور لائق فخر جعفر برمکی کی ذات ہے۔

جعفر کے اقتدار و اختیار کا دائرہ صرف امور سلطنت تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ اسے خلیفہ کے نجی معاملات میں بھی بڑا دخل تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عبدالملک بن صالح ہاشمی جعفر کے پاس آیا اور دوسری درخواستوں کے علاوہ ایک درخواست یہ بھی کی کہ خلیفہ کی دختر نیک اختر سے میرے لڑکے ابراہیم کا عقد ہو جائے۔ جعفر نے اپنی روایتی فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے عبدالملک کی یہ درخواست بھی قبول کر لی۔ بعد ازاں جعفر نے خلیفہ ہارون رشید سے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے بھی رضامندی کا اظہار کیا، چنانچہ شہزادی عالیہ کا عقد ابراہیم سے ہو گیا۔

علم و فضل، تدبر و دانشمندی اور سیاست و اخلاق میں جعفر کا کوئی سہیم و شریک نہ تھا۔ جعفر نے قاضی ابو یوسف سے فقہ کے علاوہ اور علوم بھی پڑھے تھے۔ خلیفہ ہارون رشید کو جعفر کے علم و فضل پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے اپنے بیٹے مامون کی تعلیم و تربیت جعفر کے سپرد کر دی تھی۔ وزیر سلطنت جعفر نے مزاج فقیہانہ پایا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ لوگوں کی عرضیوں پر اتنے اچھے فیصلے لکھتا اور قانونی نکتے پیدا کرتا تھا کہ بڑے بڑے قاضی دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ جعفر نے ایک رات خلیفہ کی موجودگی میں ایک ہزار درخواستوں پر فیصلے لکھے۔ پھر خلیفہ ہارون نے ان تمام درخواستوں کا بغور مطالعہ کیا تو جعفر کے فیصلوں کو پڑھ کر خلیفہ حیران رہ گیا کہ ایک فیصلہ بھی فقیہانہ اسلوب کے منافی نہیں تھا۔

فہم و فراست میں بھی جعفر کا کوئی ہم پلّہ نہ تھا۔ وہ مقدمات اور الجھے ہوئے جھگڑے، جن کے فیصلے سے بڑے بڑے فقیہ اور قاضی عاجز رہ گئے۔ جعفر نے ان مقدموں کا چند روز میں اس عمدگی اور خوبصورتی سے فیصلہ کر دیا کہ ائمہ و فقہا جن میں قاضی ابو یوسُفؒ، یحییٰ بن معینؒ اور امام محمد شیبانیؒ بھی تھے، عش عش کر اٹھے اور انہیں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اگر جعفر برمکی چند روز اصول و فروع فقہ کو توجہ دے تو تمام فقہا سے اس کا مرتبہ بلند ہو جائے۔

جعفر برمکی دوستوں سے بڑی مروت اور حسن سلوک سے پیش آتا تھا۔ احسان کر کے بھی نہ جتاتا۔ احمد بن جنید اسکافی کے جعفر سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ کسی کام کے لیے احمد کی سفارش حاصل کر لینا اس کام کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ احمد اسکافی کے پاس لوگوں کی بہت سی عرضیاں اور درخواستیں جمع ہو گئیں۔ جعفر ملکی کاموں میں اتنا مصروف رہا کہ احمد کو سفارش کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ ایک دن فرصت پا کر احمد نے جعفر سے کہا کہ لوگوں کی بہت سی عرضداشتیں جمع ہو گئی ہیں۔ اگر وقت ہو تو ان پر نگاہ ڈال لی جائے۔ جعفر نے اس شرط پر وعدہ کیا کہ وہ جعفر کے ہاں قیام کرے۔ احمد اسکافی نے یہ شرط بخوشی قبول کر لی، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اس دن بھی جعفر کو فرصت نہ مل سکی۔ دوسرا دن بھی مصروفیت میں گزر گیا، جب رات ہوئی احمد اسکافی تو سو گیا، مگر جعفر سرکاری کاغذات دیکھتا رہا۔ کافی رات گزر جانے کے بعد جعفر نے خادم کے ذریعے چپکے سے احمد کے کاغذات اور درخواستیں منگوا کر تمام درخواست کنندگان کی عرضداشتوں کو منظور کر لیا۔ درخواستوں پر منظوری کے احکام صادر کر کے پھر وہیں رکھوا دیں۔ بعد میں احمد کو مطلقانہ جتایا کہ تمہاری تمام سفارشات منظور کر لی گئی تھیں۔

جعفر محنت و مشقت سے کبھی نہ گھبراتا۔ اس کی عادت تھی کہ نصف رات گئے تک بھی سرکاری معاملات میں مشغول رہتا۔ دفتری کاغذات کے انبار لگے ہوتے تھے۔ جب تک تمام کاغذات پڑھ کر اپنی رائے نہ لکھ لیتا سونے کا نام نہ لیتا تھا۔

جعفر کا دست سخاوت بلاامتیاز مذہب و ملت سب کی طرف بڑھتا۔ صوفی، فقیہ، ادیب، شاعر، بچے، بوڑھے، مرد، عورت سب اس کی سخاوت کے احسان مند تھے۔ جب کسی نے سوال کیا تو اس کی درخواست سے بڑھ چڑھ کر عطا کیا۔ وزیر سلطنت جعفر علما اور ادبا سے بڑے انکسار اور تواضع سے پیش آتا تو ملاقات کے لیے ان کے گھر جا نکلتا۔

جعفر خود بڑا وضعدار تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ادیب اور شاعر اس کی سخاوت سے بہرہ مند ہونے کے بعد زندگی میں وضعداری قائم کریں اور اگر کوئی ادیب ہزاروں اشرفیاں حاصل کرنے کے بعد بھی اپنی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرتا، تو جعفر دست سخاوت کھینچ لیتا۔ ایک مرتبہ وہ اصمعی کے گھر جا نکلا اور ایک ہزار اشرفیاں اصمعی کو دینے کی نیت سے اپنے ساتھ لے گیا۔ مگر اصمعی کی پھٹی پرانی چٹائیاں، میلے کچیلے بستر اور ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں دیکھ کر کہنے لگا کہ اس قسم کا خسیس اور بخیل انسان ہماری سخاوت کا حقدار نہیں ہو سکتا، جس نے ہزاروں اشرفیاں انعام پا کر بھی اپنے معیار زندگی کو بلند نہیں کیا۔

جعفر بڑا طبّاع اور ذہین تھا۔ اپنے پرائے سب اس کی ہوشمندی اور دانائی کی داد دیتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک یہودی نجومی ہارون رشید کو ملا اور کہنے لگا کہ آپ کی موت اسی سال واقع ہونے والی ہے۔ یہ بات سن کر خلیفہ کو قدرتی طور پر بڑا غم ہوا۔ چنانچہ خلیفہ نے اس بات کا ذکر جعفر سے کیا۔ خلیفہ کے غم کو غلط کرنے کے لیے جعفر نے بڑی اچھی تدبیر سوچی۔ اس نے مشورہ دیا کہ پریشانی کی ضرورت نہیں۔ یہ نجومی دھوکہ باز اور مکار انسان ہے اس نے بلا وجہ خلیفہ کو پریشان کیا ہے، لہٰذا اس کی سزا قتل ہے، چنانچہ اس یہودی نجومی کی گردن اڑا دی گئی۔

جعفر کی سخاوت کا یہ حال تھا کہ اپنے عہد وزارت میں ۵۰۔ ۵۰ ہزار اشرفیاں

لوگوں کو ایک وقت میں دے دیں۔ جعفر کی یہ فیاضی بھی کچھ کم حیرت افزا نہیں کہ اس نے بیک وقت ایک ہزار شاعروں کو ایک ایک ہزار درہم فی کس عطا کیے۔ جعفر ائمہ دین کا بھی بڑا احترام کرتا اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتا تھا۔ ایک دن اس نے امام شافعیؒ کو بلا بھیجا۔ حضرت امام تشریف لائے۔ وزیر سلطنت سے باتیں ہوتی رہی ہیں۔ جب امام شافعیؒ واپس تشریف لے جانے لگے تو جعفر نے دو ہزار اشرفیاں آپ کی نذر کیں۔

وزیر سلطنت کی مقناطیسی شخصیت کے ارد گرد سیکڑوں باکمال ادیب، شاعر، عالم اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین جمع ہو گئے تھے۔ اس کی سرپرستی میں یونانی، فارسی اور سنسکرت زبانوں سے ترجمے ہو کر عربی زبان کے دامن کو فلسفہ منطق اور نجوم سے مالا مال کرنا شروع کر دیا۔ اس نے برصغیر پاک وہند کے طبیبوں کی سرپرستی کی اور ان کی طبی کتب کو عربی زبان میں منتقل کرایا۔

جعفر کی علمی و ادبی مجلسوں میں جہاں بڑے بڑے فقہا تشریف فرما ہوتے۔ وہاں اصمعی جیسے نجومی، ثمامہ جیسے ادیب، ابونواس، ابوالعتاہیہ اور صریع الغوانی جیسے شہرہ آفاق شاعر بھی شریک مجلس ہوتے تھے۔

جعفر نے کتاب کلیلہ و دمنہ کو ۱۴ ہزار شعروں میں نظم کرایا اور مؤلف کو ایک لاکھ درہم بطور انعام دیئے۔ جعفر کی سرپرستی میں ابراہیم نظام نے فلسفۂ ارسطو کا بنظر عمیق مطالعہ کیا اور اس پر اپنی تنقید لکھی۔

جعفر نے فنون لطیفہ اور بالخصوص موسیقی کو ترقی دینے میں بڑا حصہ لیا۔ اس نے ابراہیم موصلی اور دوسرے ماہرین موسیقی کو انعام و اکرام سے نواز کر ان کی بڑی حوصلہ افزائی اور قدردانی فرمائی۔

جعفر بڑا مدبر اور سیاست دان وزیر تھا۔ اس کے حسن تدبر سے بڑے بڑے معرکے سر ہوئے اور شام کے قبائل کی بغاوت فرو ہوئی۔

جعفر کے تدبر و سیاست کا یہ پہلو بھی کچھ کم اہم نہیں کہ وہ جمہور کی نفسیات کو خوب سمجھتا تھا۔ جب شہزادۂ امین اور مامون کو صوبائی حکومتیں تفویض کرنے کا سوال پیدا

ہوا تو جعفر نے ملک کو اس طرح تقسیم کیا کہ عرب ممالک کو الگ کر دیا اور غیر عرب علاقوں کو الگ۔ تاریخ اسلام میں یہ پہلا موقع تھا کہ سلطنت کو قومی اور نسلی اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ جعفر کی تجویز کے مطابق مامون کو خراسان، فارس، ماوراء النہر اور ترکستان کا حکمران مقرر کیا گیا اور امین کو حجاز و عراق اور مصر و شام کی حکومت سپرد کر دی گئی۔ اس ملکی تقسیم میں جعفر کی سیاسی مصلحت یہ تھی کہ مامون ماں کی طرف سے عجمی تھا اور اس کو خراسان و فارس وغیرہ کا علاقہ دیا گیا جو ایرانیوں کا مرکز تھا اور اسی ملکی اور مادی رشتہ کی وجہ سے عجمی لوگ مامون کو اپنا بھانجا سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس شہزادہ امین کی رگوں میں خالص عربی خون تھا اور امین کو جو ملک دیا گیا وہ عربوں کا گہوارہ تھا۔

وزیر سلطنت نے یہ راز پا لیا تھا کہ سلطنت کا قیام عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ وہ ہر چند یہ چاہتا تھا کہ تمام ملک میں عدالت کا وقار برقرار رکھا جائے۔ جعفر نے ایک مرتبہ ایک صوبائی حاکم کو لکھا "تمہارے خلاف شکایات روز بروز بڑھ رہی ہیں اگر تم نے اپنے صوبے میں عدل و انصاف قائم نہ کیا تو تمہیں معزول کر دیا جائے گا" جعفر نے حکومت کے مفاد کو ہمیشہ مقدم رکھا، لیکن ساتھ ہی ناانصافی کو کبھی گوارا نہیں کیا۔

ایک طرف تو جعفر بڑا فیاض اور شاہ خرچ تھا اور دوسری طرف سے سرکاری خزانہ کو بھرنے اور آمدنی بڑھانے کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ اس سلسلے میں اس کا نظریہ یہ تھا کہ شاہی خزانہ بھی بھر جائے اور رعایا پر ناجائز بار بھی نہ پڑے، بلکہ رعایا خوشحال اور مسرور نظر آئے۔

حکومت کے محاصل اور آمدنی کا انحصار زیادہ تر زمین کے مالیہ اور لگان پر تھا۔ جعفر کہا کرتا تھا کہ مالیہ سلطنت کا بہت بڑا ستون ہے اور اگر مالیہ کی فراہمی میں عدل و انصاف سے کام لیا جائے تو شاہی خزانہ ہمیشہ بھرپور رہے، لیکن اگر عدل کی جگہ جور و ظلم آجائے تو حکومت کا خزانہ خالی ہو جاتا ہے۔

جعفر کے نزدیک حکام کے لیے حسن نیت بڑی ضروری اور اہم چیز تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ حاکموں کو بد ظنی سے بچنا چاہیے۔

جعفر کو سکّہ سازی اور شاہی ٹکسال میں بڑی دلچسپی تھی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ چاندی اور سونے کے سکوں کو زیادہ وزنی اور قیمتی بنایا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے ایسی وزنی اشرفیاں رائج کیں کہ ایک ایک اشرفی کی قیمت سو اشرفیوں کے برابر تھی۔

تاریخ اسلام میں خلیفہ عبدالملک بن مروان پہلا حکمران تھا' جس نے اپنا سکہ جاری کیا۔ اس سے پہلے مسلمانوں کا اپنا ٹکسال موجود نہ تھا۔ ہارون رشید کے زمانے تک یہی دستور رہا کہ سکے خلفا کے نام پر جاری ہوتے تھے' لیکن جب جعفر نے قلمدان وزارت سنبھالا تو اس نے یہ جدت کی۔ خلیفہ کے نام کی بجائے اپنے نام پر اشرفیاں رائج کیں۔ تاریخ اسلام میں پہلی مثال تھی کہ شاہی سکہ وزیر سلطنت کے نام پر رائج ہوا۔ جعفر کا یہ اقدام ایک طرف تو اس کی جدّت پسندی کی شہادت ہے اور دوسری طرف اس کے اقتدار و اختیار کا کھلا ثبوت۔ اس کی یہ جدت بھی کچھ کم دلچسپ نہیں کہ جعفر نے اشرفیوں پر اپنی تصویر طبع کرائی اور یہ شعر درج کیا:

و اصفر من ضرب دارالملوک

یلوح علی وجهه جعفر

یزید علی مائة واحد

حتی لو تعطه معسرا" یوسر

("یہ سنہری سکہ شاہی ٹکسال میں بنا اور اس پر جعفر کی تصویر ہے۔ یہ ایک اشرفی سو اشرفیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ جب تو کسی تنگ دست انسان کو ایک اشرفی دے تو وہ خوشحال ہو جائے)۔"

جعفر کی ذہانت کی داد دینی چاہیے کہ اس نے سکہ سازی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ سکوں کی قیمت کے علاوہ ٹکسال کا نام اور جاری کرنے والے کی تصویر اور نام کندہ کرا دیا۔

اس قسم کے وزنی اور قیمتی سکوّں کی ضرورت بظاہر اس لیے پیش آئی کہ جعفر علوم

و فنون کا بڑا سرپرست تھا اور داد و دہش میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ چھوٹے سکوں کو گننے کی زحمت سے بچنے کے لیے یہ سکے بنوائے گئے۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ جعفر کے قتل کے بعد اس کے گھر سے اس قسم کی ۴ ہزار اشرفیاں ایک تالاب سے برآمد ہوئیں۔ ابوالعتاہیہ اس عہد کا مشہور شاعر تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ جعفر نے اتنی قیمتی اشرفیاں سرکاری ٹکسال سے بنوائی ہیں تو وہ جعفر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک تھالی میں کاغذ پر اشرفیوں والا شعر لکھ کر وزیر سلطنت کی خدمت میں بھجوایا۔ جعفر نے شعر والا رقعہ تو اپنے پاس رکھ لیا اور تھالی کو اشرفیوں سے بھر کر شاعر کے حوالے کر دیا۔

شخصی حکومتوں کا کرشمہ کہیے کہ اتنے جاہ و جلال اور اقتدار کا مالک وزیر ماہ صفر کی پہلی تاریخ ۱۸۷ھ / مطابق ۲۵ جنوری ۸۰۲ء کو خلیفہ کے حکم سے اچانک رات کے وقت قتل کر دیا گیا۔

۳۵ سالہ نوجوان وزیر کے لیے ۱۷ برس کی مسلسل محنت و مشقت کا یہ ثمرہ کتنا عبرت ناک اور الم انگیز معلوم ہوتا ہے۔

جعفر کا اچانک قتل اور اس کے خاندان کے باقی افراد کا قید و بند مؤرخین کے لیے ایک معمے سے کم نہیں۔ ہمارے اکثر مؤرخین اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر وہ کونسی اتنی بڑی بات تھی جس نے خلیفہ ہارون الرشید کو اتنا غضب ناک اور برافروختہ کر دیا کہ وہ جعفر جیسے عزیز دوست اور پیارے وزیر کی جان تک لینے کو تیار ہو گیا۔ بعض مؤرخوں نے اس قتل کی بنا خلیفہ کی بہن عباسہ کا افسانہ ٹھہرایا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ جعفر نے ایک باغی یحییٰ بن عبداللہ کو خلیفہ کے علم و اجازت کے بغیر رہا کر دیا۔ بات یوں بیان کی جاتی ہے کہ یحییٰ بن عبداللہ نے خلیفہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ خلیفہ نے اسے قید کر کے جعفر کو نگرانی سونپ دی۔ اس باغی نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی قرابت داری کا واسطہ دے کر جعفر سے رہائی کی درخواست کی۔ جعفر کا دل پسیج گیا اور اس نے باغی کو محض رہا ہی نہ کر دیا' بلکہ پہرہ ساتھ دے کر امن و

حفاظت کی جگہ تک پہنچا دیا تاکہ کہیں دوبارہ گرفتار نہ کرلیا جائے۔ اس بات پر خلیفہ ہارون الرشید اتنا بگڑا کہ جعفر کو قتل کروا دیا۔

بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ جعفر نے ایک بہت بڑا عظیم الشان محل بنوایا۔ جس کی تعمیر پر دو کروڑ درہم خرچ ہو گئے۔ مخالفین نے موقع پا کر خلیفہ کے کان بھرنا شروع کیے کہ یہ دو کروڑ درہم کی خطیر رقم آپ کے علم کے بغیر کیسے صرف کر دی گئی اور انعام و اکرام، سخاوت و فیاضی، ذاتی مصارف اور ملازمین کے اخراجات سب اس کے علاوہ ہیں۔ کہتے ہیں اس قصے کو سن کر خلیفہ سوچنے لگا اور اس نے آخر کار جعفر کو قتل کر دینے کا فیصلہ کرلیا۔

در اصل بات یوں معلوم ہوتی ہے کہ حکومت میں برمکی خاندان اور بالخصوص وزیر سلطنت کا اقتدار و دخل اتنا زیادہ ہو چکا تھا کہ خلیفہ ہارون الرشید بالکل بے دست و پا اور بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ امام المؤرخین مسعودی کا بیان ہے کہ خلیفہ ہارون رشید کے دربارِ خلافت میں جعفر کا طوطی بولتا تھا۔ وہ جو چاہتا کرتا۔ خلیفہ نے کبھی اعتراض نہ کیا تھا۔ سلطنت تو ہارون الرشید کی تھی، لیکن قبضہ اور حکومت جعفر کی۔ جعفر خود تو ہزاروں درہم و دینار بے دریغ خرچ کر ڈالتا۔ جیسے چاہتا اور جو چاہتا بلا روک ٹوک دے دیتا مگر خلیفہ بغداد بعض اوقات کوڑی کوڑی کے لیے اس کا منہ تکتا تھا۔

ان حالات میں خلیفہ ہارون الرشید کے سامنے دو ہی راہیں تھیں۔ یا تو اپنی خلافت و سلطنت سے یکسر دست بردار ہو کر حکومت جعفر کے حوالے کر دے جو پہلے ہی خلیفہ کے نام پر حکمرانی کر رہا تھا، یا پھر اس مقتدر وزیر کو حرف غلط کی طرح مٹا کر ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کرلے۔

مختصر یہ کہ جعفر برمکی تاریخ اسلام کے ان نامور اور شہرۂ آفاق مقتدر وزیروں میں سے ہے جن پر انسانیت بجا طور پر فخر کرتی ہے۔ جعفر اپنے علم و فضل، تدبر و دانش اور سیاست و فراست کی وجہ سے خلیفہ ہارون الرشید پر اس طرح چھا گیا کہ خلیفہ نے تمام سرکاری کاروبار اور سیاسی اختیار جعفر کو سونپ دیا یا یوں کہیے کہ جعفر نے خلیفہ سے

چھین لیا۔ جعفر علوم و فنون کی سرپرستی کے سلسلے میں بیت المال کا روپیہ پانی کی طرح بہاتا۔ ادیب و شاعر بخشش و عطا کے لیے خلیفہ کے بجائے وزیر خلافت کے اشاروں کے منتظر رہتے۔ جمہور کی قسمت کا مالک جعفر تھا نہ کہ خلیفہ۔ قصہ کوتاہ جعفر نے سترہ برس تک خلیفہ کے نام پر بڑی آن بان اور شان و شوکت سے حکمرانی کی۔ (اور خلیفہ ہارون الرشید نے اس کی مطلق العنانی، حکومت پر اس کے بے جا قبضے اور اس کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو ختم کرانے کے لیے اسے قتل کروا دیا)۔

○○○

ابو محجن ثقفی: شاعر شمشیرزن

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کا واقعہ ہے کہ قادسیہ کے میدان میں مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان سخت معرکہ ہوا۔ مسلمان اور کفّار جان پر کھیل جانے کے لیے میدان جنگ میں اترے تھے۔ دونوں طرف کشتوں کے پشتے لگ رہے تھے۔ کبھی مسلمانوں کا پلّہ بھاری ہوتا، کبھی ایرانیوں کا۔

اتفاق کی بات ہے کہ ایک دن اسلامی فوج کے کمانڈر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص علیل ہو کر میدان جنگ میں شرکت کرنے کے قابل نہ رہے۔ ادھر خالدؓ بن عرفطہ عارضی طور پر سپہ سالار مقرر ہوا۔ ادھر ایرانیوں نے مسلمانوں کو دبانا شروع کر دیا۔ ایرانی مست ہاتھیوں پر سوار ہو کر اسلامی لشکر میں ابتری پھیلانے کے درپے تھے۔ پریشانی اور سراسیمگی کے عالم میں کسی کو کچھ نہ سوجھتا تھا۔ بیمار سعد بھی گھبرائے ہوئے قلعے کی دیوار کے اوپر سے حالات دیکھ کر بے چین ہو رہے تھے۔ اتنے میں ایک مرد خدا برق رفتار گھوڑے پر سوار غیب سے آنمودار ہوا۔ اس مرد قلندر نے دیوانہ وار تلوار چلاتے ہوئے دائیں بائیں دشمنوں کی صفوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ ایرانی فوج میں ابتری پھیل گئی ان کے پاؤں اس طرح اکھڑے کہ پھر جم کر لڑنے کی ہمت نہ کر سکے۔ دشمنان اسلام کی ہزیمت و بربادی کا سنگ بنیاد رکھ کر وہ بہادر سپاہی آن واحد میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اسلامی لشکر میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے بھی اسے کوئی پہچان نہ سکا۔ بعض نے کہا یہ کارنامہ حضرت خضر علیہ السلام کا ہے اور بعض کہنے لگے کہ خدا نے

فرشتہ بھیج کر مسلمانوں کی لاج رکھ لی ہے۔ خود سالار اسلام حضرت سعدؓ حیران ہو کر سوچ رہے تھے کہ آخر اس بے جگری سے لڑنے والا مرد مجاہد کون ہے جس نے جنگ کا پانسا پلٹ دیا۔

دوسرے دن پتہ چلا کہ یہ مرد خدا ابو محجن ثقفی تھا۔ ابو محجن ثقفی زمانۂ جاہلیت اور اسلام کے دور اول میں عرب کے مشہور و معروف قبیلہ ثقیف کا نامور شہسوار ہو گزرا ہے۔ بڑا بہادر اور جانباز سپاہی' نڈر شمشیرزن اور نیزہ باز' پھر لطف یہ کہ شاعر بھی تھا۔
زمانۂ جاہلیت و اسلام کے دور اول کے عرب شاعر حقیقت نگاری اور سادگی کے باعث ضرب المثل ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے' کر گزرتے اور جو کرتے' اسے شعروں کی صورت میں محفوظ کر دیتے۔ ان کا کردار اور شاعری دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ ان کے کلام میں تکلف اور بناوٹ کا کوئی گزر نہیں ہوتا تھا۔ ان کی شاعری انفرادی اوز اجتماعی زندگی کی آئینہ داری کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی شاعری اس دور کی تمدنی اخلاقی اور سیاسی تاریخ کا مجموعہ ہے۔

ابو محجن ثقفی کے خاندان کی سیادت و قیادت مسلمہ ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ابو سفیان قریش اور ثقیف کے قبیلوں کے سرکردہ لوگوں کا ایک تجارتی وفد لے کر کسریٰ کے دربار کے ارادہ سے نکلا۔ راستے میں ابو سفیان نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہمارا سفر خطرے سے خالی نہیں' کیونکہ ہم بغیر اجازت شاہ ایران کے دربار میں جا رہے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ کسریٰ کا ملک ہماری تجارتی منڈی نہیں ہے۔ کیا تم میں کوئی ایسا جوانمرد ہے جو دربار میں پہنچنے کی ہمت کرے؟ ساتھ ہی یہ بات بھی واضح کر دی کہ اگر اس شخص کی جان پر بن گئی تو ہم اس کے خون سے بریٔ الذمہ ہوں گے اور اگر وہ کامیاب ہو گیا تو آدھے منافع کا حقدار ٹھہرے گا۔

یہ الفاظ سن کر ابو محجن ثقفی کا چچا غیلان تیار ہو گیا۔ اور کہنے لگا کہ میں کسریٰ کے دربار کے سامنے جا پہنچا۔ جب شاہ ایران کو خبر پہنچی تو داخلے کی اجازت مل گئی۔ بس پھر کیا تھا خوشیاں مناتے ہوئے دربار میں داخل ہوا اور بادشاہ کی خدمت میں عربی نسل کے

گھوڑے بطور ہدیہ و نذرانہ پیش کیے۔

ابو محجن ثقفی اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

(۱) وہ میرا ہی چچا تو تھا جس نے کسریٰ کے دربار میں پہنچ کر عمدہ نسل کے گھوڑے پیش کیے۔

(۲) اس وقت کو یاد کرو جب وہ بادشاہ اور ترجمان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ تنہا اسے ہی تو رسائی حاصل ہوئی۔ وفد میں سے کسی اور کو اجازت نہ مل سکی۔ چنانچہ سارے کا سارا وفد دربار سے باہر کھڑا رہا۔

ابو محجن ثقفی کی شاعری اس کی اپنی ہی زندگی کی روداد ہے۔ حق گوئی اور واقعہ نگاری کی وجہ سے عمر فاروقؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ نے ابو محجن ثقفی کو بہترین شاعر قرار دیا تھا۔ ان دونوں بزرگوں کو ابو محجن ثقفی کے یہ اشعار بڑے پسند تھے۔ شاعر نے ان شعروں میں سیرت اور نظریۂ دولت کی وضاحت کی ہے۔ ابو محجن ثقفی اپنی رفیقۂ حیات کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:

(۱) لوگوں سے میرے وفور مال کے بارے میں مت پوچھا کر بلکہ یہ دریافت کر کہ میرے اخلاق و عادات اور میری سیرت کیسی ہے؟

(۲) جب ڈرپوک اور بزدل لوگ کمک اور اعانت کے منتظر ہوں تو ہم ہی میدان جنگ میں سالار اور قائد ہوتے ہیں۔

(۳) میں جنگ کے دن نیزے کو دشمنوں کے خون سے سیراب کرتا ہوں اور نیزے کی انّی تو ہر وقت خون آلودہ رہتی ہے۔

(۴) میں دشمنوں کے پہلو میں اتنے گہرے اور خوفناک زخم لگاتا ہوں کہ دیکھنے والا گھبرا کر بھاگ جاتا ہے۔

(۵) جس چیز کا حاصل کر لینا ممکن نہ ہو میں اس کی آرزو ہی نہیں کرتا' تاکہ مایوسی کا منہ نہ دیکھنا پڑے اور اگر مجھے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا جائے تو پھر میں کینہ ور ہو کر انتہائی غیظ و غضب پر اتر آتا ہوں۔

(۶) میں گھمسان کی لڑائی میں دشمنوں کو تہ تیغ کر کے میدان صاف کر دیتا ہوں۔ میں جان پر کھیل جانا تو گوارا کر لیتا ہوں مگر راز فاش نہیں ہونے دیتا۔

ابو محجن ثقفی دولت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

(۷) قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ کبھی تو ایک شریف اور معزز گھرانے کا آدمی مفلس و قلّاش ہو جاتا ہے اور کبھی بے وقوف اور ناکارہ انسان سونے چاندی میں کھیلتا ہے۔

(۸) آخر مال دولت ہے کیا؟ یہ تو محض آنی جانی چیز ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ درختوں کی ٹہنیاں پت جڑ کی ویرانی و بربادی کے بعد پھر سرسبز و شاداب پتوں سے لہلہانے لگتی ہیں۔

ابو محجن ثقفی کی شاعری صاف و شفاف چشمہ ہے۔ اس کے شعروں میں قدرتی روانی' سلاست اور سادگی کے ساتھ لفظوں کا بانکپن' زبان کا حسن و شکوہ پوری آن بان موجود ہے۔ اسے شعر کہنے پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ وہ جب چاہتا ہے شعر کہہ لیتا ہے۔ اس نے اکثر شعر فی البدیہہ ہی کہے ہیں۔ وہ نہ تو زہیر بن ابی سلمیٰ کی طرح سال بھر ایک ہی قصیدے کی قطع و برید کرتا رہتا ہے' نہ ذوالرمہ کی مانند اسے شعر کہنے کے لیے خلوت کی ضرورت ہے' نہ کثیر کی طرح رات کے وقت مکان کی چھت پر چڑھ کر گوشہ تنہائی اختیار کرنے یا لحاف اوڑھ لینے کی اور نہ فرزدق کی طرح اسے کبھی ایسی مشکل پیش آئی جب کہ شعر کہنا دانت نکال ڈالنے سے دشوار تر ثابت ہوا ہو۔

ابو محجن ثقفی کے نام کے بارے میں اختلاف ہے بعض مؤرخین نے اسے عمرو بن حبیب کے نام سے یاد کیا ہے۔ خیال یہ ہے کہ اسلام سے پہلے مالک اور عمرو بن حبیب کے نام سے بھی پکارا گیا اور سچ پوچھئے تو کنیت ابو محجن ثقفی اتنی مشہور ہوئی کہ لوگ اس کا اصلی نام بھول گئے۔

جب قبیلہ ثقیف ۹ھ میں مشرّف بہ اسلام ہوا تو ابو محجن ثقفی بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ دین اسلام کا بڑا دشمن تھا۔ جب نبی اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم نے ۸ھ میں طائف کا محاصرہ کیا تو دشمنان اسلام نے بڑی مزاحمت کی۔ ابو محجن ثقفی بھی انہی مخالفوں میں شامل تھا۔ اور اس کا ایک تیر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لخت حضرت عبداللہ کو لگا تھا۔ جس کے زخموں کی وجہ سے وہ ۱۱ھ میں جان بحق ہو گئے۔

ابو محجن ثقفی کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اس میں کل اشعار ۱۰۹ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے اور بھی شعر کہے ہوں جو زمانے کی دستبرد سے نہ بچ سکے ہوں۔ بہرحال ابو محجن ثقفی کا شمار عرب کے ممتاز شاعروں میں نہیں ہوتا' بلکہ وہ متوسط طبقے کا شاعر ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ طبعاً شاعر ہے۔ اس کی زبان ٹکسالی اور اس کا کلام بڑا مستند ہے۔ عربی لغات میں اس کے اشعار کو بطور سند و استشہاد پیش کیا گیا ہے۔ اس کی شاعری کا موضوع زیادہ تر بہادری اور شجاعت کے کارنامے اور شراب ہے۔

شراب ابو محجن ثقفی کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ شراب نوشی کے جرم کی پاداش میں اسے بارہا سزا ملی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں کئی مرتبہ اسے درے لگوائے۔ بالآخر ۱۴ھ میں حضرت فاروقؓ نے اسے ایک چھوٹے سے جزیرے حضوضیٰ میں نظر بند کر دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اسلامی لشکر قادسیہ کے میدان میں ایرانیوں سے نبرد آزما تھا۔ حسن اتفاق کہیے کہ ابو محجن ثقفی اپنے نگران کی حراست سے بھاگ کر جنگ قادسیہ میں جا شریک ہوا۔ شاعر اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

(۱) خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے قید و بند سے نجات اور خلاصی بخشی۔

(۲) جو شخص حضوضی جزیرے میں پہنچنے کے ارادے سے جہاز میں سوار ہو تو اس کا بحری سفر بڑا ہی منحوس ہے۔

(۳) امیر المومنین حضرت عمرؓ جہاں کہیں ہوں انہیں میرا پیغام پہنچا دو۔

(۴) میں ہاتھ میں جھنڈا لیے گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کے شہسواروں پر ایسے نازک وقت میں حملہ کرتا ہوں جب قوم ڈر کے مارے سہمی ہوتی ہے اور پیش قدمی کرنے

کے بجائے پیچھے ہٹ جاتی ہے۔

(۵) میں صبح کے وقت لوہے کی مضبوط اور موٹی زرہ بکتر پہن کر دشمنوں پر پل پڑتا ہوں۔

جب حضرت فاروقؓ کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے حضرت سعدؓ کو حکم بھیجا کہ ابو محجن ثقفی کو قید کر دیا جائے۔ چنانچہ سعدؓ نے اسے قلعے میں قید کر کے پابہ زنجیر کر دیا۔ خدا کا کرنا دیکھیے کہ ادھر سالار لشکر حضرت سعدؓ بیمار ہو کر قلعے میں چلے آئے ادھر ایرانیوں نے زور مارا۔ بڑے گھمسان کا معرکہ شروع ہوا۔ یہ دیکھ کر ابو محجن ثقفی کا خون کھولنے لگا۔ وہ ہر چند چاہتا تھا کہ زنجیریں توڑ کر میدان جنگ میں پہنچ جائے اور بہادری کے جوہر دکھائے۔

ابو محجن ثقفی نے سعدؓ کی بیوی سلمٰی کی بڑی منت سماجت کی کہ تھوڑے عرصہ کے لیے وہ اسے رہا کر دے اور ساتھ ہی وعدہ کیا کہ اگر وہ زندہ رہا تو اس کی خدمت میں حاضر ہو کر پھر بیڑیاں پہن لے گا۔ نیز درخواست کی کہ وہ سعدؓ کی گھوڑی بھی سواری کے لیے عنایت کر دے۔ اس موقعہ پر ابو محجن ثقفی کے جذبات ملاحظہ ہوں وہ کہتا ہے:

(۱) یہ بات کتنی افسوس ناک ہے کہ شہسوار تو نیزوں سے لڑیں اور میں قید و بند میں جکڑا ہوا بے کار پڑا ہوں۔

(۲) ایک وہ زمانہ تھا کہ میں مال و دولت کے وفور اور برادری کی کثرت کے نشے میں مخمور تھا' اب یہ حال ہے کہ میں یہاں تنہا پڑا ہوں میرا کوئی ساتھی بھی نہیں ہے۔

(۳) مجھے تو یہ غم گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے کہ ہر صبح آفتاب مجھے بیڑیوں میں جکڑا ہوا پاتا ہے۔

(۴) ادھر سخت جنگ لڑی جا رہی ہے ادھر مجھے قید و بند میں ڈال رکھا ہے اور دوسرے لوگ نیزے ہاتھوں میں لیے لڑ رہے ہیں۔

(۵) خاتون محترمہ! لاؤ میرے ہتھیار میرے حوالے کرو' میں دیکھ رہا ہوں کہ جنگ لمبی ہوتی چلی جا رہی ہے۔

(۶) خدا گواہ ہے کہ میں اپنے وعدے سے نہ پھروں گا' اگر زندہ رہا تو ضرور واپس آ جاؤں گا۔

(۷) اور اگر میدان میں کام آ گیا تو شوق شہادت کا دیرینہ جذبہ پورا ہو جائے گا۔ مگر سعدؓ اور فتح کی آرزوئیں میں اپنے پیچھے چھوڑ جاؤں گا۔

سلمیٰ نے اس وقت تو بات ٹال دی' لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد واپس آئی اور کہا کہ میں نے استخارہ کیا ہے۔ مجھے تمھاری شرائط منظور ہیں۔ البتہ سعدؓ کی گھوڑی نہ دوں گی۔ یہ کہتے ہوئے ابو محجن ثقفی کی بیڑیاں کھول کر سلمیٰ اپنی قیام گاہ کو چل دی۔ ابو محجن ثقفی شاعر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً" حضرت سعدؓ کی گھوڑی کھولی۔ قلعے سے نکلا' ہوا سے باتیں کرتا ہوا میدان جنگ میں جا پہنچا۔ نیزہ بازی اور شمشیر زنی کے وہ کرتب دکھائے کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے۔ بڑی بے جگری سے لڑتے ہوئے کبھی صفوں کو چیرتا ہوا آگے نکل جاتا کبھی واپس مڑ کر دائیں بائیں وار کرتا۔ غرضیکہ آدھی رات گئے تک بہادری اور جواں مردی کے وہ جوہر دکھائے کہ اپنے پرائے سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ خود حضرت سعدؓ متعجب ہو کر دل میں کہنے لگے کہ اگر ابو محجن ثقفی قید نہ ہوتا تو میں کہتا کہ یہ ابو محجن ثقفی ہے اور یہ گھوڑی میری گھوڑی ہے۔

ابو محجن ثقفی میدان جیت کر قلعے کی طرف واپس آ رہا تھا کہ ایک مسلمان عورت نے دیکھ کر سمجھا کہ یہ شخص میدان جنگ سے بھاگ آیا ہے وہ بولی:

"یہ گھڑ سوار کون ہے جو نیزوں کے ڈر کے مارے میدان چھوڑ کر چلا آ رہا ہے؟ ارے مردوئے کیا تو اپنا گھوڑا مجھے عاریتاً" دے گا تاکہ میں تم جیسے بزدلوں کی جگہ میدان جنگ میں جا کر لڑوں؟"

جواب میں ابو محجن ثقفی نے یہ شعر کہا:

ارے خاتون شریف النسل مردوں کا ٹھکانہ گھوڑے کی پیٹھ پر ہوتا ہے۔ تمھیں گھوڑے سے کیا مطلب تم تو زینت کاشانہ ہو رونق رزم نہیں۔

یہ کہہ کر ابو محجن ثقفی قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے ہتھیار اتار ڈالے اور

پھر بیڑیاں پہن لی۔

حضرت سعدؓ کی بیوی نے پوچھا ابو محجن ثقفیؓ سعدؓ نے تمہیں کیوں قید و بند میں جکڑ رکھا ہے؟ ابو محجن ثقفی بولا خدا کی قسم مجھے اس لیے قید نہیں کیا گیا کہ میں نے کوئی حرام چیز کھالی ہے یا شراب پی لی ہے' البتہ میں زمانۂ جاہلیت میں شراب پیا کرتا تھا۔ میں تو ایک شاعر ہوں شعر میری زبان پر جاری ہو جاتا ہے تو کبھی کبھی گا لیتا ہوں' میری قید کی وجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ میں نے یہ شعر کہے تھے:

(۱) جب میں مرجاؤں تو مجھے انگور کی بیل تلے دفن کیا جائے کیونکہ انگور کی بیل کی جڑیں میری ہڈیوں کو سیراب کرتی رہا کریں گی۔

(۲) مجھے صحرا میں دفن نہ کیا جائے کیونکہ مجھے اس سے قطعی محرومی کا خدشہ ہے۔

(۳) انگور کی بیل تلے شراب کبھی تو مجھے صبح سویرے مل جایا کرے گی اور کبھی رات گئے' بہرحال محرومی تو نہ ہوگی۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ ایک مسافر آذربیجان یا جرجان کے قرب و جوار سے گزرا تو اس نے ایک قبر دیکھی جس پر لکھا تھا کہ یہ قبر ابو محجن ثقفی کی ہے۔ اس مسافر کا کہنا ہے کہ میں نے دیکھا کہ اس قبر پر انگور کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔

خیر سلمٰی نے دوسرے دن حضرت سعدؓ کو ابو محجن ثقفی کا سارا قصہ کہہ سنایا۔ حضرت سعدؓ نے ابو محجن ثقفی کو بلا کر رہا کر دیا اور کہا کہ اتنے کام آنے والے آدمی کو میں قید نہیں کر سکتا۔ ابو محجن ثقفی بولا خدا کی قسم جب تک سزا ملتی تھی میں شراب پیتا تھا اور سزا مجھے گناہوں سے پاک کر دیتی تھی۔ اب سزا اٹھ جانے کے بعد میں کبھی شراب نہیں پیوں گا۔

مختصر یہ کہ ابو محجن ثقفی ایک نیک دل مسلمان اور پاک طینت انسان تھا۔ زندگی کا اکثر و بیشتر حصہ راہ خدا میں جہاد کرتے گزار دیا اور بہادری اور جوانمردی اور جرأت و ہمت کا بہترین نمونہ چھوڑ گیا۔

○○○

ابوالفرج اصفہانی ---- ایک عجوبۂ روزگار

ابوالفرج اصفہانی دسویں صدی عیسوی کا عجوبہ زمان ادیب و شاعر اور یگانہ روزگار نقاد مؤرخ گزرا ہے۔ وہ قلیم شعرو ادب' راگ اور نغمے کا تاجدار تھا۔ اس کی جامع شخصیت میں بڑے کمالات اور بہت سے اوصاف جمع ہو گئے تھے۔ وہ علوم و فنون کا دائرہ معارف اور ثقافت و ادب کا خزانہ تھا۔ ہزار ہااشعار' سیکڑوں شعرا کاکلام ان کے کلام کا تاریخی پس منظر' کلاسیکی راگ اور گانے' راگیوں اور مغنیوں کے نام اور حالات' ان کی فنی خدمات' سب ابوالفرج اصفہانی کو ازبر تھیں۔ وہ ایسا شاہ دماغ اور صاحب طرز ادیب تھا کہ اس کی تصانیف میں علمی و ادبی باغ و بہار اب تک بدستور قائم ہے۔ ایک ہزار سال گزرجانے کے بعد بھی اس کی نظم و نثر میں ایک جوبن ہے۔ اس کے فقروں کا بانکپن' ترکیبوں کی بندش' الفاظ کی چستی' زبان کی شیرینی اور حلاوت آج بھی عصر حاضر کے بلندپایہ ادیبوں کے لیے سحراور جادو کا حکم رکھتی ہے۔

ابوالفرج علی بن حسین بن محمد آموی قرشی اصفہان میں ۲۸۴ھ /۸۹۷ء میں پیدا ہوا۔ بغداد میں پرورش پائی اور وہیں متوطن (رہائش پذیر) ہوگیا۔ اصفہانی کے عہد میں بغداد علم و ادب' شعرو سخن اور فن و ثقافت کا بڑا مرکز تھا۔ اصفہانی نے اپنے زمانے کے جلیل القدر اساتذہ اور نامور علماء و فضلا کے سامنے زانوے تلمند تہہ کیا۔ تاریخ و سیرت سوانح و وقائع اور اخبار و احوال کا جیّد عالم' انساب و اشعار کا حافظ' نغموں اور گیتوں کا ماہر ہونے کے علاوہ اصفہانی نے نحو و نعت' نجوم و طب وغیرہ علوم میں بھی خاصی دسترس پیدا کرلی۔ خود بڑا اچھا شاعر تھا۔ کتابوں کا عاشق' تاریخی وادبی روایات کا بے مثال جامع ہوتے ہوے بھی خرافات اورگپ شپ کا امام تسلیم کیا گیا ہے۔

ذیل میں اس کے چند اساتذہ کے نام درج کیے جاتے ہیں تاکہ قارئین کرام کو ان کی جلالت قدر اور علو مرتبت کا کچھ اندازہ ہو سکے:

۱۔ ابوبکر ابن درید (۲۲۳ھ۔ ۳۲۱ھ) امام لغت و ادب و شعر

۲۔ ابن الانباری (م ۳۲۸ھ) تاریخ و سیرت کا علامہ اور نحو' نعت اور ادب کا امام

۳۔ خلیفہ فضل بن حباب جمحیؒ (م ۳۰۵ھ) حدیث' لغت' اشعار' انساب اور تاریخ و سیرت کا جید عالم و راوی

۴۔ علی بن سلیمان اخفش اصغر (م ۳۱۵ھ) امام لغت و نحو

۵۔ ابراہیم نفطویہ (۲۴۴۔ ۳۲۳ھ) تاریخ و حدیث' سیرت' ادب اور لغت کا امام

۶۔ ابو جعفر محمد بن جریر طبری (۲۲۴۔ ۳۱۰ھ) تفسیر' حدیث' فقہ اور تاریخ کا شہرہ آفاق امام۔

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ابو الفرج اصفہانی کا ہر استاد' مختلف علوم و فنون میں امام اور شہرۂ آفاق تھا۔ اصفہانی نے اپنے اساتذہ سے تاریخ و سیرت' حدیث و روایت' نحو و نعت' شعرو ادب اور فقہ و نسب وغیرہ علوم و فنون میں فیض حاصل کیا۔ اس نے ایسے نادر روزگار علماو فضلا کی صحبت میں بیٹھ کر علمی' تاریخی اور ادبی معلومات کے ساتھ نوادر و ظرائف' شعرو سخن' ادبی چٹکلے اور لطیفے' نقد و تبصرہ اور طنزو ہجو کے ذخائر جمع کر لیے تھے۔ علاوہ بریں اصفہانی کا ذاتی مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ علم و ادب کی کوئی کتاب نہ تھی جو اسے میسر آسکی اور اس نے نہ پڑھی ہو۔ نتیجہ یہ تھا کہ اصفہانی علم و ادب اور ثقافت و فن کا بحر ناپیدا کنار بن گیا۔

عربی زبان کے بڑے بڑے سیرت نویسوں' سوانح نگاروں اور نقادوں نے اصفہانی کی قابلیت' وسعت معلومات اور قوت حافظہ کی دل کھول کر داد دی ہے۔ چند قدیم عرب سیرت نگاروں کی رائے سنیئے:

۱۔ ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں اصفہانی کے وسیع مطالعہ' نادر معلومات اور تاریخ دانی کی خوب تعریف کی ہے۔

۲۔ ابن خلکان نے اپنی کتاب وفیات الاعیان میں اصفہانی کو شہرہ آفاق ادیب' یگانہ روزگار مصنف اور انسانیت و سیر کا عالم بے بدل قرار دیا ہے۔

۳۔ یاقوت حموی کے نزدیک اصفہانی کا حافظہ بے نظیر تھا اور وہ بہت بڑا تاریخ دان' علامہ' نساب' بہترین مصنف اور جید شاعر تھا۔

۴۔ ابو منصور ثعالبی نے اپنی مشہور کتاب یتیمۃ الدہر میں اصفہانی کو شاعر شیریں بیان' نامور ادیب اور مشہور عالم و مصنف کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ بعض علمائے جرح و تعدیل اور ماہرین تاریخ و حدیث (مثلاً ابن الجوزی اور ابن تیمیہؒ) نے ابوالفرج اصفہانی کو قابل اعتماد نہیں سمجھا' لیکن اس کے باوجود اس کی ادبی اور ثقافتی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

علم و ادب اور شعر و سخن کا یہ دائرۃ المعارف ایک عرصہ تک ادیب جہاں گرد رہا' بالاخر سیف الدولہ بن حمدان (۳۰۳۔۳۵۶ھ) امیر حلب نے سرپرستی کا ہاتھ بڑھایا۔ پھر مؤیدالدولہ بن بویہ دیلمی کے نامور اور علم دوست وزیر شہیر ابوالقاسم الصاحب اسمٰعیل بن عباد (۳۲۶ھ۔۳۸۵ھ) نے ادب پروری اور علم دوستی کی وجہ سے دست شفقت آمیز اصفہانی کے سر پر رکھا۔ معزالدولہ بن بویہ کا وزیر المہلبی اصفہانی پر مہربان ہوا اور اس کی بڑی قدر کرنے لگا۔ علاوہ بریں ابوالفرج اصفہانی کے بڑے حکمرانوں سے بھی بڑے گہرے مراسم تھے۔

وفور علم' کثرت مطالعہ اور شہرت شعروسخن کے باوجود اصفہانی پراگندہ اور میلا کچیلا رہتا' پوشاک اور ظاہری صفائی کے معاملے میں بڑی بے اعتنائی سے کام لیتا' ایک مرتبہ کپڑے پہن لیتا تو پھر جب تک میل سے اٹ کر پھٹ نہ جاتے' اتارنے کا نام نہ لیتا۔ اس میلی اور گندی پوشاک کے ساتھ پگڑی کی حالت اس سے بھی بدتر ہوتی۔ جیسے اٹھائی سر پر رکھ لی' نہ سر سے باندھی اور نہ درست کی' کھلی ہے تو پروا نہیں اور الٹی سیدھی ہے تو پروا نہیں۔ کتابوں کا بھی

یہی حال تھا۔ مٹی سے اٹی پڑی ہیں۔ بستر ہے تو وہ بھی میل کچیل تلے دم توڑ رہا ہے۔ چارپائی دیکھو تو کھٹملوں سے بھری پڑی ہے اور اصفہانی ہے کہ اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

وزیر مہلبی اس کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے صاف ستھرے کپڑوں کے لیے بارہا کہا' بہت سمجھایا لیکن بالکل بے سود۔ پریشان صورت' گندی اور میلی پوشاک کے باوجود وزیر مہلبی اصفہانی کی بذلہ سنجی' لطیفہ گوئی' خوش گفتاری' علم دوستی اور راگ گانوں کی خاطر سب کچھ گوارا کرتا تھا۔

اصفہانی کی خوبیوں نے اسے بے لگام کردیا تھا۔ خواص و عوام سب اس کی زبان درازی' تیز کلامی' تلخ گوئی اور ہجو سے خائف تھے۔ بڑا بد لحاظ تھا' زبان طعن دراز کرتے ہوے کسی کی عزت و آبرو کا پاس نہ کرتا۔

ابوالفرج اصفہانی کھانے پینے کے معاملے میں بڑا حریص تھا' ایک تو عمدہ کھانوں کا شوقین دوسرے سخت پیٹو' پرندوں کا گوشت اور پھل اسے بڑے مرغوب تھے۔ بسا اوقات پرخوری ثقل معدہ پیدا کردیتی اور اصفہانی کا معمول تھا کہ ثقل معدہ کو دور کرنے کے لیے سیاہ مرچ کی خاصی مقدار استعمال کیاکرتا۔

بعض لوگوں نے اصفہانی کی ان عادات کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اصفہانی بچپن میں یتیم ہوگیا تھا۔ ماں نے دوسری شادی کرلی تھی۔ ان حالات میں اس کی نگرانی اور تربیت کما حقہ' نہ ہوسکی۔ بڑی محنت و مشقت اور کدوکاوش سے اصفہانی نے علوم و فنون کی تحصیل تو کرلی لیکن اپنے ماحول کے خلاف اس کے دل میں غیر شعوری طور پر انتقامی جذبات پرورش پاتے اور مشتعل ہوتے رہے۔ اس کا اظہار کچھ تو لباس کے معاملے میں بے اعتنائی سے ہوا' کچھ پرخوری کی شکل میں اور کچھ زبان درازی اور ہجوگوئی میں۔ مزید براں مطالعۂ کتب میں انہماک عشق و جنون کی حد تک بڑھ گیا۔ اس علمی اور ادبی وارفتگی نے ظاہری حسن و نمائش سے اس کی توجہ کو یکسر ہٹادیا تھا۔

اصفہانی کے تمام سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خاندان

بنوامیہ کا چشم و چراغ ہوتے ہوئے بھی اس کا میلان شیعیت کی طرف تھا۔ اس کی وجہ بھی بعض سیرت نگاروں نے ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک اصفہانی کا تشیع صرف سیاسی اور اقتصادی اغراض پر مبنی تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے سرپرست حکمران شیعہ تھے یا شیعہ نواز۔ ان کی خوشنودی کے لیے اصفہانی نے تشیع اختیار کیا۔

ابوالفرج اصفہانی بہت بڑا مصنف ہے۔ اس کی تصانیف کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ تاریخ، ادب و ثقافت، نوادر و ظرائف، انساب و اشعار، راگ اور گانے، ہرموضوع پر اس نے لکھا ہے۔ میدان تصنیف و تالیف میں اصفہانی کی علمی کاوشوں اور ادبی کارناموں کا اندازہ لگانے کے لیے اس کی تصانیف پر ایک سرسری نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اس نے کتنی محنت و مشقت سے کام کیا ہے کتنا وقت صرف کیا ہے اور کیا کچھ معلومات اپنے قارئین کے لیے فراہم کر گیا ہے۔ ذیل میں اس کی ان کتابوں کے نام درج کیے جاتے ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں یا ان کے نام ہمیں معلوم ہیں:

۱۔ کتاب الاغانی
۲۔ مقاتل الطالبین
۳۔ اخبارالاماء الشواعر
۴۔ کتاب المالیک الشعراء
۵۔ کتاب الاخبار و النوادر
۶۔ کتاب ادب السماع
۷۔ کتاب اخبارا لطفیلین
۸۔ کتاب لفضیل ذی الحجہ
۹۔ کتاب الحانات
۱۰۔ کتاب الدیارات
۱۱۔ کتاب آداب الغرباء

۱۲۔ کتاب القیان
۱۳۔ نسب بنی عبد شمس
۱۴۔ التعدیل والانتصاف
۱۵۔ نسب بنی شیبان
۱۶۔ فی مآثر العرب
۱۷۔ جمہرۃ النسب
۱۸۔ نسب بنی تغلب
۱۹۔ ایام العرب
۲۰۔ نسب المہالبہ
۲۱۔ کتاب الغلمان المغنیین
۲۲۔ نسب بنی کلاب
۲۳۔ مجرد الاغانی

اس مصروفیت و انہماک کی زندگی کے بعد ہمارے نامور مصنف نے ۷۲ برس کی طویل عمر پاکر ۳۵۶ھ (۲۱ نومبر ۹۶۷ء) میں وفات پائی۔

ابو الفرج اصفہانی کا سب سے بڑا علمی و ادبی شاہکار کتاب الاغانی (گیتوں کی کتاب) ہے۔ اصفہانی نے اس کتاب میں اپنے زمانے کے مروجہ عربی راگ، گانے اور گیت جمع کردیئے ہیں۔ شاعروں، راگ لکھنے والوں، موسیقاروں اور مغنیوں کے حالات بالتفصیل درج کیے ہیں۔ اس امر سے بھی بحث کی ہے کہ شاعر نے کن حالات میں وہ شعر کہے تھے۔ مصنف، فن موسیقی کو بھی زیر بحث لاتا ہے۔ نیز سر، راگ اور نغمے بھی متعین کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کس کس مغنی نے کیا کیا راگ گائے۔

اصفہانی نے کتاب الاغانی میں جو گانے، راگ اور گیت درج کیے ہیں۔ ان کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ خلیفہ ہارون رشید کو علمی و ادبی دلچسپیوں کے علاوہ فن موسیقی سے بڑا شغف تھا۔ اس کے دربار میں بڑے اچھے موسیقار اور

گویے موجود تھے۔ خلیفہ نے اپنے مغنیوں کو حکم دیا کہ وہ ایک سو راگ انتخاب کریں۔ چنانچہ اس کے دربار کے مشہور راگی ابراہیم موصلی نے اسماعیل بن جامع اور فلیح بن عودہ کے ساتھ مل کر ایک سو راگ منتخب کیے۔ پھر خلیفہ نے حکم دیا کہ اس میں سے دس جامع راگ منتخب کیے جائیں۔ جب اس حکم کی بھی تعمیل ہو چکی تو حکم ہوا کہ ان دس منتخب راگوں میں سے تین بڑے جامع راگ انتخاب کرو۔ چنانچہ مغنیوں نے ابو قطیفہ' عمر بن ابی ربیعہ اور نصیب کے اشعار میں سے تین راگ پسند کیے اور انہی تینوں پر باقی راگوں کی بنیاد ہے۔ بعدازاں خلیفہ واثق کے عہد میں ان پر مشہور مغنی اسحاق بن ابراہیم نے نظر ثانی کی۔

اصفہانی نے کتاب الاغانی کی ابتدا انہی تین راگوں سے کی ہے جو خلیفہ ہارون رشید کے لیے ایک سو راگ میں سے منتخب کیے گئے تھے۔

اس کے بعد خلفا اور ان کے خاندان کے لوگوں کے اشعار اور گیت درج کیے ہیں۔

کتاب الاغانی تاریخ ادب عربی' عربی ثقافت اور عربی فن موسیقی کا بہت بڑا مصدر و مآخذ ہے۔

اس کتاب میں عربوں کے تیسری صدی ہجری تک کے راگ' نغمے' سُر اور تال سے متعلق بڑی قیمتی بحثیں مندرج ہیں۔ اس میں آلات طرب' مزامیر موسیقی کی مصطلحات وغیرہ کا بکثرت ذکر آتا ہے مثلاً شباعی (بین) زلاعی (زنامی' بانسری اور بین کی قسم) بوق (طبلہ' ڈھولک) بربط' رباب اور صنج (چنگ) وغیرہ۔

کتاب الاغانی میں تاریخی' علمی اور ادبی معلومات کے خزائن کے علاوہ نوادر و ظرائف کے انبار' بادشاہوں اور وزیروں کے ادبی لطیفے اور چٹکلے' شاعروں کی ادبی طنزیات اور نچلے طبقے کے گویوں کی خرافات سب موجود ہیں۔

ابوالفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی کو پچاس برس کی مدت میں تالیف کیا اور اس کا واحد نسخہ سیف الدولہ کی خدمت میں پیش کیا۔ سیف الدولہ نے مصنف کی حوصلہ افزائی اور قدردانی کرتے ہوئے ایک ہزار دینار (سنہری

اشرفیاں) بطور انعام دیے۔ جب دیلمی وزیر ابوالقاسم الصاحب ابن عباد نے سنا تو کہا کہ سیف الدولہ نے اصفہانی اور اس کی گراں قدر کتاب کی کوئی قدر نہیں کی۔ انعام کئی چند ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس کتاب میں علمی، ادبی، تاریخی اور فنی اعتبار سے زاہد عالم، ادیب، ظریف، مرد مجاہد، بادشاہ غرضیکہ ہر طبقے اور ہر درجے کے آدمی کے لیے سامان لذت موجود ہے۔ یاقوت کے نزدیک اس کتاب میں سنجیدہ و متین باتوں کے ساتھ ہذلیات بھی ہیں۔

اس کتاب کی بڑی قدرو منزلت ہوئی۔ صاحب ابن عباد سفر میں کتابوں کے تیس اونٹ ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ جب کتاب الاغانی کا نسخہ ہاتھ لگ گیا تو پھر تمام کتابوں سے بے نیاز ہوگیا اور تنہا کتاب الاغانی کو ساتھ رکھتا۔ عضدالدولہ بن بویہ دیلمی (م۔۳۷۲ھ) سفرو حضر میں کتاب الاغانی کو ساتھ رکھتا۔ اسی طرح ابوالقاسم حسن بن علی المعروف بہ ابن مغربی (۳۷۰ھ۔۴۱۸ھ) نے اپنے عہد وزارت میں والہانہ محبت اور شوق مطالعہ کی خاطر ہر وقت پاس رکھنے کے لیے کتاب الاغانی کا ایک اختصار تیار کر لیا تھا۔ اسی طرح ایک اختصار قاضی ابن واصل حموی (م۶۹۰ھ) نے، ایک، ابن باقیا جلبی الکاتب (م ۴۸۵ھ) نے اور ایک کاتب حرانی (م ۴۲۰ھ) نے تیار کیا۔ کتاب کی ہردلعزیزی اور قبول عام کی علامت یہ ہے کہ بڑے بڑے ادیبوں نے اس کے مختارات اور تجریدات تیار کیے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ابوالفرج اصفہانی کتاب الاغانی لکھنے میں پہلا مصنف نہیں ہے۔ اس کے کئی پیشرو ادیب کتاب الاغانی کے نام سے مغنیوں اور گویوں کے حالات پر کتابیں لکھ چکے تھے، لیکن اصفہانی نے جو بات پیدا کردی وہ اس کے پیشرو نہ کرسکے۔

کتاب کا پہلا ایڈیشن (۱۲۸۵ھ) بولاق میں طبع ہوا اس کی ۲۰ ضخیم جلدیں تھیں۔ یورپ سے ایک اور حصہ مل گیا اور وہ اکیسویں جلد کے طور پر شائع ہوا۔ اٹلی کے ایک فاضل نے اس کی مفید فہرستیں اور اشاریے تیار کرکے

شائع کردیئے' کتاب الاغانی کا دوسرا ایڈیشن قاہرہ (۱۹۰۵ء ۱۹۰۶ء) میں شائع ہوا۔

کتاب الاغانی کا ایک بڑا عمدہ ایڈیشن دارالکتب المصریہ قاہرہ سے ۱۹۲۷ء میں شائع ہونا شروع ہوا اور کئی برس تک شائع ہوتا رہا۔ یہ ایڈیشن بڑی خوبیوں کا حامل ہے۔ اس میں متن کو بڑی صحت اور احتیاط سے متعین کر کے قارئین کی سہولت کے لیے مشکول کردیا گیا۔ ہر صفحہ پر حاشیہ میں مشکل الفاظ کے معانی و مطالب' اختلاف قراءت' تاریخی و ادبی مزید معلومات درج کردی گئی ہیں۔ نیز ہر جلد کے آخر میں مفید فہرستیں شامل کتاب ہیں۔

ایک ایڈیشن دارالفکر مکتبہ الحیاۃ بیروت (۵۴ء۔۱۹۵۷ء) والوں نے ۲۱ جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اس ایڈیشن کے بارے میں کوئی خاص چیز قابل ذکر نہیں ہے۔

ابن منظور افریقی (۶۳۰۔۷۱۱ھ) صاحب لسان العرب نے بھی کتاب الاغانی کا ایک اختصار تیار کیا تھا جس کی کچھ جلدیں مختار الاغانی کے نام سے مصر سے شائع ہوئیں۔ ابن منظور نے اس اختصار میں دوسرے مصادر کے ذریعے کچھ تاریخی اور ادبی معلومات کا اضافہ بھی کیا ہے۔

اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ ابن واصل حموی نے بھی الاغانی کا ایک اختصار تیار کیا تھا۔ یہ اختصار تجرید الاغانی کے نام سے ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور ابراہیم ابیاری کی تحقیق و تصحیح سے مکتبہ مصر (شرکہ مساہمہ مصریہ) نے ۱۹۵۵ء و مابعد میں شائع کیا۔

کتاب الاغانی کا ایک ایڈیشن قطوف الاغانی کے نام سے مکتبہ صادر' بیروت والوں نے ایک سلسلہ شائع کیا ہے جس میں ایک ایک شاعر کے الگ الگ حالات کو اغانی کی مختلف جلدوں سے فراہم کر کے یکجا کردیا ہے۔ اسناد کو حذف کر کے نئے انداز میں کتاب الاغانی کو مرتب کیا گیا ہے۔ اس ایڈیشن میں قدیم موسیقی' نغمے اور گانے کو بھی بے کار سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مؤلف سلسلۂ ہٰذا کا خیال ہے کہ عصر حاضر میں قدیم موسیقی کے لیے کوئی گنجائش

نہیں ہے۔

کتاب الاغانی کا ایک اور ایڈیشن قابل ذکر ہے۔ اصفہانی نے اپنی کتاب کو کسی تاریخی یا ادبی لحاظ سے ترتیب نہیں دیا' بلکہ اس نے خلیفۂ رشید کے لیے منتخب شدہ تین راگوں سے اس کی ابتدا کی ہے۔ شاعروں کے حالات لکھے ہیں' مغنیوں کے حالات' سُر تال' نغمہ وغیرہ سے بحث کی ہے۔ پھر وہ بات سے بات پیدا کرتا ہے۔ ایک قصے کے بعد دوسرا قصہ لکھتا ہے۔

محمد خضری نے اس ترتیب کو مشکل اور غیر مفید سمجھ کر عربی ادب کے طلبہ کے لیے اسے مفید اور آسان شکل دی اور کتاب کا نام "مہذب الاغانی" رکھا۔ اس کتاب کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک قسم میں شاعروں اور ان کے اشعار سے بحث ہے۔ شاعروں کے تین طبقے بنائے ہیں: جاہلی' اسلامی اور جدید (اصفہانی کے عہد تک) کے۔ دوسری قسم میں مغنیوں اور راگیوں کے حالات اور ان کے فنی کارناموں سے بحث ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ ہر ایک نے کس کس قسم کے راگ ایجاد کیے تھے۔ یہ مہذب الاغانی مطبع مصر۔ شرکت مساہمہ مصریہ نے شائع کی ہے۔

○

ابنِ منظور افریقی کی لِسانُ العرب پر ایک نظر

جن جن ملکوں میں اسلام کا پرچم لہرایا' اور جہاں جہاں عربوں نے دین حنیف کا پھریرا اڑایا' وہاں علم و عرفان کے چشمے ابل پڑے جو ملک بھی اسلام کے زیر اثر آیا' عربی زبان و ادب کا مرکز بن گیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو عربی علوم و ادب کی تاریخ کے ایک طالب علم کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

افریقہ بھی مسلمانوں کے انہی مفتوحہ ممالک میں سے ہے' جہاں عربوں نے اپنی تہذیب و ثقافت کے اتنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ زمانے کی دستبرد اب تک انہیں مٹا نہیں سکی اور باوجودیکہ افریقہ وحشت اور بربریت میں شہرۂ آفاق ہے' لیکن عربی زبان کی گرفت میں کچھ اسطرح آیا' کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی وہاں اسلامی اثرات بڑے نمایاں اور ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں' چند برس ہوئے ایک امریکن مسیحی مبلغ نے لکھا تھا:

> "اسلام نے افریقہ کے لیے ایک مخصوص تعلیمی اسکیم تیار کر رکھی ہے سینی گال میں' جو فرانس کے ماتحت ہے' عربی زبان اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے اور اس قسم کے اٹھارہ سو ابتدائی مدارس موجود ہیں' ان سب مدارس میں بارہ ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہیں' فرانسیسی سوڈان میں بھی عربی کی تعلیم کا انتظام ہے' وہاں دو ہزار ایک سو تیرہ مدارس ہیں' جن میں پچھتر ہزار طلبہ پڑھتے ہیں' فرانسیسی گائنا میں بھی عربی تعلیم ترقی پر ہے' آئیوری کوسٹ میں اگرچہ مسلمانوں کی آبادی صرف گیارہ فیصد ہے' لیکن وہاں تین سو مسجدیں

۱۔ یہ مقالہ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۵۳' شمارہ ۱ میں شائع ہو چکا ہے۔

اور چار سو پچیس مدارس قرآن ہیں، برٹش نائیجریا کے تمام مدرسوں میں بھی عربی پڑھائی جاتی ہے "

یہ حالت اس زمانہ میں نظر آتی ہے جب افریقہ میں حکومت کی باگ ڈور دوسری اقوام کے ہاتھوں میں تھی، لہٰذا اگر ہم اپنی حکومت کے دور میں وہاں جلیل القدر علما، آئمہ، ادبا اور مختلف علوم و فنون کے ارباب کمال دیکھتے ہیں تو یہ چنداں تعجب کی بات نہیں ہے۔

مئولف لسان العرب کے مختصر حالات

اس مضمون کے موضوع بحث لسان العرب کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صاحب کتاب کے حالات چند سطور میں پیش کر دیئے جائیں۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تاریخ اسلام کے اس جلیل القدر لغوی اور ادیب کے حالات کی جانب تاریخ اور تذکرہ نگاروں نے بہت کم توجہ کی ہے اور کتابوں میں اس کے نہایت مختصر اور مجمل حالات ملتے ہیں۔ اگر اتنا بڑا عالم یورپ میں پیدا ہوا ہوتا، تو اس کی سیرت پر مستقل کتابیں لکھی جاتیں اور اس کی زندگی کا کوئی گوشہ ہماری نظروں سے اوجھل نہ رہنے پاتا۔ اس ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی غیر مناسب نہ ہو گا، کہ صاحب لسان العرب کے حالات زیادہ تر اس کے دو معاصرین کی روایت پر منحصر ہیں، ایک صلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی (۶۹۶۔ ۷۶۴ھ)، جس نے اپنی کتاب نکت الھمیان (مطبوعہ ۱۹۱۱ء ص ۲۷۵ و بعد) اور الوافی بالوفیات (مطبوعہ ۱۹۳۱ء، ۱: ۵۰) میں اس کے حالات لکھے ہیں۔ دوسرے محمد بن شاکر الکتبی (۶۸۶۔ ۷۶۴ھ) نے اپنے کتاب فوات الوفیات (مطبوعہ ۱۲۹۹ء ۲: ۳۶۵) میں اس کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ بعد کے تمام سیرت نگاروں نے انہی دونوں سے استفادہ کیا ہے اور بیشتر نے انہی دونوں کے بیانات نقل کر دیے ہیں، اس میں حافظ ابن حجر کی الدرالکامنہ (۲: ۲۶۲) سیوطی کی بغیۃ الوعاۃ (مطبوعہ ۱۳۲۶ھ، ص ۱۰۶) ابن العماد کی شذرات الذہب (۶: ۲۶) سرکیس کی معجم المطبوعات، الزرکلی کی الاعلام (۳: ۹۹۰۔ ۹۹۱) کسی کا استثناء نہیں ہے، المنہل العذب فی تاریخ طرابلس الغرب (ص ۱۵) اور سفینۃ السعادۃ، (۱: ۱۰۶) میں بھی ابن منظور کے کچھ حالات مندرج ہیں۔

ولادت اور تعلیم

محمد نام، جمال الدین لقب، ابوالفضل کنیت اور الافریقی اور المصری نسبت ہے، پورا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن مکرم بن علی احمد بن ابی القاسم بن حبقہ بن منظور۔(۱) سیوطی نے سلسلہ نسب میں علی (دادا کے نام) کے ساتھ کسی دوسری روایت کے مطابق رضوان بھی لکھا ہے اور صفدی نے الرویفعی الانصاری نسبت درج کی ہے۔(۲) اس نسبت کے لحاظ سے مؤلف حضرت ردیفعہ بن ثابت صحابیؓ کے خاندان کی یادگار تھے، ابن منظور اور ابن مکرم کے نام سے عام طور پر مشہور ہیں۔

وہ ۲۲ محرم الحرام ۶۳۰ھ کو دو شنبہ (پیر) کے دن مصر کے ایک بڑے علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔(۳) بچپن ہی سے علم و ادب کی طرف میلان تھا، مختلف اساتذہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ ان میں ابن مقیر مرتضیٰ بن حاتم، عبدالرحیم بن الطفیل اور یوسف المخیلی زیادہ مشہور ہیں۔(۴) نحو، لغت، تاریخ اور کتابت میں کمال حاصل کیا۔ مؤلف کا انداز تحریر نہایت سلیس، شگفتہ، متین اور سنجیدہ ہے اور ادبیات میں نہایت بلند درجہ ہے۔(۵) نظم و نثر دونوں میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ شعر کے نمونے صفدی اور ابن شاکر نے نکت الہمیان اور فوات الوفیات میں درج کئے ہیں۔

۱۔ بغیة الوعاة، ص ۱۰۶

۲۔ نکت الہمیان، ص ۲۷۶

۳۔ ایضاً

۴۔ الدرر الکامنہ، ۴: ۲۶۲، ۲۶۳، نکت الہمیان میں عبدالرحیم کی بجائے عبدالرحمن بن الطفیل مرقوم ہے جو زیادہ قرین صحت ہے۔

۵۔ بغیة الوعاة، ص ۱۰۶

مشاغل

بعض تاریخی حقائق بڑے تعجب انگیز ہوتے ہیں ہماری حیرت کی کوئی حد نہیں رہتی' جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے اسلاف' زندگی کی دوسری مشغولیتوں کے باوجود علمی مشاغل میں کتنا انہماک رکھتے تھے' یاقوت حموی امام ابن جریر کے متعلق لکھتا ہے کہ اگر ان کی تصنیفات اور تالیفات کے اوراق کو ان کی زندگی کے دنوں پر تقسیم کیا جائے تو چالیس ورق (اسی صفحات) روزانہ کا اوسط پڑتا ہے۔ حافظ ابن حجر کی تصانیف کتنے مختلف علوم پر ہیں' فتح الباری' الاصابہ' الدرر الکامنہ اور تہذیب جیسی ضخیم کتابیں ابن حجر کے علم و فضل کی شاہد ہیں۔ سیوطی کی روایات کے استناد کے متعلق جو بھی کہا جائے' لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ چار پانچ سو کے درمیان کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ یاقوت حمویؒ' ابن کثیرؒ' ابن تیمیہؒ اور دوسرے بے شمار علما ہیں جن کے قلم کی روانی اور برق رفتاری دیکھ کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے اور اندازہ نہیں کر پاتا کہ یہ بزرگ لکھنے پڑھنے کے لیے اتنا وقت کیسے نکال لیا کرتے تھے۔

ہمارے مؤلف کو کتب بینی اور تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا باوجودیکہ قاہرہ میں مدت العمر دیوان الانشا سے وابستہ رہے۔(۱) پھر طرابلس میں نظارت اور قضا کے فرائض انجام دیتے رہے' لیکن پڑھنے کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ان مشغولیتوں کے باوجود تاریخ ادب کی بہت کم کتابیں ایسی ہوں گی جو ابن منظور کی نگاہ سے بچ سکی ہوں گی' محض مطالعہ ہی کا شوق نہ تھا' بلکہ اس کے ساتھ تالیف و تصنیف کا بھی ذوق تھا۔

۱۔ فوات الوفیات؛ دیوان الانشاء میں خدمت کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کے لیے بڑی علم و فضل کی ضرورت تھی۔ القلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ کتنے علوم و فنون میں کمال حاصل کیے بغیر دیوان الانشاء میں کام کرنا قطعاً ناممکن ہے۔

ابن شاکر نے فوات الوفیات میں ان کو کثیر الخط لکھا ہے۔ صلاح الدین صفدی نے خود ابن منظور کے صاحبزادے قاضی قطب الدین کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ان کے والدین منظور ابن منظور نے پانسو کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی چھوڑیں۔(۱) صفدی کا بیان ہے کہ وما اعرف فی کتب الادب شیئا الا اختصر (مجھے علم و ادب پر جو کتاب بھی معلوم ہے۔ اس کا اس نے اختصار ضرور کیا تھا)۔ سیوطی لکھتے ہیں کہ روایات و نقل کے اعتبار سے ان منظور کی مختصرات کی تعداد پانچ سو مجلدات تک پہنچتی ہے۔(۲) ابن منظور نے جو مختصر مختارات لکھے ہیں ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

(۱) مختار الاغانی بہ ترتیب حروف تہجی؛ (۲) مختصر تاریخ دمشق لابن عساکر، قریباً چوتھائی حصہ میں اختصار لکھا ہے؛ (۳) مختصر تاریخ بغداد للسمعانی؛ (۴) مختصر مفردات لابن البیطار؛ (۵) مہذب سرور النفس بمدارک الحوامس الخمس للتیفاشی؛ (۶) مختصر العقد لابن عبدربہ؛ (۷) مختصر ذخیرہ لابن بسام؛ (۸) مختصر زہر الادب للحصری؛ (۹) مختصر یتیمة الدہر للثعالبی؛ (۱۰) مختصر نشوان المحاضرة؛ (۱۱) مختصر تاریخ الخطیب؛ (۱۲) مختصر الحیوان للجاحظ اور (۱۳) انتشار الازہار فی اللیل والنہار۔

انہی چند کتابوں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ابن منظور کتب بینی اور تصنیف و تالیف میں کس درجہ استغراق اور انہاک رکھتے تھے کہ کتنی ضخیم کتابوں کو اول سے آخر تک بنظر غائر پڑھا، یاد رکھا اور پھر انکے مختارات اور مختصرات لکھے۔ ایک الاغانی ہی کو لیجیے کہ بقول صاحب الوافی الوفیات(۳) ابوالفرج اصفہانی نے اس کتاب کو پچاس برس کی طویل مدت میں تالیف کیا۔ پھر غور فرمایئے کہ کتاب کے مطالعہ اور بلحاظ حروف تہجی

۱۔ نکت الہمیان، ص ۲۷٦

۲۔ بغیة الوعاة، ص ۲۰٦، اس زمانہ میں قدیم علما کی مطول کتابوں کو محفوظ کرنے کے لیے ان کی تلخیص کا زیادہ رواج تھا۔

۳۔ دیکھیے الوافی بالوفیات، ۱:۵۰

اس کے اختیار اور ترتیب کے لیے کتنی مہلت اور محنت کی ضرورت تھی' یہ بھی پیش نظر رہے کہ مؤلف کے لیے تنہا یہی ایک کام نہ تھا' بلکہ دفتری مشاغل بھی تھے اور پھر تنہا ایک ہی کتاب مؤلف کے قلم کا ثمر نہیں ہے' بلکہ ایسی بہت سی کتابیں ہیں جن میں سے ایک ایک کے لیے عمر درکار ہے۔

ابن العماد حنبلی کے قول کے مطابق ابن منظور مصر اور دمشق میں حدیث کا درس بھی دیتے رہتے ہیں(۱) اور سیوطی رقمطراز ہیں کہ امام سبکی اور حافظ ذہبی نے ابن منظور سے روایت کی ہے'(۲) لیکن ان کا شمار محدثین کے اس زمرے میں کیا جو حفظ کے اعلیٰ درجے تک تو نہیں پہنچے' مگر علوم سند میں منفرد ہیں'(۳) مگر جہاں تک نحو و لغت کا تعلق ہے ابن منظور کا شمار ان علوم کے ائمہ میں ہے۔ (۴) حافظ ابن حجر نے ابن فضل اللہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ ابن منظور آخری عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے ۔(۵) ظاہر ہے کہ یہ محرومی بصارت کتب بینی اور کتب نویسی میں حد درجہ انہماک کا نتیجہ تھی' آخر میں مصر میں قیام اختیار کیا اور وہیں بیاسی برس کی عمر میں شعبان ۷۱۱ھ میں وفات پائی۔ (۶)

ابن شاکر نے(۷) ابن منظور کے تشیع بلا رفض کا بھی ذکر کیا ہے' لیکن معاصرانہ چشمک سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں' دوسرے سوانح نگاروں نے بھی اس کی

۱۔ شذرات الذہب' ۶: ۲۶

۲۔ ا۔ بغية الوعاة' ص ۱۰۶

۳۔ جلد اول' ص ۱۶۳

۴۔ ایضاً' ص ۲۲۹

۵۔ الدرر الکامنہ' ۴: ۲۶۳

۶۔ حسن المحاضرة' ۱: ۱۶۳

۷۔ فوات الوفیات' ۲: ۲۶۵

تقلید میں اس کو نقل کر دیا اور یہ نہ سوچا کہ یہ الزام کہاں تک حقیقت و اصلیت پر مبنی ہے۔

لسان العرب

ابن منظور کی سب سے قیمتی اور اہم تالیف لسان العرب ہے، اس کا پہلا ایڈیشن مصر سے بیس ضخیم جلدوں میں شائع ہوا، یہ عربی زبان کا سب سے بڑا، مستند اور مفصل لغت ہے، کتاب کے نام کے ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ ابن منظور ہی پہلا مؤلف نہیں، جس نے لسان العرب کے نام سے عربی زبان کا اتنا ضخیم لغت ترتیب دیا ہو، اس سے کئی صدی پہلے شیخ ابو علی سینا (۳۷۰۔۴۲۸ھ) نے اسی نام سے ایک ضخیم لغت مرتب کیا تھا، ڈاکٹر جمیل میلبا نے اپنی کتاب ابن سینا کے صفحہ ث پر عربی لغت کی ایک کتاب موسوم بہ لسان العرب دس جلدوں میں ابن سینا کی جانب منسوب کی ہے، زوری کی کتاب نزھۃ الارواح میں ابو علی سینا کے ترجمہ کے تحت زیادات میں مرقوم ہے۔

ثم صنف الشیخ کتابا فی اللغة وسما لسان العرب لم یصنف مثله فی اللغة ولم ینقل الی البیاض فبقی علی مسودته لم یھتد احد الی ترتیبه۔

(یعنی پھر شیخ ابن سینا نے علم لغت میں ایک کتاب تصنیف فرمائی اور اس کا نام لسان العرب رکھا۔ اس جیسی لغت میں کوئی اور کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔ مگر وہ اس کی بیاض میں نقل نہیں کی گئی، لہٰذا اس کا مسودہ ایسا ہے جس کی جانب کسی کو رہنمائی نہیں ہوئی)۔

شیخ کی لسان العرب کی عدم موجودگی میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ ابن منظور نے اپنی اس کتاب کا نام محض اتفاقی طور پر رکھا یا مستعار لیا اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ

لسان العرب پہلی لسان العرب کا کہاں تک چربہ ہے۔

وجہ تالیف

ابن منظور کے لغت سے پہلے بھی عربی کے مستند لغات موجود تھے۔ خلیل بن احمد (م ۱۷۵ھ) کی کتاب العین اگرچہ اب ناپید ہے،(۱) لیکن بعد کے مؤلفوں نے اس سے استفادہ کیا ہے، اور اندلس کے مشہور مصنف ابوبکر زبیدی (۳۷۹ھ) نے اس کا اختصار بھی کیا، اس کے بعد ابن درید (م ۳۲۱ھ) نے کتاب العین کے انداز پر کتاب الجمہرۃ فی اللغۃ لکھی۔ بعد کی مشہور کتب لغت میں سے ابو عالی القالی (م ۳۵۶ھ) کی البارع، ابو منصور الازہری (م ۳۷۱ھ) کی الصحاح، ابو غالب قرطبی (م ۴۳۶ھ) کی الموعب، ابن سیدہ (م ۴۵۸ھ) کی المحکم، زمخشری (م ۵۳۸ھ) کی المجمل، الجوہری (م ۳۹۸ھ) کی اساس البلاغہ اور صاغانی (م ۶۶۰ھ) کی العباب قابل ذکر ہیں، لیکن ان کتب کی موجودگی بھی ابن منظور کے لیے وجہ تسلی نہ ہوئی اور ان کو ان میں سے ہر ایک کتاب میں کچھ نہ کچھ ایسی کمی اور کوئی نہ کوئی ایسی خامی نظر آئی کہ انہوں نے ایک لغت کی تالیف کی ضرورت محسوس کی۔ انہیں اگر کسی کتاب میں علم و ادب کا کوئی بڑا ذخیرہ نظر بھی آیا تو اس کی ترتیب ان کی نگاہ میں ناپسند ٹھہری اور اگر کسی کی ترتیب تسلی بخش نظر آئی تو اس کو علمی و ادبی خامیوں سے مبرّا نہ پایا تو انہوں نے ایک ایسی جامع لغت کی ترتیب کی ضرورت محسوس کی جو ان کے نقطۂ نظر سے ترتیب اور علم و ادب کے ذخیرہ دونوں لحاظ سے تسلی بخش اور قابل اعتبار ہو۔ اس مقصد کے پیش نظر ابن منظور نے لسان العرب کی تیاری شروع کی، لیکن انہیں اپنے پیش رو مؤلفین لغت کی طرح الفاظ کی تشریح و تحقیق کے لیے طویل سفر اختیار

۱۔ لسان العرب، ۱: ۲

نہیں کرنا پڑے اور نہ بے آب و گیاہ صحراؤں کی خاک چھاننا پڑی۔ مؤلف نے کتاب کے دیباچے میں یہ اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے پہلی کتب لغت پر انحصار کرتے ہوئے انہی کی محنتوں سے استفادہ کیا ہے۔(ا) سیوطی بغیة الوعاة میں لکھتے ہیں:

جمع فی لسان العرب بین التهذیب والمحکم والصحاح و حواشیه والجمهرة والنهایه (ابن منظور نے لسان العرب میں تہذیب' محکم' صحاح' اس کے حواشی' جمہرہ اور نہایہ کے مابین جمع کیا ہے)۔

لیکن احمد پاشا تیمور' سیوطی کی تغلیط کرتے ہوئے اپنی کتاب تصحیح لسان العرب میں یوں رقم طراز ہیں:

"والصواب ان الجمهرة لیست مماجمعه ابن منظور' بل مبنی کتابه علی خمسة فقط وهی التی صرح باسمائها فی خطبته" (صحیح یہ ہے کہ صاحب لسان نے جمہرہ کو اس کے مصادر میں شامل نہیں کیا ہے' بلکہ اس کتاب کے مصادر وہی ہیں جن کی مصنف نے کتاب کے خطبے میں صراحت کی ہے)۔

لسان کی ترتیب

مؤلفین لغت نے اپنی کتب لغت کو تین طریقوں سے ترتیب دیا ہے:

(ا) خلیل نے کتاب العین کو مخارج الفاظ کے لحاظ سے مرتب کیا ہے۔ المحکم اور تہذیب میں بھی اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ا۔ لسان العرب' ۱: ۳

(۲) ابن درید نے الجمہرۃ میں حروف تہجی کی اصل ترتیب کے لحاظ سے الفاظ کو ترتیب دیا ہے' المجمل' المحیط' اساس البلاغہ وغیرہ بھی اسی طریقہ سے مرتب کی گئی ہیں۔

(۳) تیسرے گروہ کا امام جوہری ہے' اس نے الصحاح میں نیا انداز ترتیب اختیار کیا اور الفاظ کے حرف آخر کے اعتبار سے کتاب مرتب کی' لسان العرب' قاموس اور تاج العروس میں بھی یہی ترتیب اختیار کی گئی ہے۔

کتاب کی اہمیت

لسان العرب کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ مؤلف نے ساٹھ ہزار الفاظ کے مصادر اور مادوں پر بحث کی ہے اور ان کی تشریح و توضیح میں کلام عرب اور ان کے ضرب الامثال' محاورات' خطبات' آیات قرآنی اور احادیث نبویہ سے استشہاد کیا ہے' اس ضمن میں کم و بیش سترہ سو شعرا کے نام اور بے شمار اشعار لسان العرب میں محفوظ ہو گئے ہیں۔

غور فرمایئے کہ اتنی ضخیم اور مفصّل لغت کی تدوین کے لیے کتنے صبرو استقلال' عزم و ہمت' علم و فضل' محنت و مشقت اور ذہانت و ہوش مندی کی ضرورت تھی' آج اس ترقی کے زمانے میں اگر اتنا بڑا لغت لکھنا ہو تو ایک چھوڑ کئی علمی مجالس قائم کرنی پڑیں' بلکہ کی جاتی ہیں' مؤلفین کے بورڈ بنائے جاتے ہیں' مختلف شعبوں کے ماہرین کی امداد حاصل کی جاتی ہے' تب کہیں جا کر یہ بیل منڈھے چڑھتی ہے' لیکن اس زمانے میں جب کہ یہ علمی سہولتیں مفقود تھیں: نہ پریس اور مطابع تھے' نہ نقل و حمل کے وسائل و ذرائع آج کے جیسے تھے' اتنے بڑے کام کا بیڑا اٹھانا کتنا مشکل کام تھا اور اس کو تکمیل تک پہنچانا اور بھی دشوار تھا' مگر آفریں ہے ان اولوالعزم بزرگوں کی جوانمردی اور ہمّت پر جنہوں نے اتنے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے کہ انہیں دیکھ کر آج دنیا فرط حیرت و استعجاب سے انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔

سالہا سال کی مسلسل و پیہم محنت کے بعد ابن منظور نے لسان العرب کو ۶۸۹ھ میں پایہ تکمیل تک پہنچایا اور لغت کے ساتھ ساتھ علم وادب کا اتنا شاندار قابل فخر ذخیرہ جمع کر

دیا کہ یہ کتاب محض ایک کتاب لغت ہی نہیں، بلکہ عربی علوم کا انسائیکلوپیڈیا بن گئی۔ اگر ابن منظور اور کوئی کتاب نہ لکھتا اور صرف لسان العرب ہی چھوڑ جاتا تو تنہا یہی اتنی بڑی یادگار تھی کہ رہتی دنیا تک اس کا نام فراموش نہ کیا جا سکتا۔

یورپ کے بڑے بڑے مستشرقین نے دوسری زبانوں کے مقابلے میں عربی زبان و لغت کی وسعت کا اعتراف کیا ہے اور ایڈورڈ ولیم لین ۱۸۰۱ء، جس نے عربی لغت کے مطالعہ اور تدوین میں ساری عمر صرف کر دی، اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ عربی زبان لغات، علمی تحقیق، وسعت نظر اور محنت و تفصیل کے اعتبار سے تمام لغات سے سبقت و فوقیت لے گئی ہے'(۱) لیکن المانی مستشرق نلد نے اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود دبی زبان میں وسعت نظر کی کمی کا بھی اظہار کیا ہے، افسوس کہ اس نے لسان العرب نہیں دیکھی، ورنہ اس کو ابن منظور کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا، اس لیے کہ وہ عجمی الفاظ کی اصلیت و مآخذ کا پتہ بھی دیتا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"الفلسفة الحکمة اعجمی (۱۱: ۱۸، س ۳)

"والتریاق بکسر التاء معروف فارسی معرب نیز جسق الجوسق . . . معرب واصله کوشک بالفارسیة (۱۱: ۳۱۵)

القنذغ والقنذع والقندوع کله الدیوث سریانیة لیست بعربیة محضة (۱۰: ۱۷۷)

فستق کانه بلسان الروم تکلمت به العرب (۱۲: ۲۳)

اسی طرح جہاں کہیں اس قسم کے الفاظ آ گئے ہیں، ابن منظور نے ان کے مآخذ اور ان کی اصل بتانے کا پورا اہتمام کیا ہے'(۲) ان چار مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے

۱۔ دیباچہ مد القاموس

۲۔ لسان العرب، ۴: ۹۴

کہ ہمارے عربی لغت نویس' فارسی' سریانی' ترکی' رومی وغیرہ مآخذوں کا بھی پتہ دیتے ہیں۔

۶۔ تسامحات

کسی کتاب کے متعلق نقص سے یکسر براءت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے لسان العرب جیسی بڑی کتاب میں. تسامحات کا پایا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایک انسان کا حافظہ اور علم کہاں تک کام کر سکتا ہے' لیکن افسوس ان لوگوں پر ہے جنھوں نے لسان العرب کی نقل میں اس کے تسامحات پر نظر نہ ڈالی اور انہیں جو کچھ ملا بے کم و کاست نقل کر دیا' مثلاً لسان میں معقل بن خویلد کا یہ شعر مرقوم ہے:(۱)

وسود جعاد غلاظ الرقا

ب مثلهم يرهب الراهب

مصحح نے اس کی تصحیح کی زحمت اٹھائے بغیر حاشیہ پر یہ لکھ دیا "اصل میں اسی طرح ہے۔۔۔۔ نصف اول کے حذف کے ساتھ۔"

تاج العروس کے مؤلف شہیر سید مرتضیٰ زبیدی (م ۱۲۰۵ھ) نے بھی لسان العرب کے تتبع میں یہی ناقص شعر نقل کر دیا'(۲) وہاں بھی حاشیہ نگار صاحب نے لکھ دیا کہ لسان میں اسی طرح مرقوم ہے' حالانکہ اشعار الھذلین میں یہ شعر یوں ملتا ہے:

وسود جعاد الرقا

ب مثلهم يرهب الراهب

لسان العرب (۱۵: ۱۲۳) میں عبید بن الابرص کا ایک شعر یوں مندرج ہے:

۱۔ لسان العرب' ۴: ۹۴

۲۔ تاج العروس' ۲: ۳۲ لسان العرب (۱۵: ۱۲۳) میں عبید بن الابرص کا ایک شعر یوں مندرج ہے:

اعاقر کنات رحم

ام غانم کمن یخیب

لیکن عبید کے دیوان (ص ۷) میں یہ شعر یوں ہے:

اعاقر مثل نات رحم

ام غانم مثل من یخیب

ایک دو مثالیں اس کی بھی ہیں کہ ایک جگہ ایک شعر ایک ترتیب سے درج ہے' لیکن دوسرے مقام پر اسی شعر کا مصرعۂ اول مصرعۂ ثانی بن گیا ہے' مثلاً حمید الارقط کے شعر میں (۹: ۴۱) اور (۱۸: ۴۹) میں مصرعے الٹ گئے ہیں' یا (۲۰: ۲۹) پر مؤلف نے بطور استشہاد کے کمیت کا شعر درج کرنا چاہا ہے اور قال الکمیت لکھ کر شعر کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت مؤلف کو شعر بھول گیا اور بعد میں درج کر دینے کے لیے جگہ خالی چھوڑ دی' لیکن بات ذہن سے اتر گئی اور شعر درج نہ ہو سکا۔

۴: ۴۷۴ پر ایک شعر ہے:

رکضن الخیل فیھا بین بس

الی الاوراد تنحط بالنھاب

اس سلسلہ میں مؤلف نے قال عباس بن .... لکھ کر شاعر کے باپ کا نام درج نہیں کیا اور جگہ خالی چھوڑ دی' لیکن بعینہ یہی شعر دوسرے مقام پر درج کرتے ہوئے لکھا۔ قال عباس بن مرداس السلمی (۷: ۳۲۷)

اس کی مثال بھی ہے کہ مؤلف کو شعر نقل کرتے وقت شاعر کے متعلق شک ہو گیا اور بجائے ایک شاعر کا نام لکھنے کے دو کا لکھ دیا' مثلاً (۲۱: ۳۳۶) پر لکھتا ہے قال ابو ذؤیب اوصحرا الغی بعض دفعہ ایسا بھی کہ ایک مقام (۲: ۲۰۷) پر ایک شعر عبداللہ بن عتبہ الضبی کی جانب منسوب کیا ہے' پھر بعینہ وہی شعر دوسرے مقام (۱۹: ۱۴۳) پر اسی شاعر کی جانب منسوب کرنے کے بعد انتساب میں شک پیدا ہو گیا ہے۔ پھر خود ہی اس کی تصحیح کر دی ہے' والصحیح انه لسلام بن عویة الضبی۔

یا ایک شعر ایک مقام پر (۶: ۷۶) غسّان بن وعلہ کی جانب منسوب کیا ہے لیکن وہی شعر دوسرے مقام پر (۱۹: ۱۹۴) الشمر بن تولب کی طرف منسوب کر دیا۔ اس قسم کی مثالیں اور بھی ملتی ہیں۔ انتساب میں اختلاف کے علاوہ خود شعروں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے' ایک مقام پر ایک شعر درج ہے' دوسرے مقام پر وہی شعر تھوڑے سے اختلاف سے مرقوم ہے' اس کی مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں۔

بعض ایسے اشعار ہیں کہ مؤلف لسان العرب نے ان کو کسی شاعر کی جانب منسوب کر دیا ہے' لیکن وہ اشعار اس شاعر کے مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے' مثلاً ذیل کا شعر طرماح کی جانب منسوب کر دیا ہے (۶: ۲۵۸)

کل مشکوک عصافیرہ

قانی اللون حدیث الزمام

یہ شعر طرماح کے دیوان میں موجود نہیں اور نہ اس کے ملحقہ ضمیمہ میں ہے' جس میں مختلف کتب سے اس کے اشعار جمع کر کے درج کیے گئے ہیں' بعض اشعار لسان العرب اور دواوین میں باختلاف الفاظ پائے جاتے ہیں۔

اسی طرح اور بھی تسامحات ہیں' جنہیں ہم نے لسان العرب کی فہارس مرتب کرتے وقت جمع کیا تھا' اگر ان سب کا ذکر کیا جائے تو اس کے لیے کئی مقالوں کی ضرورت ہوگی۔

○○○

ابوالعلاءالمعری : اسلامی فکروادب میں نئے دور کا آغاز

ابو العلاءَ المُعَرِی چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کا ایک بڑا نامور مفکر اور ادیب تھا۔ اس نے اسلامی فکر و فلسفہ اور شعرو ادب میں نئے باب کا اضافہ کر کے اپنی جدت پسندی اور ذہانت و شاہ دماغی کا ثبوت بہم پہنچایا۔ عربی فکر و ادب کی تاریخ میں اس کا نام سرفہرست ہے۔ بعد میں آنے والے مشرق و مغرب کے شاعر اور مفکر اس کے افکار و خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

مَعَرّی نے نظم و نثر کے لیے عنوان اور جدید موضوع تلاش کیے۔ وہ پہلا ادیب ہے جس نے جنت اور دوزخ کی سیر کے حالات قلمبند کیے۔ اس نے اجتماعی مسائل' اخلاقیات' حکومتوں کے نظم و نسق اور قوانین اور مذہب و سیاست پر دل کھول کر شعر کہے اور مسائل حیات کو موضوع سخن بنانے میں معری کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ وہ صاحب طرز ادیب بھی ہے اور جدت پسند شاعر بھی۔ وہ ایسا نقاد ہے جو متانت و سنجیدگی کے ساتھ ساتھ تضحیک کرنے اور پھبتی اڑانے سے ذرا نہیں چوکتا' اس کی تنقید میں استہزا کا پہلو نمایاں ہے۔

ابو العلاء احمد بن عبداللہ المعری بروز جمعہ بتاریخ ۲۷ ربیع الاول ۳۶۳ھ/ ۹۷۳ء حلب کے شہر معرہ میں پیدا ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد اپنی عزت و جاہ' دولت و ثروت اور علم و فضل کے اعتبار سے شام کے علاقے میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ معری کا دادا' چچا اور باپ یکے بعد دیگرے منصب قضا پر فائز رہ چکے تھے۔

ابو العلاء معری عمر کی چار بہاریں بھی نہ دیکھنے پایا تھا کہ چیچک کے شدید ترین حملے

نے اس کی دائیں آنکھ تو بالکل ضائع کردی۔ بائیں آنکھ کی بصارت میں بھی فرق آگیا۔ چھ برس کی عمر میں معری دونوں آنکھوں سے یکسر محروم ہو گیا۔

اس نے اپنے شہر معرہ میں نشوونما پائی۔ ابتدا میں ادب و لغت کی تعلیم زیادہ تر اپنے والد سے حاصل کی۔ چھوٹی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لینے کے بعد مختلف قراءتوں میں دسترس پیدا کر لی تھی۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر و سخن کی مشق شروع کر دی۔ ابھی المعری عمر کے چودہ دانے ہی گننے پایا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کی موت نے تحصیل علم کے شوق کو تیز تر کر دیا۔ معری اپنے شہر سے نکل کر طرابلس، شام، انطاکیہ، لاذقیہ اور حلب کی مشہور درس گاہوں میں علوم کے صافی چشموں سے اپنی تشنگی بجھاتا رہا۔ اس عہد میں طرابلس کا کتب خانہ نادر کتب اور نایاب مخطوطات پر مشتمل تھا۔ ابو العلاء کو اس کتب خانہ سے استفادہ کا بڑا موقع ملا۔ افسوس کہ یہ نادر کتاب خانہ صلیبی جنگوں میں عیسائی حکومتوں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔

معری ۳۸۴ھ/۹۹۴ء میں بعمرؔ ۲۰ سال حلب کو خیرباد کہ کر اپنے وطن معرہ آگیا۔ جہاں وہ ایک چھوٹی سی جاگیر پر، جس کی آمدنی تیس دینار سالانہ تھی، بسر اوقات کرتا رہا۔ یہ رقم اس کی ضروریات زندگی کی بمشکل کفالت کرتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابو العلاء کی زندگی تنگ دستی اور عسرت میں گزری، غیر موافق اور ناسازگار حالات کے باوجود اس کے شوق علم میں کوئی فرق نہ آنے پایا۔ آہستہ آہستہ اس کی علمی شہرت علوم و فنون کے مرکزوں میں پھیلنے لگی۔

امیر حلب سے جھگڑا ہو جانے پر ابو العلاء معرہ چھوڑ کر بغداد جا پہنچا۔ ابو العلاء کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کے علم و فضل کی شہرت وہاں پہنچ چکی تھی۔ بغداد میں اس کی بڑی عزت و تکریم اور آؤ بھگت ہوئی۔ تشنگان علم و ادب اس کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہونے لگے۔ بغداد کے ادیبوں اور عالموں نے اس کی وسعت معلومات و ذہانت کو خراج عقیدت و تحسین پیش کیا۔

ابو العلاء کے قیام بغداد کے زمانے میں سیاسی اور اجتماعی حالات بڑی تیزی سے

تبدیل ہو رہے تھے۔ انقلاب زمانہ ابو العلاء کی پریشانیوں کا موجب بن گیا۔ ایک طرف تو اسے شفیق و مہربان ماں کی موت کی خبر نے بڑا مغموم اور اندوہگین بنا دیا۔ دوسری طرف زاد راہ نے جواب دے دیا۔ اس پر طرہ یہ کہ علم و فضل کے اس مرکز میں حاسدوں نے اس کے لیے جینا محال کر دیا۔ ابو العلاء کی خودی اور عزت نفس نے اسے اجازت نہ دی کہ وہ کسی کے سامنے دست سوال پھیلائے۔ چنانچہ مجبور ہو کر وہ ۴۰۰ھ/۱۰۱۰ء میں معرہ واپس پہنچا' لیکن وہاں حالات بد سے بدتر ہوتے دیکھ کر اسے بغداد کی علمی مجلسوں اور ادبی محفلوں سے محرومی کا بڑا رنج و قلق ہوا۔

وفور علم و فضل اور وسعت معلومات کے ساتھ ذہنی صلاحیتیں بھی موجود تھیں لیکن آمدنی کے راستے مسدود تھے۔ شاہی درباروں میں شرف باریابی سے عزت نفس آڑے آتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ افلاس و تنگ دستی' زمانے کی قدر ناشناسی اور بصارت و بینائی کی محرومی نے دنیا سے اس کا دل اچاٹ کر دیا تھا۔ اس نے معرہ پہنچ کر عزلت نشینی اختیار کی' لیکن تھوڑے عرصے کے بعد پھر درس و تدریس میں مصروف ہو گیا۔ تنہائی' قنوط و یاس اور بے چارگی نے دنیا کی نعمتوں سے بے رغبتی' بلکہ نفرت پیدا کر دی تھی' چنانچہ وہ گوشت' دودھ' انڈے اور شہد کے استعمال سے کلی احتراز کرنے لگا۔ دال اور سبزی پر قناعت کر بیٹھا اور عمر کا باقی حصہ معرہ میں رہ کر حمد و تسبیح اور درس و تدریس میں صرف کر دیا۔

ابو العلاء معری پستہ قد' دبلا پتلا اور کمزور انسان تھا۔ نحیف و لاغر جسم' چہرے پر چیچک کے داغ' مگر تھا بلا کا ذہین۔ وہ آسمان علم و ادب اور فکر و نظر پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا۔ اس کے افکار و خیالات نے فکر و ادب کو نئی رونق اور جدید آب و تاب بخشی۔

مشرق کا یہ صاحب فکر و نظر حکیم جمعہ کے روز ماہ ربیع الاول ۴۴۹ھ/۱۰۵۷ء میں اپنے وطن مالوف معرہ میں سفر آخرت اختیار کر گیا۔

ابو العلاء معری کو ایسا زمانہ نصیب ہوا جب کہ سیاسی و اجتماعی سکون مفقود تھا۔ مشرق و مغرب میں اضطراب اور بے چینی کی فرمانروائی تھی۔ خلافت بغداد ختم ہوا چاہتی

تھی۔ ابو العلاء کے سامنے تین خلیفے بغداد میں سریر آرا ہوئے۔ ۳۸۱ھ میں آل بویہ نے بڑی شان و شوکت اور قوت و اقتدار حاصل کر لیا اور عضد اللہ بویہی کا بغداد میں داخل ہونا تھا کہ خلافت بغداد آل بویہ کے رحم و کرم پر رہ گئی۔ وہ جس کو چاہتے خلیفہ نامزد کر دیتے۔ اور جب چاہتے اسے معزول کر دیتے۔ درحقیقت خلافت و حکومت آل بویہ کے ہاتھ میں تھی جو شیراز میں بیٹھے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کرتے تھے۔ اگرچہ ادبی اور عمرانی اعتبار سے ان کا عہد بڑا بارونق اور کامیاب تھا' لیکن ملکی لحاظ سے بالکل ناکام رہا۔ آل بویہ کے عہد میں عراق کی سیاسی اور انتظامی حالت بد سے بد تر ہوتی چلی گئی۔ دینی اور مذہبی فرقہ واریت نے بھی سر اٹھایا۔ بالآخر طغرل بیگ ۴۴۸ھ میں خلیفہ قاسم بامراللہ کی دعوت پر بغداد میں داخل ہوا۔

مشرق اقصیٰ میں دولت سامانیہ کے طفیل بخارا سے اسلام کی کرنیں ماوراء النّہر کو منور و درخشاں کر رہی تھیں۔ ابو بکر محمد بن زکریا رازی اور شیخ الرئیس ابن سینا اسی عہد کی یادگار ہیں۔

اسی عہد میں سلطان محمود غزنوی نے اپنی سلطنت کو مضبوط و مستحکم بنا کر ہندوستان میں عظیم الشان فتوحات حاصل کیں اور البیرونی اور فردوسی اس عہد کی یادگار ہیں۔

مغرب میں اندلس کے حالات برق رفتاری سے تبدیل ہو رہے تھے۔ ۳۶۶ھ میں خلیفہ الحکم بن عبدالرحمٰن الناصر کی وفات کے بعد سارا مغرب فتنہ و فساد کی نذر ہو گیا۔ وزیروں نے استبداد و ظلم کی راہ پسند کی۔ اندلس میں طوائف الملوکی نے پھر سر اٹھایا۔ شیرازہ سلطنت پارہ پارہ ہو گیا۔ بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستیں ظہور پذیر ہونے لگیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے فرمانروا و حکمران باہم دست و گریبان ہو کر ایک کے خلاف فرنگی طاقتوں کی پناہ تلاش کرنے لگے۔

معری کے زمانے میں مصر کی عنان سلطنت فاطمیوں کے ہاتھ میں تھی۔ فاطمی حکمران اپنی علم دوستی اور معارف نوازی میں بڑے مشہور تھے۔ جب انہیں استحکام نصیب ہوا تو وہ بغداد اور اندلس فتح کرنے کے منصوبے سوچنے لگے۔

یورپ بھی اس قسم کی سیاسی بے چینی اضطراب کا شکار تھا۔ خود ابو العلاء کا اپنا ملک یعنی شام بڑا پریشان حال تھا۔ جب ۳۹۴ھ میں دولت حمدانیہ کا خاتمہ ہوا تو دولت مرداسیہ نے اس کی جگہ لی۔ دولت مرداسیہ کے عہد میں سیاسی اور اجتماعی انتشار اور بڑھ گیا۔

ابو العلاء معری نے ان سیاسی و اجتماعی حالات کے درمیان تعلیم و تربیت پائی اور پروان چڑھا۔ ابوالعلاء معری کی شخصیت اور اس کے افکار و خیالات کو ڈھالنے میں اس کے ماحول کو بڑا دخل ہے۔ وہ بچپن میں بینائی جیسی نعمت غیر مترقبہ سے یکسر محروم ہو گیا اور قدرت نے اسے لاغر اور نحیف جسم عطا کیا۔ ماں باپ کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ تجرد کی زندگی نے عمر بھر رفیقۂ حیات سے محروم رکھا۔ مال و دولت کی ہمیشہ قلت رہی۔ ان تمام اسباب و عوامل نے ہمارے مفکر ادیب میں کلبیت اور معاشرے کے خلاف نفرت پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا دل رنج و قلق اور انتقامی جذبات سے معمور تھا۔

معری بڑا حساس اور ذہین تھا۔ قدرت نے ذہانت کے ساتھ قوت حافظہ کے عطیہ میں بڑی فراخدلی سے کام لیا تھا۔ شاید اس کی بصارت کی کمی اللہ تعالیٰ نے ذہن و حافظہ سے پوری کرنا چاہی۔ بہرحال سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ وہ عجوبۂ روزگار تھا۔ اسے زبان پر اس درجہ قدرت تھی کہ تاریخ میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

ابو العلاء معری کو تحلیل عقلی میں حیرت انگیز مہارت تھی۔ قوت حافظہ کے ساتھ اس میں نقد و جرح کی استعداد بھی بدرجہ غایت موجود تھی۔ وہ ہر چیز کے تاریک اور روشن پہلو کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا تھا۔

ادبی و علمی معاملات میں رندانہ جرأت کا مالک ہونے کے باوجود معری نے اپنے بعض خیالات کو اتنی مبہم اور مشکل زبان میں پیش کیا ہے کہ بعض لوگوں کو اس کے عقائد و خیالات پر بے دینی اور زندقہ کا شک ہونے لگا۔

وہ عام شاعروں کی سی خوشامد اور چاپلوسی سے قطعاً ناآشنا تھا۔ اس کی عزت نفس اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ اس نے کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ سخت تنگ دستی کی حالت میں بھی اس نے اپنی آن پر حرف نہیں آنے دیا۔ اس کی زندگی میں

بڑے کٹھن مقام آئے، لیکن اس کی گردن کبھی خم نہیں ہوئی۔

معری کی معلومات کا دائرہ وسیع تھا۔ علم لغت و ادب اور علم فقہ باقاعدہ استادوں سے پڑھا۔ علم کلام اور علوم عقلیہ کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس پر معری کو عبور حاصل نہ تھا۔ ہندی فلسفہ اور چینی فلسفہ کا بھی خوب مطالعہ کیا۔ غرضیکہ اسلامی و غیر اسلامی علوم میں شاید ہی کوئی علم ایسا ہو جس پر معری کو آگاہی حاصل نہ تھی۔ اس کی کتاب "لزومیات" سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نحو، ادب، تاریخ، ایام العرب، قرآن و حدیث، فقہ اور قدیم ترین قوموں کے حالات و اخبار پر چلتا پھرتا دائرۃ المعارف تھا۔

معری پہلا ادیب اور نقاد تھا، جس نے تنقید و تبصرہ میں تضحیک و استہزا اور ہزل و استخفاف کا پہلو بھی شامل کیا۔ اس میں یہ بڑی خوبی ہے کہ جہاں وہ حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کے لیے بڑی متانت اور سنجیدگی سے بحث کرتا ہے وہاں چند پھبتیوں اور ہنسی مذاق کی باتوں میں قارئین کو اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔

وہ نئے فکر و فلسفہ کا بانی ہے۔ اس نے اپنے عہد تک تمام اسلامی فلسفہ پر کڑی تنقید کی ہے۔

معری اجتماعی اور معاشرتی خامیوں اور کمزوریوں کو خوب پہچانتا ہے۔ اور ان کے علاج سے بھی واقف ہے، لیکن اس میں دوا سازی اور چارہ گری کی اہلیت مفقود ہے۔

ابو العلاء معری حریت پسند مفکر ہے۔ وہ پرواز فکر کو محض خیال آرائی تک محدود نہیں رکھنا چاہتا، بلکہ عقل کو انسان کی بہبودی اور بہتری کے لیے استعمال کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ بے فائدہ بحث و مناظرہ اور بے روح و بے کیف عبادت پر نتیجہ خیز اور کیف آور عبادات کو افضل قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تسبیح و تقدیس اچھا عمل ہے، لیکن زکوۃ کی ادائیگی اس سے بدرجہا بہتر ہے، کیونکہ اس میں اجتماعی مفاد ہے۔

اخلاق کے بارے میں معری کی رائے ایجابی اور مثالی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ نیکی بذات خود قابل قدر اور اچھی چیز ہے۔ دین کے معاملے میں وہ نیک اعمال، صحیح اعتقاد اور حسن معاملہ کو محض رسمی عبادات اور فقہی تنازعات پر ترجیح دیتا ہے۔

معری کے نزدیک عقل ہی ہر معاملے میں قابل اتباع ہے۔ عقل و خرد کی رہنمائی کے فقدان کو گمراہی سے تعبیر کرتا ہے۔

معری کو فقر و افلاس کی زندگی سے سخت نفرت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انسانیت مظلوم و مجبور اور مفلس و قلاش نظر آئے اور اسی جذبے کی تحت اس نے ازدواجی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی اولاد کو تکالیف و مصائب سے دوچار ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

اس کی جدت پسندی اس کی کتابوں کے ناموں سے بھی ظاہر ہے۔ مثلاً (۱) رسالۃ الغفران' (۲) لزومیات' (۳) سقط الزند وغیرہ۔ اسی طرح اس کے اسلوب نگارش اور انداز بیان کے ساتھ اس کی تشبیہات بھی جدید ہیں۔ رسالۃ الغفراْن میں جنت اور دوزخ کی سیر اور شاعروں اور بزرگان دین سے ملاقات کا ذکر ہے۔ اپنی طرز کا یہ پہلا عنوان اور موضوع تھا۔ تین صدیوں کے بعد اسی تصور کو اطالوی شاعر دانتے نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "ملھمات الٰہیہ" میں پیش کیا۔ اسی طرح برطانوی شاعر ملٹن نے بھی چھ صدیواں کے بعد وہی خیالات اور موضوع "فردوس مفقود" میں دہرایا۔

اس کی شاعری میں پختگی کے ساتھ مشکل پسندی بھی موجود ہے۔ البتہ ابتدائی شاعری نسبتاً خام ہے۔ معری نے اپنے فلسفیانہ خیالات اور حکیمانہ افکار کا اظہار زیادہ تر لظم میں کیا ہے اور چونکہ عوام اور بالخصوص کم مایہ لوگوں سے بچنا مقصود تھا' اس لیے غیر مانوس الفاظ اور مشکل ترکیبوں میں پناہ لی۔ اس سے معری کا کلام اور بھی مبہم ہو گیا۔ اس کے اشعار تصوفانہ انداز میں باطن کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ شاعر کے مقصود و مفہوم تک پہنچنے کے لیے ظاہری الفاظ کافی نہیں' بلکہ باطنی معنوں تک رسائی ضروری ہے۔

شاعری کے لیے نئے موضوع اور عنوان تلاش کرنے کا سہرا ابو العلاء معری کے سر ہے۔ اس نے اجتماعی مسائل اور اخلاقیات و سیاسیات کو موضوع سخن بنایا۔ متین و سنجیدہ عنوانوں کے ساتھ غزل گوئی کا دامن بھی نہیں چھوڑا۔ معری کی شاعری میں ایک جدید پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے جانوروں اور حیوانات کے درمیان مکالمے اور مناظرے لکھے' مثلاً

مرغ اور فاختہ کا مکالمہ' اور "بھیڑیے اور بکری کا مناظرہ" وغیرہ۔ اس کی شاعری میں یہ چیز بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس نے شراب' عشق و محبت اور ہجوگوئی سے اجتناب کیا ہے۔

مختصر یہ کہ ابو العلاء معری نے اسلامی فکر و ادب میں ایک نئے باب کا آغاز کر کے ایک طرف تو مشرق و مغرب کے فکر و شعر کے لیے نئی راہیں کھول دیں اور دوسری طرف اپنے لیے عالمی فکر و شعر میں بہت بلند مقام پیدا کر لیا۔

○○○

مشرق وسطیٰ کی علمی، لسانی، سیاسی اور فکری تاریخ

مشرقِ اوسط

ہماری صحافت میں "مشرق اوسط" کو مشرق وسطی کا نام دیا گیا ہے' حالانکہ ہم مشرق قریب ادنی اور مشرق بعید یا "شرق اقصے" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ قریب' بعید' ادنی اور اقصی مذکر ہیں' لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وُسطیٰ جو مؤنث ہے ہمارے ادیبوں اور صحافیوں کے ہاں قبول و رواج پا گیا۔ حالانکہ بہت کم لوگ "وسطیٰ" کے صحیح تلفظ کو ادا کر پاتے ہیں اکثر لوگ وُسطیٰ اور وسطی پڑھتے ہیں اور بہت کم وسطیٰ کہتے ہیں۔ کبھی کسی نے یہ نہیں سوچا کہ آخر "مشرق اوسط" جیسی صحیح اور آسان ترکیب چھوڑ کر ہم مشرق وُسطیٰ جیسا مشکل لفظ کیوں استعمال کریں۔ خیر یہ تو رواج پا جانے کی بات تھی' لیکن اب میرا خیال ہے کہ مشرق اوسط زیادہ موزوں ہونے کے علاوہ عام فہم اور سہل بھی ہے۔

۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء کی پہلی جنگ عظیم میں مغربی استعمار نے ترکی اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے لیے مشرق قریب کا لفظ استعمال کرنا شروع کیا۔ یہ اصطلاح اپنی نوعیت کی پہلی اصطلاح نہیں ہے۔ اس کی اولیت کا شرف مسلمان عربوں کو حاصل ہوا۔ تاریخ اسلام کا طالب علم "مغرب اقصیٰ" وغیرہ اصطلاحات سے بخوبی واقف ہے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد عسکری' سیاسی و اقتصادی ضروریات کے پیش نظر مشرق اوسط اور مشرق بعید کی اصطلاحات مروج ہوئیں' لیکن یہ اصطلاحات بڑی مبہم اور غیر معین تھیں۔ بیس بائیس سال تک ان علاقوں کی حدود قائم کرنے میں بڑا اختلاف رہا۔ بہرحال کئی تبدیلیوں کے بعد دوسری جنگ عظیم کے شروع' یعنی ۱۹۳۹ء' تک مشرق قریب کا اطلاق عام طور پر بلقان' ترکی' فلسطین' لبنان' شرق اردن' جزیرہ قبرص اور مغربی شام پر ہوتا رہا۔ مشرق اوسط میں ایران' عرب دجلہ و فرات کے ساحلی علاقے اور کبھی کبھار ہندو پاکستان اور افغانستان بھی شامل کر لئے جاتے تھے اور مشرق بعید کے مفہوم میں چین' جاپان اور بعض اوقات ہند چینی اور انڈونیشیا

بھی شامل تھے۔ چونکہ اصطلاحات کا وجود مغربی استعمال کا مرہون منت تھا' اس لیے ہمارے جغرافیہ دانوں کو ان علاقوں کی حدود متعین کرنے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا اور یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے فاضل جغرافیہ دانوں میں ایک عرصے تک یہ چیز پریشانی اور نزاع کا باعث بنی رہی۔ انگلستان کی شاہی جغرافیائی مجلس نے مشرق قریب میں مصر کو بھی شامل کرلیا اور مشرق اوسط میں عراق کو بھی' مگر امریکہ کے ایک مشہور جغرافیہ دان نے مصر کو مشرق اوسط میں شامل کرنے سے انکار کردیا۔

جب ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو مشرق اوسط کا مفہوم قطعی طور پر طے پاگیا۔ اس طرح جو چیز جغرافیہ دان حل نہ کرسکے وہ سیاست دانوں نے بیک جنبش قلم حل کردی۔ ان حدود کا تعین اس لئے ضروری تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں نے مشرق اوسط کو عسکری ضروریات بہم پہنچانے کا مرکز قرار دیا اور اس مقصد کے پیش نظر ان ملکوں میں سیاسی اور اقتصادی زندگی کو از سرنو تشکیل و ترتیب دینا جنگی مقاصد کے لئے ازحد ضروری تھا۔ اس وقت مشرق اوسط کے شروع میں تو قابض انگلستان کی اجارہ داری تھی' لیکن بعدازاں اس "کارخیر" میں امریکہ کو بھی شامل کرلیا گیا۔

برطانیہ کی سرکاری اور فوجی یاداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اب مشرق اوسط میں اکیس ممالک شامل ہیں جن میں مالٹا' طرابلس غرب' برقہ' مصر' قبرص' لبنان' شام' فلسطین' شرق اردن' ایران' خلیج فارس کی ریاستیں' سعودی عرب' یمن' عدن' حبشہ اور سوڈان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ سرکاری کاغذات میں عارضی طور پر ترکی کو سیاسی وجوہات کی بنا پر مشرق اوسط میں شامل نہیں کیا گیا' لیکن ہمارے جغرافیہ دانوں کا اصرار ہے کہ ترکی جغرافیائی اور ثقافتی اعتبار سے مشرق اوسط میں ضرور شامل ہے۔ بعض جغرافیہ دانوں کو مالٹا اور سوڈان کو مشرق اوسط میں شامل کرنے پر بھی اعتراض ہے۔

مشرق اوسط کے ممالک میں زندگی کی بہت سی قدریں مشترک ہیں' مذہب' زبان معاشرت اور اقتصادیات کے اعتبار سے ایک طرح کی یگانگت اور مناسبت موجود ہے۔ مشرق اوسط دنیا کے بڑے بڑے مذہب کا مولد و سرچشمہ رہا ہے۔ یہودیت' عیسائیت اور

اسلام اسی سرزمین میں دنیا کے سامنے پیش کیے گئے اور یہیں ان مذاہب کی تبلیغ و اشاعت اور خصوصیات کی ابتدا ہوئی۔ قدیم علمی و ادبی زبانوں کے مرکز بھی مشرق اوسط میں پائے جاتے ہیں۔ عربی' فارسی اور عبرانی زبانیں بھی مشرق اوسط سے ہی نکلیں اور اس کے علاوہ لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقے' شہری اور دیہاتی زندگی' مویشیوں کی پرورش اور گلہ بانی' زراعت' تجارت' صنعت و حرفت اور محنت و مزدوری کے ڈھنگ سب مشرق اوسط کی معنوی اور مادی یگانگت کی شہادت دیتے ہیں۔

اگرچہ مشرق اوسط کے بعض علاقے جغرافیائی حیثیت سے موجود ہیں' لیکن ان کے بارے میں بہت کم معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ ملک عرب میں ربع خالی' ایران کے صحرائے شور' عراق کے جنوب میں وسیع میدان میں دلدل اور اناطولیہ کے مرکزی اور جنوبی حصے اب تک جغرافیہ دانوں اور سیاحوں کی دسترس سے باہر خیال کیے جاتے ہیں' مغربی سیاحوں نے ربع خالی کے بارے میں گزشتہ ربع صدی میں البتہ کچھ معلومات ضرور مہیا کی ہیں۔ بایں ہمہ ہماری جغرافیائی معلومات تشنہ تکمیل ہیں۔

بین الاقوامی سیاحت نے مشرق اوسط کی اہمیت اور قدر و قیمت میں بہت اضافہ کردیا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک مشرق اوسط بڑے بڑے پس ماندہ علاقوں میں شمار ہوتا تھا۔ اور ان ممالک کا حکمران طبقہ بھی اپنی رعایا اور اپنے ملک سے بے نیازی اور بے اعتنائی برتتا تھا۔ نہر سویز نے مشرق و مغرب کو اس طرح ملایا کہ ایک طرف تو مرد بیمار تندرست و توانا ہو کر انگڑائیاں لینے لگا اور دوسری طرف عام بیداری اور آزادی کی لہر پیدا ہو گئی۔ وسائل آمد و رفت اور بالخصوص فضائی و ہوائی ذرائع رسد و رسائل کی ترقی سے مشرق اوسط کی اہمیت تو بہت ہی بڑھ گئی ہے۔ مشرق اوسط میں وسیع میدانی علاقوں کی فراوانی کی وجہ سے ہوائی جہاز کے بہترین مستقر (AIR PORTS) معرض وجود میں آئے آب و ہوا بہت عمدہ اور ہوائی جہاز کے اڑنے کے لیے بہت ممد و معاون ہے۔ یہ اس وقت مشرق اوسط کے علاقے' یعنی مصر' عراق' شام اور سعودی عرب دنیا بھر کی ہوائی قوت اور آمد و رفت میں بڑی سیاسی اہمیت اور مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم نے یہ ثابت

کر دیا کہ مشرق اوسط کی ہوائی شاہراہیں بین الاقوامی سیاست میں نہایت مفید اور کار آمد ہیں۔
مشرق اوسط میں قدرتی خزانوں کے وفور اور بہتات نے بھی اس کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ دنیا بھر میں تیل اور پٹرول کے سب سے بڑے ذخیرے مشرق اوسط میں پائے جاتے ہیں۔

یہ بات کتنی حیرت افزا ہے کہ وہ ممالک جہاں تیل نکلتا ہے، اتنے مفلس و قلاش ہوں کہ وہاں کے جمہور نان شبینہ کے محتاج نظر آئیں اور سردی کے موسم میں پھٹے پرانے، میلے کچیلے کپڑوں میں بسر کریں، لیکن تیل کے اجارہ دار ملک اپنے جمہور کو حریر و اطلس میں ملبوس کریں اور فاقہ کشی کے بجائے دن میں چار پانچ مرتبہ کام و دھن کی تواضع کریں۔ ایران، عراق اور عرب برطانیہ اور امریکہ کے لیے تو سونا اور چاندی پیدا کریں اور اپنی کوڑی کوڑی کے لیے بھیک مانگتے پھریں (مگر آجکل ان ممالک کے عام باشندوں اور جمہور کے حالات میں بھی بہتری پیدا ہوئی ہے۔ اسی لیے ان ممالک کے عوام بھی خوشحال نظر آتے ہیں (مرتب)۔

مشرق اوسط کی آبادی میں کافی تنوع ہے۔ یہاں مختلف نسلیں اور خاندان آباد ہیں سامی بھی ہیں اور حامی بھی۔ عربی، سامی، عراقی، مصری، تورانی، ایرانی، کردی وغیرہ تو بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ زبانوں کا بھی خاصا اختلاف ہے۔ ترکی، فارسی اور عربی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ مشرق اوسط میں یہودی بھی بستے ہیں اور عیسائی بھی، مگر بھاری اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ ویسے تو وطنیت بہت حد تک اتحاد اور وحدت کی ضامن ہے، لیکن یگانگت اور اتحاد کو پختہ تر کرنے والے عوامل میں عربی زبان، جو قرآن مجید اور پیغمبر علیہ السلام کی زبان ہے، بہت اہم ہے۔ وحدت زبان کے علاوہ وحدت جنس، وحدت دین، وحدت تاریخ اور وحدت ثقافت نمایاں طور پر جلوہ گر ہے۔

مشرق اوسط کی اجتماعی زندگی میں بھی شہری اور بدوی اختلاف موجود ہے۔ وسائل معاش کی کمی کی وجہ سے بدوی فطرتاً لوٹ کھسوٹ کا عادی ہے اور شہری اپنی تجارت اور کاروبار کی خاطر امن و سلامتی کا طالب و خواہشمند۔ بدوی طبعاً زراعت اور تجارت کو

حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے' مگر یہ حقیقت ہے کہ شہروں کا قیام اور ان کی ترقی کا انحصار تجارت پر ہے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ ملکوں کی حکومت اور انتظام سلطنت کا کاروبار بھی شہروں نے ہی چلایا ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ پہاڑی باشندوں میں عسکری ہنرمندی اور ولولہ اور انتظامی قابلیت نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے۔ (دور حاضر میں بدویت کے آثار بھی اب مٹتے نظر آتے ہیں۔ شہروں کی سہولتوں اور وسائل معیشت کی چمک دمک نے بدویوں کو شہروں اور تہذیب کے لہلہاتے گلستانوں کی طرف کھینچ لیا ہے۔ اس لیے اب قدیم بدویت خال خال ہی کہیں نظر آتی ہے' مرتب)

مشرق اوسط کے باشندے زمانے کے اثرات سے کس طرح بچ سکتے تھے۔ برطانوی اور امریکی استعمار نے لوگوں کے انداز فکر اور عادات و اخلاق میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا کردی ہے۔

عالمی سیاست میں مشرق اوسط کو اپنے جغرافیائی مقام اور تیل کے ذخیروں کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہونے کے باعث استعماری قوتوں میں رسہ کشی شروع ہو گئی' کبھی روس کی نگاہیں للچاتی ہیں تو کبھی برطانیہ اپنے حرص و آز کے دانت تیز کرتا ہے اور کبھی امریکہ اپنی ملکی مفاد اور سیاسی و اقتصادی وقار کی خاطر دونوں سے بازی جیت لے جانا چاہتا ہے۔ اس نے بیرونی سیاسی اور اقتصادی حالت کو خاصا مخدوش بنا رکھا ہے۔ یہ آئے دن کی سیاسی بے چینی' وزارتوں میں فوری تبدیلیاں' سیاسی رہنماؤں اور حکمرانوں کے قتل اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ مشرق اوسط کے جمہور سکون قلب اور جمعیت خاطر سے محروم ہو چکے ہیں' اگر استبدادی قوتوں کی باہمی کشمکش کا انداز بہت جلد نہ بدلا گیا تو خطرہ ہے کہ کہیں مشرق اوسط افتراق اور انتشار کی نذر نہ ہو جائے۔

○○○

عربی ادب پر ایک نظر

عربی ادب اپنی قدامت، وسعت، گہرائی اور اپنے ادیبوں کی رفعت و کثرت کے اعتبار سے دنیا کی زبانوں میں بلند مقام رکھتا ہے۔ شعری اور نثری ادب میں تنوع بھی ہے اور وفور بھی۔ اس میں ہر مزاج اور طبیعت کے انسان کے جذبات اور ذوق کی تسکین کا وافر سامان موجود ہے۔

عربی ادب اسلام سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن ظہور اسلام کے بعد جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر اقصائے عالم میں پھیل گیا۔ جہاں جہاں عرب مسلمان گئے اپنی زبان اور اپنا ادب ساتھ لے گئے، بلکہ غیر عربی خطوں اور علاقوں میں بھی عربی زبان نے ایسی ہردلعزیزی حاصل کر لی کہ وہ ان ملکوں کی قومی اور مادری زبان بن گئی۔ مثال کے طور پر مصر، شام، عراق، لیبیا، افریقہ، الجزائر، سسلی اور پھر اندلس کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کا عربی ادب بھی اہل نظر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔

عربی ادب کو ادوار کے اعتبار سے کئی اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے: زمانۂ قبل از اسلام کے ادب کو "جاہلی ادب" کہتے ہیں۔ ظہور اسلام کے بعد کے ادب کو "اسلامی ادب" کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر اسلامی عہد میں "عباسی دور کے ادب" کو الگ قسم قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح اندلسی ادیبوں کے اپنے ذوق اور مزاج کے پیش نظر "اندلسی ادب" بھی ایک مستقل قسم ٹھہرا۔ ۱۷۹۸ء کے بعد کے ادب کو "ادب جدید" کے نام سے موسوم کیا گیا۔

ظہور اسلام سے پہلے، یعنی جاہلی ادب میں نثر کی نسبت شعر و شاعری کے چرچے بہت زیادہ تھے۔ عربوں کا بچہ بچہ ذوق شعری کا حامل تھا۔ شعرا کی عربوں کے ہاں بڑی قدر و منزلت تھی۔ جاہلی دور میں قبائلی نظام زندگی تھا۔ ہر قبیلے کی مدافعت شاعر کرتا تھا۔ وہ

دشمنوں کو منہ توڑ جواب دیتا اور کوشش کرتا کہ دشمن قبائل کی ہجو اس انداز میں لکھے کہ ان کی عزت و شہرت خاک میں مل جائے۔ محاذ جنگ پر وہ اپنے بہادروں کو جوش دلا کر جانبازی کا سبق دیتا تھا۔ امن و سلامتی کے زمانے میں شاعر اپنے قبیلے کے کارناموں اور فضائل و محاسن کے گن گاتا اور اس طرح قبیلے کی تاریخ شعروں میں بیان کر دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی عربوں کے کسی قبیلے میں کوئی شاعر نمودار ہوتا یا ناموری پاتا تو قبیلے والے خوشی و مسرت کا اظہار کرتے۔ کھانے پینے کی دعوتوں کا اہتمام کیا جاتا اور بڑے جشن منائے جاتے تھے۔ عربوں کی جاہلی شاعری ان کی زندگی کی آئینہ داری اور ان کی عکاسی کرتی ہے' اسی لیے اس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ **الشعر دیوان العرب** ہے۔ یعنی عربی شاعری عربوں کی زندگی کا روزنامچہ ہے۔ اس میں ان کی تاریخ بھی ہے اور اجتماعی و معاشی زندگی کے احوال بھی۔ شاعر بیک وقت اپنے قبیلے کی عزت و آبرو کا محافظ و پاسبان بھی تھا' قبیلے کا خطیب بھی تھا اور میدان جنگ میں بہادر سپاہی بھیؔ

پھر جاہلی شاعری میں ہر صنف شعر موجود ہے' حماسۂ و شجاعت' فخر و مدح' غزل' ہجو' مرثیہ اور زہد و وصف' سب اصناف پائے جاتے ہیں۔ اخلاقیات اور فلسفہ حیات کی شاعری بھی ان کے ہاں بڑی قدر و منزلت رکھتی تھیؔ

زمانہ قبل از اسلام میں لکھنے پڑھنے کا بہت کم رواج تھا' یعنی نہ ہونے کے برابر۔ اس کے باوجود عربوں کی اس عہد کی شاعری کا خاصا حصہ محفوظ ہے اور آج عربی شاعری کو اس ذخیرہ پر ناز ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ علم عروض کے فقدان کے باوجود جاہلی شاعری بحور و عروض کے ترازو پر پورا اترتی ہے۔ اس میں موسیقیت اور غنائیت بدرجہ کمال موجود ہے۔ اس دور کے شعر عربی ادب کا بہترین سرمایہ تصور کیے جاتے ہیںؔ

جاہلی دور میں ادبی ذوق ملاحظہ ہو کہ شاعروں کے کلام کو پرکھنے اور ان کے حسن و قبح پر رائے قائم کرنے کے بڑے بڑے صائب الرائے لوگ محاکمہ کرتے تھے۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ اس مقصد کے لیے عکاظ کے میلے کے موقع پر شعرا اپنا اپنا کلام سناتے اور منصف حضرات سے رائے حاصل کی جاتی اور بہترین قصیدے کو سنہرے حروف میں لکھ

کر غلاف کعبہ کے ساتھ آویزاں کر دیا جاتا۔ ایسے قصائد کو معلقات کا نام دیا جاتا تھا۔ پھر یہ قصیدہ زبان زد خلائق ہو جاتا۔ ایسے نامور شعرا کی تعداد سات سے دس تک بتائی جاتی ہے۔ ان میں امرؤالقیس' طرفہ بن العبد' زہیر بن ابی سلمیٰ' لبید بن ربیعہ' عمرو بن کلثوم' عنترہ بن شداد' حارث بن حلزہ' نابغہ' الذبیانی' اعشیٰ اکبر اور عبید بن الابرص کے نام شامل ہیں۔

ان قصائد کا آغاز تشبیب (غزل) کے اشعار سے کیا جاتا تھا۔ شاعر اپنی محبوبہ کو کسی نہ کسی طور پر یاد کر کے اپنی محبت اور شوق کا ذکر کرتا اور قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔

ان شعرائے جاہلیت کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ شعرائے بادیہ میں ایک گروہ بے فکرے شعراء کا تھا' جنہیں "صعالیک" شعرا کہا جاتا تھا۔ یہ بڑے جفاکش مہم جو اور قبیلے کے خدمت گزار ہوتے تھے۔ ان میں تابط شر' الشنفریٰ' ازدی اور عروۃ بن الورد نمایاں ہیں۔ جاہلی شاعروں میں ایک گروہ ان سخنوروں کا بھی تھا جو گھوم پھر کر اور دربار داری کر کے مال و دولت جمع کر لیتے تھے۔ ان میں طرفہ' عبید' نابغہ اور اعشیٰ قابل ذکر ہیں۔ زہیر اور لبید اپنے حکیمانہ کلام کے لیے مشہور تھے۔

جاہلی عربی شاعری اپنے بے شمار محاسن' سادگی' منظر کشی اور نازک ترین احساسات کی ترجمانی کے لیے بھی خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔

○○○

جدید عربی شاعری

جب شاعر کسی مخالف یا کسی دشمن قبیلے کے معائب و نقائص بیان کرتا' ان کے نسب پر نکتہ چینی کرتا' ان کے خلاف شرم و عار کی باتیں کہتا' ان کی بدکرداریوں کو اجاگر کرتا' انہیں قلت تعداد اور فقدان عزت و شرافت کا طعنہ دیتا تو اس انداز شعر کو ہجاء یا ہجو گوئی کہتے ہیں۔ شخصی اور قومی زاویہ نگاہ سے فریق مخالف کو بدنام و رسوا کرنے کے لیے ہجاء بہت بڑا سیاسی حربہ تھا' قبائل و عوام کے علاوہ بڑے بڑے سردار اور سلاطین بھی ہجو گو شاعر سے ڈرتے تھے۔

اگر شاعر کسی سردار یا صاحب فضل و مال کی تعریف و توصیف کرتا' اس کے عدل و انصاف' بذل مال' عقل و دانش' عفت و عصمت اور حسن و جمال اور قدو قامت کی تعریف و توصیف کرتا تو اس صنف شاعری کو مدح کہتے ہیں۔ کبھی کبھار یہ مدح انعام و اکرام کے شکریہ میں بھی ہوتی تھی۔

عرب شاعر مرثیے بھی کہتے تھے۔ جب کوئی عزیز یا بہادر یا سردار بستر مرگ پر یا میدان جنگ میں مرجاتا تو اس کی موت پر اپنے جذبات کا اظہار شعروں میں کرتے۔

عرب صحرانشین اور بادیہ پیما تھے' ان کے ہاں پالتو جانوروں میں اونٹ' گھوڑے' خچر اور گدھے عام تھے۔ انہیں جنگلی جانوروں اور وحشی درندوں سے بھی سابقہ پڑتا تھا' ان کا ذوق شعری تیز رفتار اونٹ' ناقۂ سیار اور اسپ برق رفتار کے گن گانے کے علاوہ نیلے آسمان' پھیلے ہوئے ریگستان' ٹیلے اور پہاڑ' وادی اور چشمے وغیرہ سب محاسن و مناظر کی داد دیتا ہے۔ اس طرح ان کے ہاں وصفیہ شاعری کی بھی کچھ کمی نہیں۔

تلواروں کے سائے میں پلنے والا اور شیروں اور بھیڑیوں سے نہ ڈرنے والا عرب شاعر نازک اور لطیف جذبات سے بھی عاری نہ تھا' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ طبعی ذوق اور فطری رجحان عرب شاعروں میں غلو کی حد تک موجود تھا۔ عورت اس کے دل و دماغ پر

چھائی ہوئی تھی۔ وہ شاعر کے لیے مصدر الہام اور عروس شعر تھی۔ عرب شاعر عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر کرتا' ان کے سفر و اقامت کا تذکرہ کرتا' ان کے اجڑے دیار کا حال سناتا۔ اونٹوں کے بلبلانے' فاختہ کے چہچہانے' بجلی کی چمک' بادل کی کڑک' آگ کی روشنی اور باد نسیم کے جھونکے سے شاعر کے دل میں محبوبہ کی یاد تازہ ہو جاتی اور اس کا شوق محبت انگڑائیاں لینے لگتا۔ یہ بھوت شاعر کے دل و دماغ پر اس حد تک سوار ہو گیا کہ عربوں کے ہاں یہ دستور بن گیا کہ جب بھی کوئی قصیدہ کہا جاتا تو اس کے شروع میں غزلیہ اشعار کہنا لازمی قرار پا گیا۔ اس طرح نسیب یا تشبیب عربی قصائد کا **جزو لاینفک ٹھہرا۔** متنبی نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور کہا:

اذا کان مدح فالنسیب المقدم

اکل فصیح قال شعرا متیم

(یہ کیا بے ہودگی ہے کہ قصیدہ کے شروع میں غزل کے اشعار ضرور کہے جائیں۔ کیا ہر فصیح الکلام شاعر کے لیے لازمی ہے کہ اس پر عشق سوار ہو)۔

بعد میں آنے والے نقادان شعر نسیب کے بارے میں جتنی تاویلیں چاہیں کریں' لیکن یہ ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ عربی غزل حقیقی بھی ہوتی ہے اور خیالی بھی۔ اسی طرح عفیف بھی اور اباحی بھی؂

عرب شاعروں کے حکیمانہ اشعار کی بھی کچھ کمی نہیں۔ اپنی بدوی زندگی میں شاعر کی زندگی خوشگواری اور تلخی سے ہم کنار ہوتی تھی' اس نے سفر کی صعوبتیں' زندگی کے مصائب و آلام اور ذہنی کوفت اور جسمانی مشقت برداشت کرنے کے بعد سوچ و فکر کی راہیں تلاش کیں۔ زندگی کی تلخی اور رنگینی' موت و حیات کی کشمکش' فکر و نظر اور قلب و جگر کی داستان نے اسے عقل و دانش کی چوکھٹ پر لا کھڑا کیا۔ اب شاعر لمحات فکریہ میں کچھ شعر کہہ جاتا ہے جو فلسفہ حیات بیان کرتے ہیں؂

عربی شعر اپنے عروض اور قوافی کے اعتبار سے بھی خاصا دلچسپ ہے۔ عربی شعر کے ارتقا کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اولاً "سجع نے رواج پایا۔ دانشور اور حکمت

پیشہ لوگوں کا گروہ جنہیں کاھنین کہا جاتا تھا' ان کی حکیمانہ باتیں مسجع عبارت میں ہوتی تھیں۔ پہلے پہل عرب شاعر کے تصورات نے سجع سے ترقی کر کے رجز کا قالب اختیار کیا۔ رجز بحر میں اشعار کو ارجوزہ (ج: اراجیز) کہتے ہیں۔ ارجوزہ نسبتاً" آسان تھا۔ یعنی مستفعلن' مستفعلن' مستفعلن ارجوزہ کی ترقی یافتہ صورت قصیدہ کی شکل میں رونما ہوئی۔ اوزان و بحور کی پابندی شعری موسیقی کی ضامن تھی۔ عربی کلاسیکی شاعری کی نمایاں خصوصیت اوزان و بحور کی پابندی ہے۔

کلاسیکی شاعری کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بحر طویل ان کے ہاں سب سے زیادہ مقبول و مروج اور ہردلعزیز تھی۔ سب سے زیادہ قصائد اور اشعار بحر طویل میں ملتے ہیں' پھر قبولیت و رواج کے اعتبار سے کامل' وافر' بسیط ہے۔ امرؤ القیس کے ہاں متقارب بھی خاصی مقبول ہے' اب ذرا ایک طائرانہ نظر ان بحور پر بھی ڈال لی جائے تاکہ قارئین حضرات کو یہ اندازہ ہو سکے کہ شاعر کے انتخاب بحور میں کس قسم کا ذوق موسیقی کارفرما ہے:

مستفعلن' مستفعلن' مستفعلن (دو بار)

مستفعلن زحافات کے سبب' مفتعلن متعلن بھی بن جاتا ہے۔ مفعولن اور فعولن رجزیہ شعر عام طور پر فی البدیہہ کہے جاتے تھے۔

یا شبل ذات البصر الحدید
و من یری بالنظر البعید
کم لک بین الوحش من طرید
تسوقہ یوماً بلا قیود

کلاسیکی شعرا کے رجز کہنے والوں میں درید بن زید بن نہد' ابو النجم' عجاج اور رؤبہ زیادہ مشہور ہیں۔

طویل: فعولن مفاعلین فعولن مفاعیلن (دو بار)
فعول

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

بسقط اللوی بین الدخول فحومل

هما خطتا اما اسارٌ و منةٌ

و اما دم و ان القتل بالحر اجدر

کامل: متفاعلن' متفاعلن' متفاعلن (دو بار)

(مستفعلن' مفعولن وغیرہ)۔

خلت الدیار فسد تُ غیر مسود

و من الشقاء تفردی بالسود د

وافر: مفاعلتن' مفاعلتن' مفاعلتن (دو بار)

مفاعلین' فعولن۔

اقول لها و قد طارت شعاعًا

من الابطال و یحک لا تراعی

بسیط: مستفعلن فاعلن' مستفعلن فاعلن (دو بار)

(مفاعلن فعلن فعلن)

انا محیوک یا سلمی فحیینا

و ان سقیت کرام الناس فاسقینا

متقارب: فعولن' فعولن' فعولن' فعولن

ارقت لبرق بلیل اهل

یضئی سناه باعلیٰ الجبل

اتانی حدیث فکذبته

بامر تزعزع منه القلل

عربی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں الفاظ کے حسن و جمال کے ساتھ معانی کی وضاحت بھی موجود ہے۔ عربی شاعر نے مبالغہ کا بہت کم استعمال کیا ہے۔

ایسے انداز میں فکر اور اسلوب سے اجتناب کیا گیا ہے جس سے قاری یا سامع کے ذہن و فکر و کو کدو کاوش کی ضرورت ہو۔

جب اسلامی دور شروع ہوا تو شاعری میں تنوع پیدا ہونے لگا۔ عربی شاعری میں دینی رجحانات بکثرت نظر آنے لگے۔ شاعری میں نعت کی ابتدا ہوئی اور گروہ بندی نے ایک اہم جگہ حاصل کرلی' خارجی عقیدہ رکھنے والوں اور شیعان علیؓ کی شاعری اس سلسلے کی قابل ذکر مثال ہیں۔ پھر تصوف آ گیا ابو العتاھیہ کی قنوطیت' معری کا فلسفہ' مختصرا" یہ کہ بعد کی عربی شاعری میں بڑا تنوع پیدا ہو گیا۔

اب میں آپ کی خدمت میں عربی شاعری کے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔

فخرو حماسہ:

عمرو بن کلثوم فخرو حماسہ میں کہتا ہے:

بانا نورد الرایات بیضا"
و نصدرهن حمرا قدروینا
و ایام لنا غر طوالٌ
عصینا الملک فیها ان ندینا
متی ننقل الی قوم رحانا
یکونوا فی اللقاء لها طحینا
ورثنا المجد قد علمت معد
نطاعن دونهٗ حتی یبینا
لنا الدنیا و من اضحی علیها
و نبطش حین نبطش قادرینا
اذا ما الملک سام الناس خسفا
ابینا ان نقر الخسف فینا
اذا بلغ الفطام لنا صبی

تخر له الجبابر ساجدینا

الا لا یجهلن احد علینا

فنجهل فوق جهل الجاهلینا

(یہ کہ ہم (میدان جنگ میں) جھنڈے سفید لے کر اترتے ہیں اور جب ہم انہیں واپس لاتے ہیں تو وہ سیراب ہو کر سرخ ہو چکے ہوتے ہیں۔ ہماری تاریخ طویل اور روشن ہے۔ اگر بادشاہ کی مجلس میں بھی ہم حاضر ہوئے (یا بادشاہ نے ہم پر بخشش کرنا چاہی) تو ہم نے اس کی بھی حکم عدولی کی۔ ہماری طاقت و قوت کا حال یہ ہے کہ جب بھی ہم نے موت کی چکی کو کسی قوم کی طرف منتقل کیا تو وہ اس کے ساتھ مل کر آٹے کی طرح پس گئے۔ بنو معد جانتے ہیں کہ ہم معد کی بزرگی کے وارث ہیں اور ہم اس وقت تک اس کے لیے لڑتے ہیں جب تک وہ ہمارے لیے واضح نہ ہو جائے ——— تمام دنیا اور اس پر جو کچھ بھی ہے وہ ہمارا ہے۔ اور جب ہم کسی کو پکڑتے ہیں تو بڑی سختی اور قدرت سے پکڑتے ہیں۔ جب بادشاہ سب لوگوں کو ذلیل کرے ——— تو ہم ذلت کو قبول نہیں کرتے' جب ہمارا کوئی بچہ دودھ چھوڑنے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کے سامنے تمام جابر حکمران سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ خبردار' ہمارے بارے میں کوئی شخص نادانی نہ دکھائے' ورنہ ہم نادان کی نادانی سے بڑھ کر نادانی دکھائیں گے)۔

الفند الزمانی جنگ بسوس کے متعلق کہتا ہے:

مشینا مشیۃ اللیث

غدا و اللیث غضبان

بضرب فیه توهین

و تخضیع و اقران

و طعن کفم الزق

غذا و الزق ملآنُ

و بعض الحلم عند الجهل

للذلة اذعان

و فی الشر نجاة حین

لا ینجیک احسان

(ہم شیر کی چال جیسے چلے۔ جیسے کہ وہ غضبناک ہو کر حملہ کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ ایسی شمشیر زنی کے ساتھ جس میں دشمنوں کی توہین' ان کو جھکانا اور ان کو ذلیل کرنا تھا۔ ہمارے نیزوں کے زخم 'گڑھے کے منہ کی طرح ہوتے ہیں۔ جیسے کہ منہ تک بھرا ہوا گھڑا کھلنے کے بعد نظر آتا ہے۔ بعض اوقات نادانی کے وقت بردباری دکھانا ذلت قبول کرنے کی طرح ہے اور جب دوسرے سے حسن سلوک فائدہ نہ دے تو لڑائی ہی میں نجات ہے)۔

قیس بن ثعلبہ کا ایک نامعلوم شاعر کہتا ہے:

ان تبتدر غایۃ یوما لمکرمۃ

تلق السوابق منا والمصلینا

ولیس یھلک منا سید ابدا

الا افتلینا غلاما سیدا فینا

انا لنرخص یوم الروع انفسنا

ولو نسام بھا فی الامن اغلینا

انا الکماۃ تنحَوّان یصیبھم

حد الظباۃ وصلناھا بایدینا

(اگر کسی دن کسی عزت و آبرو والی شے کے حصول میں مقابلہ ہو تو تو ہماری قوم کے لوگوں کو پہلے اور دوسرے نمبر پر آنے والے دیکھے گا۔ ہمارا سردار جب بھی ہلاک ہوتا ہے تو ہم فوراً" ہی کسی لڑکے کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں۔ ہم لوگ لڑائی کے دن اپنی جانوں کو سستا کر دیتے ہیں اور اگر امن کے دنوں میں ان کی قیمت لگائی جائے تو ہم بڑے گراں قیمت ہیں' جب شہسوار لوگ تلوار کی دھار لگنے کے خطرے سے ادھر ادھر ہوتے (چھپتے

نظر آتے) ہیں تو ہم لوگ تلواروں کو ہاتھوں پر لیتے ہیں)۔

السمئوال بن عادیا (ایک یہودی سردار) کہتا ہے:

وما مات مناسید حتف انفہ

ولا طل مناحیث کان قتیل

تسیل علی حد الظبات نفوسنا

ولیست علی غیر الظبات تسیل

(ہمارا کوئی سردار خود کشی کر کے نہیں مرا اور نہ ہی ہمارے کسی مقتول کا خون ضائع ہوا ہے۔ ہم اپنی جانوں کو تلواروں کی دھار پر بہاتے ہیں۔ ہماری یہ جانیں تلواروں کی دھار کے سوا کسی اور چیز پر نہیں بہتیں)۔

(۲) مرثیہ نگاری

عبدۃ بن الطبیب: (ایک جاہلی شاعر) کہتا ہے:

علیک سلام اللہ قیس بن عاصم

و رحمتہ ماشاء ان یترحما

تحیۃ من غادرتہ غرض الردی

اذا زار عن شحط بلادک سلما

فما کان قیس ھلکہ ھلک واحد

ولکنہ بنیان قوم تھد ما

(اے قیس بن عاصم، تجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام اور رحمت ہو۔ جب تک وہ رحم کرنا چاہے، اس شخص کا سا سلام، جسے ہلاکت نے پچھاڑ دیا ہو۔ جب وہ دور سے تیرے علاقے میں آتا ہے۔ تو سلام کرتا ہے۔ (در حقیقت) قیس کا مرنا ایک شخص کا مرنا نہیں ہے بلکہ اس کی موت سے تو قوم کی بنیادیں ہی ڈھے گئی ہیں)۔

درید بن الصمہ (ایک نامور جاہلی شاعر اپنے بھائی کے مرثیے میں) کہتا ہے:

فجئت الیہ والرماح تنوشہ

کوقع الصیاصی فی النّسیج الممدد
و کنت کناۃ البو ربعت فاقبلت
الی جلد من مسک سقب مقدد
فطاعنت عنہ الخیل حتّٰی تنفست
و حتّٰی علانی حالک اللون اسودی
قتال امری اسّٰی اخاہ بنفسہ
و یعلم ان المرء غیر مخلد
فان یک عبداللہ خلی مکانہ
فما کان وقّافا" ولا طائش الید
کمیش الازار خارج نصف ساقہ
بعید من الآفات طلاع انجد
قلیل التشکی للمصیبات حافظ
من الیوم اعقاب الاحادیث فی غد
تراہ خمیص البطن والزاد حاضر
عتید و یغدو فی القمیص المقدد

(جب میں اس کے پاس آیا تو اس وقت نیزے اس کے جسم کو اس طرح چھید رہے تھے جیسے کہ جولاہے کا کوچ پھیلائے ہوئے تانے کو چھیدتا ہے۔ میری حالت اس وقت اس مادہ اونٹنی کی سی تھی، جس کا بچہ مرگیا ہو کہ وہ پہلے ڈری پھر وہ بھوسہ بھری ہوئی کھال کی طرف لپکی۔ جو سوراخ دار ہو چکی تھی۔ میں نے اس سے گھڑسواروں کو دور ہٹانے کے لیے نیزہ زنی کی تاآنکہ وہ دور ہٹ گئے اور تاآنکہ میرے اوپر سیاہ رنگ کا خون چڑھ گیا۔ میں ایسے شخص کی طرح لڑا جسے اس کے بھائی کی موت کا صدمہ پہنچا ہو اور یہ جانتا ہو کہ یہ دنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ پھر اگر عبداللہ نے اپنی جگہ خالی کر دی تو کوئی بات نہیں، اس لیے کہ وہ نہ تو (لڑائی کے وقت) رکنے والا تھا اور نہ ہی کنجوس تھا، وہ

چھوٹے ازار والا تھا جس کی نصف پنڈلی ازار سے باہر ہوتی تھی۔ آفات (عیوب) سے دور' بہت باخبر اور بہت سخی تھا۔ بہت کم شکوہ و شکایت کرنے والا' مصیبتوں پر ثابت قدم اور آئندہ آنے والے واقعات و حوادث سے پہلے سے باخبر رہنے والا تھا۔ تو اسے دبلے پیٹ والا دیکھتا' حالانکہ کھانا حاضر ہوتا تھا۔ وہ ہمہ وقت تیار رہنے والا اور پھٹی ہوئی قمیص میں چلنے پھرنے والا تھا)۔

خنسلہ (اپنے بھائی صخر کا مرثیہ لکھتے ہوئے) کہتی ہے:

اعینیَّ جودا ولا تجمدا

الا تبکیان لصخر الندی

الا تبکیان الجری ء الجمیل

الا تبکیان الفتی السیدا

طویل النجاد، رفیع العماد

ساد عشیرتہ امردًا

اذا القوم مدوا بایدیھم

الی المجد مد الیہ یدا

فنال الذی فوقَ ایدیھم

المجد' ثم مضٰی مصعدا

یکلفہ القوم ما عالھم

و ان کان اصغرھم مولدا

و ان ذکر المجد الفیتہ

تأَزر بالمجدَ ثم ارتدی

(اے میری دونوں آنکھو! بارش برساؤ' منجمد نہ ہو۔ کیا تم صخر جیسے سخی نوجوان پر نہ روؤ گی؟ کیا تم نہ روؤ گی جرءت مند' خوبصورت نوجوان اور اپنے قبیلے کے سردار پر؟ جو طویل القامت' اونچا لمبا نوجوان تھا۔ جس نے داڑھی مونچھ آنے سے پہلے قوم کی

سرداری کی۔ جب لوگ بزرگی کو پانے کے لیے اس کی طرف ایک ہاتھ دراز کرتے تو وہ دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھاتا تھا۔ پھر اس نے لوگوں کے ہاتھوں سے اوپر جاکر بزرگی کو پا لیا اور پھر اور اوپر چڑھتا چلا گیا۔ لوگ اسے ایسے ایسے کاموں کا ذمہ دار بناتے جن کا کرنا ان کے لیے گراں اور مشکل ہوتا۔ اگرچہ وہ عمر کے اعتبار سے ان سب میں کم عمر تھا۔ جب بزرگی کا ذکر کیا جاتا تو وہ اسے پاتا کہ اس نے پہلے بزرگی کو بطور ازار کے پہنا اور پھر پورے جسم پر اوڑھ لیا)۔

یہی شاعرہ ایک اور مرثیہ میں کہتی ہے:

و ان صخر لمقدام اذا رکبوا

و ان صخرا اذا جاعوا لعقار

جلد جمیل المحیا کامل ورع

وللحروب غداة الروع مسعار

حمال الویۃ هباط اودیۃ

شهاد اندیۃ للجیش جرار

(میرا بھائی صخر، جب لوگ سوار ہوتے تو وہ سب سے پیش پیش ہوتا اور جب لوگ بھوکے ہوتے تو وہ ان کا علاج کرنے والا ہوتا۔ مضبوط جسم، خوبصورت زندگی والا، کامل، پرہیزگار اور خطرے کی صبح وہ لڑائی بھڑکانے والا تھا۔ جھنڈے اٹھانے والا، میدانوں میں اترنے والا، مجالس میں حاضری دینے والا اور لشکروں کو ہانکنے والا تھا)۔

(۳) غزلیات:

بکر بن النطاح کہتا ہے:

بیضاء تسحب من قیام فرعها

و تغیب فیہ و هو وحف اسحم

فکانها فیہ نهار ساطع

و کانہ لیل علیها مظلم

(میری محبوبہ سفید رنگ ہے۔ اس کے بال زمین پر گھسٹتے ہیں اور وہ خود ان میں چھپ جاتی ہے۔ کیونکہ وہ گھنے اور سیاہ ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے' جیسے کہ ان (بالوں) میں سے دن طلوع ہو رہا ہو اور رات اس پر اندھیرا کیے ہوئے ہو)۔

نابغہ کہتا ہے:

بیضاء کالشمس و افت یوم اسعد ھا

و لم توذ اھلا ولم تفحش علی جار

والطیب یزداد طیبا ان یکون بھا

فی جید واضحۃ الخدین معطار

(میری محبوبہ سورج کی طرح سفید رنگت والی ہے۔ اس نے سعادت سے پورا پورا حصہ پایا ہے۔ اس نے کسی گھر کے فرد کو ستایا اور نہ کسی ہمسائے سے بدگوئی کی۔ اور خوشبو اس کی خوشبو میں اضافہ کرتی ہے جب کہ وہ گورے گالوں والی عطر آگیں محبوبہ کی گردن میں ہو)' یعنی

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں

آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

توبہ بن حمیر کہتا ہے:

ولو ان لیلیٰ الاخیلیۃ سلمت

علی و دونی تربۃ و صفائح

سلمت تسلیم البشاشۃ اوزقا

الیھا صدی من جانب القبر صائح

واغبط من لیلیٰ بمالا انالہ

الا کل ما قرت بہ العین صائح

(اگر میری محبوبہ لیلیٰ اخیلیہ مجھے اس وقت سلام کرے' جب میرے اور اس کے درمیان (قبر کی) مٹی اور پتھر حائل ہوں تو میں اسے مسکرا کر سلام کا جواب دوں گا۔ یا پھر

میری قبر سے ایک الو (یا ھامہ) اس کی جانب چیختا ہوا آئے گا اور مجھے لیلیٰ سے ان باتوں کی توقع ہے، جو نہیں پا سکتا۔ کیا ہر وہ بات جس سے آنکھ ٹھنڈی ہو وہ انسان کو مل جاتی ہے)۔

جدید نقطہ نظر:

ایک شاعر کہتا ہے:

تمتع بها ما ساعفتک ولا تکن
علیک شجا فی الحلق حین تبین
و ان حلفت لا ینقض النای عهدها
فلیس لمخضوب البنان یمین

(تو اس (اپنی محبوبہ) سے اتنا ہی فائدہ اٹھا جتنی وہ تجھے اجازت دے۔ اور وہ تجھ پر حلق کا زخم نہ بن جائے، جب وہ ظاہر ہو اور اگر وہ قسم کھائے تو دوری اس کی قسم کو نہ توڑے گی، مگر سبز رنگ بنیاد والے کی قسم کا کوئی اعتبار نہیں ہے)۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:

فیا رب ان اهلک ولم تروها متی
بلیلی امت لا قبر اعطش من قبری
و ان اک عن لیلی سلوت فانما
تسلیت عن یاس ولم اسل عن صبر
و ان اک عن لیلی غنی و تجلد
فرب غنی النفس قریب من الفقر

(اے میرے پروردگار اگر میری اسی حالت میں موت آگئی کہ میری کھوپڑی لیلیٰ سے سیراب نہ ہوئی، تو میں اس حالت میں مروں گا کہ میری قبر سے زیادہ کسی کی قبر پیاسی نہ ہوگی۔ اگر مجھے لیلیٰ سے صبر و سکون آگیا ہے تو یہ صبر و سکون اس کی ملاقات سے مایوسی کی بنا پر آیا ہے، ویسے نہیں اور اگر میں لیلیٰ سے بے نیاز اور سخت دل ہو گیا ہوں تو (اس کی وجہ یہ ہے کہ) بعض اوقات انسان کی ظاہری بے نیازی شدید قسم کی محتاجی کی عکاس ہوتی ہے☆)۔

○○○

☆ مقالے میں آنے والے اشعار کا ترجمہ از مرتب۔

جدید عربی ادب

مختلف قسم کے اثرات' یورپی اقوام سے میل جول' بہت سے مصری اور شامی طلبہ کا فرانس کی یونیورسٹیوں میں تعلیمی سفر اور مشن بجانب یورپ' رسائل اور اخبارات کا اجرا' بہت سے عرب خاندانوں کا یورپ میں مستقل قیام' شمالی اور جنوبی امریکہ میں شامی نوجوانوں کا جانا عربی ادب میں جدید رجحانات کے فروغ پذیر ہونے کا سبب بنا۔ ابتدائی دور میں نثر نگار حضرات زیادہ تر شامی تھے اور مغربی خیالات سے بے حد متاثر' مگر سائنس کے میدان میں مصر پیش پیش تھا اور ادب کی خدمت شام کے حصہ میں آئی۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں شامیوں نے مصر کا رخ کیا اور تمام ترقی پسند اور اثر و رسوخ رکھنے والے رسائل و اخبارات شامیوں کے ہاتھ میں آ گئے۔ اس ضمن میں اس دور کی دو شخصیتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں: مفتی محمد عبدہٗ اور جرجی زیدان (۱۸۶۱ء - ۱۹۱۴ء)۔ اگرچہ اول الذکر کا ان کی تصانیف میں کوئی خاص قابل ذکر شاہکار موجود نہیں' لیکن ان کا (تہذیبی اور ادبی) اثر مسلمانوں پر ناقابل انکار ہے۔

اس دور کی ادبی تاریخ میں جن جن گروہوں نے اہم کردار ادا کیا ان کا مختصر سا تذکرہ حسب ذیل ہے:

(۱) امریکی سکول

اس دبستان نے طرز نگارش اور انداز میں نمایاں تبدیلی پیدا کی۔ اس گروہ کے دو نمایاں لیڈر امین الریحانی (پیدائش ۱۸۷۷ء) اور جبران (۱۸۶۱ء - ۱۹۱۳ء) تھے۔ مؤخر الذکر نے نیویارک میں خاص سرگرمی کا اظہار کیا۔ وہ وہاں ایک علمی و ادبی مجلس الرابطۃ القلمیہ کا صدر تھا۔ اس مجلس نے ایک رسالہ بھی جاری کیا جس کا نام "الصباح" تھا۔

جس کا مدیر عبدالمسیح حداد تھا۔ اس گروہ کے بہت سے نمائندے مثلاً" میخائیل نعیمہ (پیدائش ۱۸۸۹ء)، نامور شاعر، نقاد اور ڈرامہ نویس رشید ایوب (پیدائش ۱۸۶۲ء) اور معروف شاعر الیاس ابو ماضی (پیدائش ۱۸۸۹ء) وغیرہ تھے۔ ان لوگوں نے عربی ادب میں نمایاں شہرت حاصل کی اور بیرونی عرب ممالک میں بہت نام پیدا کیا اور تیونس اور حجاز تک کے علاقوں میں اثر و رسوخ حاصل کیا۔

برازیل میں شامی امریکی سکول کی حیثیت بالکل مقامی، منفرد، درسی ادارے کی تھی، اسے مقامی اعتبار سے گو بہت اہم حیثیت حاصل تھی، لیکن اس کی بیرونی عرب ممالک میں کوئی قابل ذکر اہمیت نہ تھی۔ اس گروہ کو شعر و شاعری سے بڑی دل بستگی اور شغف تھا۔ اس گروہ کے نمائندے الیاس فرحات (پ ۱۸۹۱ء)، رشید سلیم خوری (۱۸۸۷ء)، فوزی المعلوف (۱۸۹۹ء۔ ۱۹۳۰ء) وغیرہ تھے۔

جنگ عظیم کے بعد امریکی سکول کا اقتدار کم ہونا شروع ہوا اور بتدریج گھٹتا گیا۔

(۲) مصری سکول

اب تمام التفات مصریوں کی جانب ہے۔ مصری سکول یا مصری متجلدین کے خیالات پر احمد لطفی سید کا (جس نے بعد میں ارسطو کی کتاب "اخلاق" کا ترجمہ کیا) بہت اثر پڑا۔ اس کے ساتھ "حزب الامہ) کے نام سے ایک جماعت تھی جس کا آرگن "الجریدہ" تھا۔ ۱۹۲۲ء میں محمد حسین ہیکل (پیدائش ۱۸۸۸ء) کے زیر ادارت اس پارٹی کا ایک نیا آرگن جاری ہوا جس کا نام "السیاسہ" تھا۔

(۳) شامی سکول

شامی امریکی سکول کو زیادہ تر شغف کلاسیکل عربی ادب سے تھا اور وہ ادبی تنقید اور تاریخ کے مطالعے میں خاص انہماک رکھتے تھے، لیکن مصری متجددین اور متنورین نے جدید ادب سے لگاؤ زیادہ رکھا اور زندگی اور ادب میں ایک خاص نسبت اور تعلق پیدا کرنے میں کوشاں رہے۔ مصریوں نے عربی قومیت کی جگہ مصری وطنیت کا خوشنما بت کھڑا کیا اور اس تخیل کو عام کرنے میں بڑی جدوجہد کی۔

○○○

جدید عربی شاعری

تمام عرب ممالک میں بے شمار عربی شعرا نظر آتے ہیں۔ جدید عہد کی ابتدا میں لوگوں کا رجحان قبل از اسلام کی شاعری کے تتبع کی طرف تھا۔ شام میں نصیف یازجی (۱۸۰۰۔ ۱۸۷۱ء) اس تحریک کا پیش رو ہے۔ الیاس فرانس مراش (۱۸۳۶۔ ۱۸۷۳ء) نے فلسفیانہ اور اجتماعی مسائل پر اظہار خیال کیا۔ مصر میں یہ تحریک بدیر جاری ہوئی۔ محمود سامی البارودی (۱۸۳۹۔ ۱۹۰۰ء) اور اسماعیل صابری (۱۸۵۴۔ ۱۹۲۳ء) نے اشعار میں عباسی اور قبل از اسلام شاعری کی پیروی کی ہے۔ اس کے بعد احمد شوقی (۱۸۶۸۔ ۱۹۳۲ء) ' حافظ ابراہیم (۱۸۷۱۔ ۱۹۳۲ء) اور خلیل مطران (پیدائش ۱۸۷۱ء) نے بھی مختلف رنگوں میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا' لیکن انداز و اسلوب وہی پرانا رہا۔ شوقی قادر الکلام شاعر تھا۔ زبان پر قدرت و عبور حاصل تھا۔ حافظ سیاسی اور اجتماعی مسائل پر قلم اٹھاتا تھا اور خلیل مطران (۱۸۷۱۔ ۱۹۴۹ء) اعتدال پسند شاعر تھا۔

عراق کے شعرا میں جمیل صدقی الزھاوی (م ۱۸۶۹ء) اور معروف الرصافی (۱۸۷۵ء) قابل ذکر ہیں۔ جمیل تو فلسفیانہ رجحانات کا مالک شاعر ہے اور اسلوب بیان اور انداز نگارش میں کسی کی تتبع کا قائل نہیں اور شعر مرسل یعنی بغیر قافیہ کے شعر کا خاصا شوق رکھتا ہے۔ معروف الرصافی قدیم ڈگر پر چلتا ہے اور اجتماعی مسائل پر خوب لکھتا ہے۔ سلیم حوخوری پر مصری اثرات زیادہ ہیں۔

(۲) جدید عربی شاعری کے دلچسپ پہلو

جدید عربی شاعری پر مختلف زاویوں سے بحث کی جا سکتی ہے' مثلاً:

۱۔ جدید عربی شاعری کا تاریخی پس منظر۔

۲۔ جدید عربی شاعری کا ارتقا۔

۳۔ جدید شعرا مختلف عربی ملکوں کے نمائندہ شعرا۔
۴۔ جدید شاعری کی چند خصوصیات' رومانیت' واقعیت اور رمزیت وغیرہ اور یہ تو حقیقت ہے کہ عربی شاعری میں خیالات میں صفائی وغیرہ' رجحانات اکثر مغربی اسلوب کے رہین منت ہیں۔

سیاسی' اجتماعی اور اقتصادی شکست خوردگی سے پناہ لینے کے لیے حسین و جمیل مناظر کی تلاش' دل کو غم و اندوہ سے نجات دلانے کے لیے فطرت کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک دمک' پرندوں کے رسیلے اور میٹھے گیت' بد نصیبی اور بد حالی پر قناعت قنوطیت کی طرف میلان کا باعث ہوتا ہے۔ خلیل مطران' امین نخلہ' نزار قبانی' خلیل شیوب' ابو القاسم الشابی اور عمر ریشہ مشہور شعرا ہیں۔ واقفیت پسند شعرا وطنی' اجتماعی اور انسانی گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں۔ شاعر عمل بہاد' زندگی اور تگ و دو کی دعوت دیتا ہے۔ رمزیت پسند شاعر اظہار خیال کے لیے صراحت کی جگہ تلمیحات استعمال کرتا ہے۔ اس مدرسۂ فکر میں حسن و جمال کی پرستش' تصوف' عقل و باطن کی آزمائش و تجربات اور ابہام و غموض کے لیے کثیف پردے ہوتے ہیں کہ ذہین ترین آدمی کے لیے بھی حقیقت تک پہنچنا دشوار ہوتا ہے۔ ان شعرا کے اکثر تجربات ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ان کی کیفیت خواب و بیداری کے درمیانی عالم کی ہے۔ یہ لوگ سیاسیات و اجتماعیات سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ عقل میثال بشمر' ایلیا ابو ماضی اور ابو شادی وغیرہ اس گروہ کے اہم نمائندہ ہیں۔

(۳) جدید عربی شاعری کا پس منظر

فرانسیسی فاتح نپولین نے ۱۷۹۸ء میں سرزمین مصر میں قدم رکھا تو مصر کی تاریخ ادبیات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا اور اسی عہد سے جدید عربی ادب کی ابتدا ہوئی۔ فرانسیسی اقتدار (۱۷۹۸۔ ۱۸۰۱ء) کے زیر اثر عربی صحافت معرض وجود میں آئی۔ عربی مطابع نے جنم لیا' علمی اور ادبی انجمنوں کی داغ بیل ڈالی گئی۔ لائبریریاں' مدارس اور جمہوری طرز کے دارالمطالعے کھولے گئے۔ کیمیائی معمل اور رصد گاہوں کا قیام عمل میں آیا۔

مختصر یہ کہ عربوں اور بالخصوص مصریوں کے جدید رجحانات فرانسیسی اختلال و اقتدار کے رہین منت ہیں اور یہی رجحانات جدید عربی ادب کی تخلیق و توسیع کا موجب ہوئے۔
۱۸۰۱ء میں فرانسیسی اقتدار ختم ہو گیا۔ محمد علی پاشا نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی جدید تعلیم کی طرف توجہ مبذول کی۔ طب جدید اور فنی تعلیم کے لیے درسگاہوں کی بنیاد رکھی گئی اور تعلیم یافتہ لوگوں کو سرکاری وظائف دے کر تکمیل تعلیم کے لیے فرانس بھیجا گیا اور ان فارغ التحصیل طلبا نے جدید علمی اور فنی کتابوں کے عربی تراجم کیے۔ اس طرح طب جدید اور دیگر فنی علوم سے عربی زبان کو مالا مال کر دیا گیا۔ مصری رہنماؤں نے یہ راز معلوم کر لیا تھا کہ ملک کی ترقی کا انحصار جدید تعلیم پر ہے۔ چنانچہ ملک کے گوشے گوشے میں نئی طرز کے مدارس کھول کر تعلیم کو عام کرنے کی طرح ڈال دی گئی۔

شام میں امیر بشیر الشہابی نے محمد علی پاشا کے نقش قدم پر چل کر شاہراہ ترقی کی طرف قدم اٹھایا اور امریکی مشنریوں اور یورپی پادریوں کی اعانت سے جدید تعلیم کے لیے مدارس کا افتتاح کیا۔ اس طرح شامیوں کو جدید اسلوب اور نئے افکار و علوم سے آشنا کرنے کی مہم شروع ہوئی۔

علمی و ادبی ماہناموں کا اجرا' غیر ملکی کتابوں کے تراجم' علمی و ادبی مجالس کے قیام' جدید مدارس کی کثرت' چھاپہ خانوں (مطابع) کا رواج' قدیم و جدید علمی کتابوں کی طباعت و اشاعت اور مغربی درسگاہوں کے فارغ التحصیل عرب طلبہ نے جدید عربی ادب کی تخلیق و ترویج میں نمایاں حصہ لیا۔

انیسویں صدی کی عربی شاعری در حقیقت قدیم شاعری کے احیا کی تاریخ ہے۔ جدید عرب شعرا نے بدلے ہوئے گرد و پیش میں متنبّی اور دیگر عباسی شعرا کی تقلید کی ٹھان لی۔ شام میں نصیف الیازجی (۱۸۷۱۔ ۱۸۰۰ء) جیسے قدامت پسند' مگر قادر الکلام اور بلند پایہ ادیب نے ادبی قیادت کی زمام ہاتھ میں لی۔ بعض جگہ مغربی اثر بڑا نمایاں نظر آتا ہے۔ بالخصوص فرانس مراش (۱۸۳۶۔ ۱۸۷۳ء) کے کلام میں۔ قنوطیت پسند مراش کی

شاعری حکیمانہ اور اجتماعی افکار کی حامل ہے' مگر خلیل مطران (۱۸۷۱۔ ۱۹۴۹ء) بڑا معتدل اور ہردلعزیز شاعر ہے۔

مصر میں قدیم شاعری کے احیا کی تحریک ذرا بعد میں شروع ہوئی۔ اس تحریک کے پیش رو محمود سامی پاشا البارودی (۱۸۳۹۔ ۱۹۰۴ء) اور اسماعیل صبری (۱۸۵۴۔ ۱۹۲۳ء) ہیں۔ بارودی کو مشاہیر شعرائے عرب کے بے شمار اشعار ازبر تھے' اس لیے قدرتی طور پر لغت و اسلوب کے لحاظ سے اس کا کلام جاہلی اور ابتدائی اسلامی عہد کے شعرا کی عکاسی کرتا ہے' لیکن اس کے باوجود زمانہ حاضر کے تقاضوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور اس وجہ سے بارودی کو عصر جدید کے شعرا کا پیش رو تسلیم کیا گیا ہے۔ اسماعیل صبری مغرب و مشرق کے ادب کا شناسا ہے' اس لیے اس کے اشعار میں دونوں کا حسن امتزاج موجود ہے۔ امیرالشعرا احمد شوقی (۱۸۶۸۔ ۱۹۳۲ء) اور شاعر نیل حافظ محمد ابراہیم (۱۸۷۱۔ ۱۹۳۲ء) اپنے پیش رو شعرا سے زیادہ مقبول عوام ہوئے۔ ان کے کلام میں جوش اور ولولہ کی فراوانی کے ساتھ عوام کے دلوں کی ترجمانی بھی موجود ہے۔ احمد شوقی نے اپنے آخری ایام میں عربی المیہ کی جانب توجہ مبذول کی اور حافظ ابراہیم نے اپنی شاعری کا رخ سیاسی اور اجتماعی مسائل کی طرف پھیرا۔ شوقی شاعر اسلام ہے۔ حافظ مصری اور عربی شاعر ہے۔ اس کے اشعار قومی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ قدیم اسلوب کے حامی ہیں' لیکن جدید افکار کی قلت نہیں۔

جدید ترین شاعروں میں مازنی' عقاد' شکری' صدیقی' محمد الاسمر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ مدرسۂ فکر عربی ادب کی روح کو خوب سمجھتا ہے اور عصر حاضر کے تمام ادبی تقاضوں کو بطریق احسن پورا کر رہا ہے۔ زبان کی پختگی' افکار کی بلندی' معلومات کی وسعت' مغربی اسالیب سے واقفیت اور ذوق شعری اور الفاظ کا صوری و معنوی جمال اس مدرسہ فکر کی امتیازی خصوصیت ہے۔

عراق کی شاعری بھی کئی خصوصیات کی حامل ہے۔ بغداد اور موصل جیسے شہروں میں قدیم روایات رائج ہیں۔ عراقی شعرا میں جمیل صدقی الزہاوی اور معروف الرصافی

(۱۸۷۵ء) بہت بلند پایہ شعرا ہیں۔ الزہاوی کے افکار حکیمانہ ہیں اور رسم و رواج کی زنجیروں سے آزاد۔ قافیوں اور بحروں کے بارے میں وہ بڑا جدت پسند واقع ہوا ہے۔ شعر مرسل کا حامی ہے۔ الرصافیؒ ویسے تو قدیم اسلوب کا حامی ہے' مگر افکار نئے ہیں۔ حریت افکار' آزادی وطن اور معاشرہ کی اصلاح ان شاعروں کے عام موضوع ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی کی سیاسی اور اقتصادی تحریکوں نے عربوں کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ کچھ لوگ یورپ کے مختلف ملکوں میں جا بسے اور اکثر شامی مہاجرین شمالی اور جنوبی امریکہ میں جا آباد ہوئے۔ ان نو آباد عربوں نے نئے ماحول میں پہنچ کر عربی زبان کو نئی جلا دی اور بدلے ہوئے ماحول کے تاثرات اور رجحانات سے عربی کو زینت دی۔ میخائیل نعیمہ اور ایلیا ابو ماضی اور الیاس ابو سبکتۃ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۴) خصوصیات

جدید شاعری کی چند خصوصیات قابل ذکر ہیں:

۱۔ اس عہد میں شاعر نے بچوں کے لیے اشعار کہے۔
۲۔ عہد حاضر کے عرب شاعروں نے اپنی شاعری میں چڑیا کو خاص جگہ دی۔
۳۔ وطن سے محبت اور قومی گیت لکھے گئے۔
۴۔ فلسفۂ حیات کو شاعری کا موضوع بنایا گیا۔
۵۔ نظم معری کو رواج دیا گیا۔

اس جدید دور کی روح اس جستجو اور تلاش میں تھی کہ ذہن و فکر کس شے کی حقیقت اور اس کے جوہر پر مرتکز ہو۔ نئے حالات میں ظاہری شکل و صورت کا کوئی زیادہ خیال نہ تھا۔ نثری اور شعری ادب میں معانی و مطالب مقصود بالذات تھے اور الفاظ محض اظہار حقیقت کا ذریعہ۔

اس نئے دور کا ادب قیود سے آزاد ہے۔ آج کا شاعر اور ادیب اپنے سامنے ایک خاص مقصد رکھتا ہے' خواہ وہ سیاسی ہو یا اجتماعی' تعلیمی ہو یا انقلابی' اخلاقی ہو یا اقتصادی۔

قدیم عربی شاعری میں قصیدہ کا ہر ایک بیت معانی کے اعتبار سے مستقل حیثیت رکھتا تھا، مگر اب قصیدہ ایک زنجیر کی طرح مربوط اور مسلسل ہوتا ہے، اس کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اس جدید اسلوب کی طرف ان لوگوں کا زیادہ رجحان ہے جو یورپ کی شاعری اور ادب سے واقف ہیں۔

اس جدید دور کے دو بڑے شاعر شوقی اور حافظ تھے۔ دونوں کے دل وطن اور دین کی محبت سے لبریز ہیں۔ دونوں کو کلام پر قدرت حاصل ہے۔ دونوں میں بلندی فکر موجود ہے، لیکن طرز بیان اور اسلوب میں قدرے اختلاف ہے۔ شوقی بھاری بھر کم الفاظ، پر شکوہ ترکیبوں اور ادق اسلوب کا شائق ہے۔ حافظ کے کلام میں سادگی اور سلاست اپنے کرشمے دکھاتی ہے۔ شوقی جب اور جہاں چاہتا شعر کہ لیتا، اس کی طبیعت ہمیشہ حاضر رہتی تھی۔ وہ عوام کا شاعر ہے اور عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں حافظ حکمت کا شاعر ہے۔ شور و شغب سے دور تنہائی میں شعر کہتا تھا۔ اس کے شعروں میں سنگتراشی کی محنت و محبت اور دلسوزی جلوہ گر ہے۔

ڈاکٹر منصور فہمی (پ ۱۸۸۶ء)

مصری انشا پردازوں میں ڈاکٹر منصور فہمی کا مقام بہت بلند ہے۔ جدید عربی ادب میں منصور فہمی کے مقالات بڑی نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح اس کی شخصیت عصر جدید کی آئینہ دار ہے اسی طرح اس کے مقالات بھی عصر حاضر کے جدید تقاضوں اور رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے ہاں طنز تو ہے، لیکن اس طنز میں رذالت و دناءت نہیں۔ اس کی تنقید میں اظہار حقیقت کے ساتھ ہلکی سی چبھن بھی ہے، لیکن مبالغہ اور توہین و تذلیل کا پہلو نہیں۔ تقریباً تمام معیاری رسائل میں اس کے مضامین شائع ہوتے رہے۔

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل (پ ۱۸۸۸ء)

قاہرہ میں قانون کا امتحان پاس کیا۔ پیرس یونیورسٹی سے سیاسیات پر ڈگری حاصل

کی۔ قاہرہ میں وکالت بھی کی۔ پہلا عربی ناول زینب لکھا۔ جس میں مصر کی دیہاتی زندگی کا نقشہ پیش کیا۔ ۱۹۱۱ء میں "فی اوقات الفراغہ" میں ہمعصر ادیبوں پر تنقید بھی کی۔

بلند پایہ قانون دان' صحافی' انشا پرداز اور نقاد ہونے کی وجہ سے اس کی تحریر میں وضاحت اور اختصار آگیا ہے۔ وہ ہر بات بڑی احتیاط اور ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے۔ اس کے اسلوب میں جاذبیت اور انفرادیت موجود ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کم از کم نثر میں جو کچھ کہا جائے وہ بڑا غیر مبہم اور واضح ہونا چاہیئے۔ ہیکل کا کہنا ہے کہ مشرق کی زندگی روحانیت میں مضمر ہے۔ ہماری تمام ثقافتی اور تمدنی سرگرمیوں کا انحصار روحانی بیداری پر ہے۔ اس کے نزدیک مذہب ہی انسانی تسکین اور قلبی سکون کا سرچشمہ ہے۔ بقول ہیکل ہمارے انحطاط کی وجہ دینی رہنماؤں میں قلت اخلاص اور کثرت خود غرضی ہے۔

جبران خلیل جبران

وہ بیک وقت شاعر' ادیب اور مصور ہے۔ اس کا اسلوب عربی بائبل کا رہین منت نظر آتا ہے۔ انجیلوں کی زبان میں لکھتا ہے۔ مضامین و خیالات میں تصوف کا رنگ غالب ہے اور اسی وجہ سے استعارہ' تشبیہ اور کنایہ بہت استعمال کرتا ہے۔ کبھی کبھار تو ابہام کا یہ حال ہے کہ اتنا صوفیانہ اور مجذوبانہ اسلوب اختیار کرتا ہے کہ قارئین کے پلے کچھ بھی نہیں پڑتا۔ اس کی نگارشات میں عیسائی تصورات کا پہلو نمایاں ہے۔ جبران اپنی ادبی تخلیقات کی وضاحت کے لیے تصویر کشی کرتا ہے اور بسا اوقات اس کی تصویریں اور لکیریں الفاظ سے زیادہ مبہم رہتی ہیں (**عرا س المروج' الا جنۃ لمتکسرہ و دمعۃ فی عالم الادب' فی عالم الرویا**) اس کی معروف تصانیف ہیں۔

ماری زیادہ المعروف بہ می (۱۸۹۵ تا ۱۹۴۱ء)

بڑی پڑھی لکھی اور فضیلت مآب خاتون تھی۔ انگریزی' جرمن' فرنسیسی' لاطینی' جدید یونانی اور ہسپانوی زبانوں کی ماہر تھی۔ بڑے بڑے ادیبوں' شاعروں اور انشا پردازوں

کے تلمذ کا شرف رکھتی تھی۔ ذہانت کی وجہ سے "الآنسہ النابغہ" مشہور ہے۔ نظم معری خوب کہتی ہے اور مخالفین اور قدامت پسند طبقہ بھی سر دھنتا ہے۔ تنقید نگاری میں اس کا اسلوب بیان سب سراہتے ہیں۔ زبان میں اتنی چاشنی ہے کہ تھرڈ کلاس کہانی یا ناول بھی عربی میں ترجمہ کر دے تو قاری ختم کیے بغیر دم نہ لے۔ قدیم و جدید دونوں طبقوں میں مقبول ہے۔ نثر میں "بین الجزر والمد" "غایۃ الحیات" "الکلمات والاشارات" "الحب فی العذاب" (ناول) اور نظم میں "سوانح فتاۃ" پڑھنے کے لائق ہیں۔

سلامہ موسیٰ (پ ۱۸۸۸ء)

عربی ادیبوں میں ایک نرالی شان کا مالک ہے۔ جب سلامہ موسیٰ لندن یونیورسٹی میں قانون اور اقتصادیات کی تحصیل کر رہا تھا تو وہاں اسے ۱۹۰۸ء میں برنارڈ شا کے لیکچر سننے کا موقع ملا۔ پھر پیرس میں فرانسیسی ادب کا مطالعہ بھی کیا۔ بعد ازاں روسی ادب میں دل لگا لیا اور کئی ایک روسی ناولوں اور کہانیوں کا عربی میں ترجمہ بھی کر ڈالا۔ الہلال میں ٹالسٹائی' گورکی اور دوسرے روسی ادیبوں پر خوب مقالات لکھے۔

سلامہ موسیٰ زبان کی سادگی اور سلاست کا بڑا قائل ہے۔ لفظوں کا بانکپن اور ترکیبوں کا شان و شکوہ اسے ایک نظر نہیں بھاتا۔ مشرق کو قطعاً پسند نہیں کرتا اور مغرب کی ہر شے کا دلدادہ ہے۔ ادب اور زندگی کی اقدار کے تعین میں برنارڈ شا کا پیرو ہے۔ زبان کے معاملے میں اس کا کہنا ہے کہ جدید مسائل اور نئی تہذیب اور نئے افکار کے لیے قدیم بدوی زبان استعمال نہیں کرنی چاہیئے' بلکہ روزمرہ کی بازاروں میں بولی جانے والی زبان استعمال کرنی چاہیئے۔ وہ ماضی سے بالکل بیگانہ ہو کر حال و مستقبل میں رہنا چاہتا ہے۔ ادب کے بارے میں اس کا نظریہ یہ ہے کہ عوام کی تعلیم کی رہنمائی' کائنات کے حقائق کا انکشاف' ان حقائق سے لطف اندوزی اور ان میں سکون کی تلاش و تخلیق ادب کا مقصد ہے۔ یہ مقصد مسلسل مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ادیب کو چاہیئے کہ عوام کی زبان میں لکھے اور فصحا و بلغا کی اسالیب کو خیرباد کہہ دے۔ احلام الفلاسفہ' الیوم والغد'

حریۃ الفکر وغیرہ اس کی تصانیف قابل مطالعہ ہیں۔

عقاد: (پ ۱۸۸۹ء)

عباس محمود العقاد (پیدائش ۱۸۸۹ء) شاعر بھی ہے اور ادیب بھی۔ ہر موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اور بڑی عمدگی سے نباہتا ہے۔ صف اول کا نقاد ہے۔ بے لاگ نقد و تبصرہ کرتا ہے اور بڑے بڑے ادیبوں کی پگڑی اچھلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عقاد کا اسلوب بڑا پیارا اور دلکش ہے۔ بقول مدیر المقتطف عقاد کے اشعار میں قدما کی متانت، پختگی اور جدید ادیبوں کی سلاست جمع ہو گئی ہے۔

عقاد اپنے دیوان کے دیباچہ میں اعتراف کرتا ہے کہ اس کے دیوان میں عقل و خرد کے ساتھ حماقت و بیوقوفی، امید و رجا کے ساتھ یاس و قنوط اور محبت و الفت کے ساتھ نفرت و حقارت کے جذبات وغیرہ سب موجود ہیں۔ عقاد کا دعویٰ ہے کہ اس کا دیوان اس کی اپنی زندگی کا آئینہ اور اس کے ذاتی تجربات و احساسات کا مرقع ہے۔

ایک نقاد کی حیثیت میں عقاد کا کہنا ہے کہ یہ درست ہے کہ ہم ایک شاعر سے سائنس کی تحقیقات اور معلومات کا نہ تقاضا کر سکتے ہیں اور نہ ایک مؤرخ سے تاریخی واقفیت و حد بندی کی امید رکھ سکتے ہیں۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ ایک شاعر و محقق صداقتوں کو جھٹلانا شروع کر دے اور ہمیں یہ بتانے لگے کہ پانچ اور پانچ آٹھ ہوتے ہیں اور دو اور دو سات۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شوقی، منفلوطی اور جبران سے اونچے درجے کے ادیب اور شاعر بھی اس کی تنقید سے نہیں بچ سکے۔ **مراجعات فی الادب والفنون، ساعات بین الکتب، الفصول، مطالعات** اس کی اہم کتب ہیں۔

دوسرے ادیبوں میں: خلیل مطران لبنانی (م: ۱۹۴۹ء)، شاعر و ادیب عائشہ عبدالرحمن المعروف بہ بنت الشاطی، آنسہ دنافیر اور آنسہ عبدالفتاح طوقان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ایلیا ابو ماضی

ایلیا ابو ماضی لبنان میں ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوا۔ گیارہ برس کی عمر میں مصر پہنچا' دس سال تک وہاں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ ۱۹۱۱ء میں امریکہ جابسا۔ پہلے تو صحافت کو بطور پیشہ اپنایا اور "مراۃ الغرب" کے ادارہ تحریر سے وابستہ رہا' لیکن تھوڑے عرصے کے بعد صحافت کو خیرباد کہہ کر تجارت شروع کر دی۔ پھر ۱۹۲۹ء میں دوبارہ میدان صحافت میں کود پڑا اور نیویارک سے مجلّہ "السمیر" جاری کیا۔

اگرچہ ایلیا ابو ماضی امریکی مکتب فکر کا شاعر ہے' لیکن اس کا اسلوب تمام شامی و امریکی شاعروں کے لحاظ سے بہترین ہے۔ اس کی زبان خالص عربی ہے۔ جس کی یہی وجہ ہے کہ اسے مسلسل دس سال تک مصر میں قیام کا موقع میسر آیا۔ اس کے اشعار سلیس اور اس کی زبان شیریں ہے۔ اسلوب' موضوع اور اوزان میں اعتدال پسندی نمایاں ہے۔ اس کا کلام کئی مجموعوں میں شائع ہو چکا ہے' جن میں سے الخصائل' جلد اول' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

میخائل نعیمہ

لبنان کا عیسائی ادیب شاعر میخائیل نعیمہ ۱۸۸۹ء میں بسکنتا میں پیدا ہوا۔ بچپن روسی مدارس کی گود میں گزرا۔ لڑکپن میں روس جا کر تعلیم حاصل کرتا رہا۔ جوانی روسی ادب کی سرپرستی میں گزری۔ ۱۹۱۲۔۱۹۱۶ میں واشنگٹن یونیورسٹی میں قانون کی تحصیل کی۔ جبران اور الریحان کے بعد امریکی مکتب فکر کا بڑا ہردلعزیز ادیب اور شاعر سمجھا جاتا ہے۔

اس کا قول ہے کہ ادب تو ادیب اور قاری کے درمیان ایک پیغامبر ہے۔ وہی شخص حقیقی معنوں میں ادیب ہے جو اپنا دل کھول کر قارئین کے سامنے رکھ دے۔

اس کے خیال میں نقاد ایک محقق رہنما ہے جو قارئین کے لیے حسن اور قبیح' اچھے اور برے' صحت مند اور بیمار ادب میں تمیز کر دے۔

میخائیل نعیمہ کے نزدیک نقاد کے لیے ضروری نہیں کہ وہ خود بھی شاعر، ادیب یا مصور ہو۔

وہ اس بات کا بھی حامی ہے کہ ڈرامہ عوام کی زبان میں لکھا جائے، لیکن علمی و ادبی معیار اور زبان کو زندہ رکھنے کے لیے تعلیم یافتہ کرداروں کو ادبی زبان میں گفتگو کرنا چاہیئے۔

میخائل نعیمہ کا دیوان همس الجنون بالخصوص قابل ذکر ہے اور نثر میں "الغربال" اور "الاباء والبنون"

جدید عربی شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عربوں کو اقدار حیات اور انسانی حقوق کے تصور سے آگاہ کیا۔ فکر و ذہن کی آزادی بخشی، جدید تعلیم کی ضرورت و اہمیت بتائی۔ نئی تہذیب سے روشناس کیا۔ غلامی کے خلاف نفرت و حقارت کے بے پناہ جذبات پیدا کیے، آزادی وطن کے جذبے سے سرشار کیا، جذبہ خودی کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا، نئے موضوع اور نئے خیال سے آشنا کیا۔

میخائل نعیمیہ نے قومی گیتوں اور وطنی ترانوں سے عربی ادب کو مالا مال کر دیا اور زبان کی سلاست وحلاوت، افکار کی جدت اور خیال و مقصد کی وضاحت اور بیان کی صراحت سے عربی شاعری کو چار چاند لگا دیئے۔

جمیل صدقی الزهاوی

عصر جدید میں عراق کا سب سے بڑا شاعر جو بغداد میں پیدا ہوا (۱۸ جون ۱۸۶۳ء۔ وفات فروری ۱۹۳۶ء)۔ باپ محمد فیضی الزهاوی کرد نسل سے تھا اور بغداد کا مفتی تھا۔ شجرۂ نسب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے ملایا جاتا ہے۔ اس کا دادا فارس کے قصبہ زھاوی میں کچھ عرصہ کے لیے مقیم رہا۔ پھر اسی نسبت سے الزهاوی مشہور ہوا۔ ابتدائی اسلامی علوم کی تحصیل اپنے والد سے کی۔ عربی، فارسی، ترکی اور کردی زبانوں پر بہت کچھ مطالعہ کیا، لیکن یورپی زبانوں سے بالکل واقفیت نہ تھی۔

شروع میں مختلف عہدوں پر متمکن رہا، لیکن آزادی رائے اور حریت فکر کے

باعث زندقہ کا الزام لگ چکا تھا جس کی بنا پر بڑا مرتبہ حاصل نہ کر سکا۔

صحت بھی چنداں اچھی نہ رہتی تھی۔ مختلف امراض کا شکار ہوتا رہا اور آخر کار ۵۵ سال کی عمر میں پاؤں سے لنگڑا ہو گیا۔

عہد شباب میں بغداد کے تعلیمی بورڈ (Board of Education) کا رکن منتخب ہوا' بعد ازاں حکومت کے محکمہ طباعت (State Printing Office) کا ڈائریکٹر مقرر ہو گیا۔ الزوراء کا ایڈیٹر بھی رہا اور کورٹ آف اپیل کے ممبر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

۱۸۷۶ء میں استانبول سے دعوت آئی جہاں "نوجوان پارٹی" سے اچھے تعلقات پیدا ہو گئے اور ترکی مشن کے ساتھ یمن بھیجا گیا۔ ترکی جاتے ہوئے راستہ میں مصر میں بھی قیام کیا اور وہاں علمی اور ادبی حلقوں سے تعارف حاصل کیا۔

نوجوان پارٹی کے انقلاب کے بعد دوبارہ استانبول بلایا گیا۔ جہاں یونیورسٹی میں مسلم فلسفہ اور عربی ادب کی تدریس کے فرائض انجام دیئے' لیکن صحت کی خرابی کے باعث پھر وطن واپس آنا پڑا۔

بغداد کے لاء کالج میں قانون پڑھانا شروع کیا۔ اس دوران میں آزادی نسواں کے موضوع پر بہت سے مقالے "المئوید" میں چھپے جس کی وجہ سے عوام میں بڑا ہیجان پیدا ہوا اور لوگ اسے مرنے مارنے پر تل پڑے۔

جنگ عظیم کے دوران میں اور بعد میں بھی بہت سے عہدوں پر فائز رہا اور زیادہ تر ترجمہ اور تالیف کا کام اس کے سپرد رہا۔ اس عرصہ میں اس پر کئی وجوہات کی بنا پر قنوط و یاس کا عالم طاری ہو گیا اور اس وجہ سے امیر فیصل کی پیشکش (بصورت درباری شاعر اور مؤرخ) کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۹۲۴ء میں پھر شام اور مصر کا سفر کیا۔ ۱۹۲۶ء میں ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام الاصابہ تھا جس میں اجتماعی اور مجلسی مسائل پر وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ یہ رسالہ بہت دیر جاری نہ رہ سکا۔ اس کے بعد موصوف نے دنیا سے تنگ آکر گوشہ تنہائی اختیار کر لی اور افلاس و تنگ دستی کی زندگی کو پسند کیا۔

الزھاوی محض شاعر نہیں بلکہ بہت بڑا فلسفی، مفکر اور اسلامی علوم کا تبحر عالم بھی ہے۔ علم الطبعیات کے مطالعہ کا بھی شوق تھا اور اس ضمن میں بجلی پر اپنے نظریے پیش کیے، لیکن ان کا حقائق سے بہت کم تعلق تھا۔

الزھاوی فارسی زبان کا بھی عالم تھا اور عمر خیام کی رباعیوں کا عربی میں ترجمہ کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں بغداد میں فارسی رباعیاں اور ان کا عربی ترجمہ شائع کیا۔ ۱۹۳۴ء میں، جبکہ تہران میں فردوسی کی یادگار منائی جا رہی تھی، تو الزھاوی نے اپنے عربی اور فارسی قصائد پڑھ کر سنائے جن کی ایرانیوں نے بہت تعریف کی۔

○○○

عربی شاعری میں جدید رجحانات کے چند نمونے

اصلاح معاشرہ:

جدید عربی شاعری میں جدید رجحانات کے ساتھ جدید عنوانات بھی آئے۔ صرف چند ایک عنوانوں کی جانب توجہ دلانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس سے آپ کو باآسانی اندازہ ہو سکے گا کہ عرب شاعروں نے کن کن موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔
خلیل مطران: عرب قوم سے خطاب (العربی یخاطب امتہ)' احمد شوقیؒ "نرس' جمیل صدقی الزهاوی طلوع آفتاب (وصف الشروق)' علی جارم: نوجوانوں کو نصیحت "نصیحة الشباب"
استاذ علی جارم اس نظم میں نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں علم و عمل کی دعوت دیتا ہے اور جدید علوم بالخصوص سائنس کی قوت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتا ہے:

الآنَ صار العلم خير سلاح
اليوم فكرة عالم فی مصنع
تغنی عن الاسياف والارماح

(اب علم ہی بہترین اسلحہ ہے' آج کل ایک عالم کا لیبارٹری میں غور و خوض تلواروں اور نیزوں سے بے نیاز کر دیتا ہے)۔

امضوا الجهود' واخلصو لبلادکم
فی الجد والاخلاص کل نجاح

(محنت جاری رکھو اور اپنے ملک کو آزاد کراؤ' یاد رکھو کہ کوشش اور اخلاص ہی میں کامیابی ہے)۔

لا یرتجی من امته مفتونة
باللهو والتسویف ای فلاح
خوضوا الصعاب ولا تملوا انما
نیل المنی بالصبر والالحاح

(کھیل تماشے میں مشغول و مفتون قوم کونسی کامیابی کی امید رکھتی ہے۔ مشکلات میں گھس جاؤ اور آزردہ خاطر مت ہو' اس لیے کہ کامیابی' صبر اور عمل پیہم سے ہی حاصل ہوتی ہے)۔

علوم حاضرہ کی تحصیل پر زور دیتے ہوئے اقبال کی طرح اس کی دعوت بھی یہی ہے کہ سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی رنگین۔

ایلیا ابو ماضی کی ایک نظم کا عنوان ہے۔ "الیتیم" اس نظم میں شاعر نے یہ انداز اختیار کیا ہے کہ یتیم بچہ قوم کے لیے مصیبت اور وبال جان نہیں ہے۔ یہ نونہال ایک ننھا سا پودا ہے جو مستقبل قریب میں نہایت خوبصورت اور خوشنما پھولوں سے لدا ہوا نظر آئے گا اور نہایت لذیذ اور خوش ذائقہ پھل دے گا۔ مختلف انداز سے یتیم کی اہمیت اور شخصیت پر طبع آزمائی کرنے کے بعد ایلیا ابو ماضی کہتا ہے:

فاعینوه کی یعیش ویرقی
ناعم البال فی الحیاة رضیًا
رب زمن مثل النهار مصر
صار بالبوس کالظلام وجیا

(تم اس کی مدد کرو' تاکہ وہ زندہ رہے اور ترقی کرے' خوشحال زندگی گزارے اور راضی۔ کچھ زمانے دن کی طرح روشن ہوتے ہیں' مگر وہ بدحالی میں اندھیروں کی طرح ننگے پاؤں ہوتے ہیں)۔

محمود خفیف کی نظم' "مناجاة النیل" خلیل مطران کی وصف عصفور مبرقش (سنہری چڑیا)' البارودی کی وصف الخریف اور خلیل مطران کی نشید الحریة وغیرہ قابل ذکر

ہیں۔ جمیل صدقی الزہاوی: وصف مغنیۃ۔

ما انت الا نادرہ
فی کل فن ساحرہ
معجزۃ بالغۃ
من معجزات القاہرہ
انحن فوق ارضنا
ام فی السماء الزاہرہ
لو کان یحیٰ المیت
احیتہ الاغانی الساحرہ

(تو ایک نادرہ روزگار عورت ہے، ہر ایک فن میں جادوگر ہے، معجزہ ہے، متاثر کن، قاہرہ کے معجزات میں سے، (تیرے رقص کو دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا) کہ ہم زمین کے اوپر ہیں، یا ہم روشن آسمان کے اوپر۔ اگر کوئی شخص مردے کو زندہ کر سکتا ہوتا تو اس جادوگر عورت کے نغمات ضرور ایسا دیتے)۔

اسی انداز میں "الرصافی" نے "وصف موسیقار" نظم کہی ہے۔ استاد محمد السید الشحاتہ کی نظم بعنوان القطن اور الھدھد، جمیل صدقی الزہاوی کی نظم "ماں کی تدفین" پر یتیم سلمیٰ کے جذبات، ولی الدین یکن کی، "فتاۃ عمیاء تتحدث الی الاخیار" (اندھی لڑکی کی اہل خیر سے درخواست) معروف الرصافی: تربیۃ البنات:

ہل یعلم الشرقی ان حیاتہ
تعلو اذ ا ربی البنات واد با
والشرق لیس بناہض الا آنا
ادنی النساء من العلوم و قربا
من این ینہض قائما من نصفہ

يشكو السقام بفالج متوصبا

(کیا مشرق انسان اس بات کو جانتا ہے کہ اس کی زندگی' اسی وقت ترقی کر سکتی ہے' جب وہ لڑکیوں کو تربیت دے اور ان کو ادب سکھائے' مشرق صرف اسی وقت اٹھ سکتا ہے جب عورتیں علوم کے قریب ہو جائیں' مشرق کہاں سے ترقی کر سکتا ہے جب اس کا نصف حصہ بیماری اور فالج کا شکوہ سنج ہو)۔

استاد محمود غنیم: (الحراث اهل)

يخطط الارض فى نظم واتقان

كانه ريشة فى كف فنان

شاعر کے نزدیک کسان ایک ماہر فن کار ہے جو زمین پر لکیریں کھینچ رہا ہے اور ان لکیروں میں ایک تناسب' ایک حسن اور ایک فن ہے۔ بالکل اسی طرح کا فن جس طرح کہ موسیقی اور مصوری ہے۔ شاعر سمجھتا ہے کہ کسان کو بھی اپنی فنکاری پر اتنا ہی ناز ہے جتنا کہ ایک موسیقار اور مصور کو ہوتا ہے' پھر کہتا ہے:

له سلاح انا ما شقها انفتحت

فيها كنوز يواقيت و مرجان

(اس کے پاس ایک ہتھیار ہے جب وہ (اس سے) اس (زمین) کو پھاڑتا ہے' تو اس میں یاقوت اور مرجان کے خزانے کھل جاتے ہیں)۔

حمص کا شاعر نذیر الحسامی زندگی کے بارے میں عجیب نظریہ رکھتا ہے اس نے "الصبر الجمیل" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے' جس میں وہ کہتا ہے کہ اسے مصائب و آلام سے محبت ہے۔ اس کی اپنی زبان سے سنیئے: ایک تصور حیات تو یہ ہے کہ

"رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج"

مگر شاعر رنج و غم میں زندگی کی سرمستی محسوس کرتا ہے اور مصائب و آلام کا بڑا دلدادہ ہے:

انا صب بعنابی

انا صب باكتابی

انا مرتاح الی ثو
رة نفسی واضطرابی
انا راض بانفرادی
مستخف باغترابی
ان هیمان بالآ
می وجرحی واحترابی
انها مبعث اقدا
می، وهزئی بالصعاب
انها تریاق احسا
سی و ?کری وشبابی

(میں اپنی تکلیف و اذیت کو برداشت کرنے والا ہوں، میں اپنی ذات کی تکلیف اور اضطراب پر خوش ہوتا ہوں، میں اپنی علیحدگی پر راضی ہوں۔ اپنی اجنبیت کو کم محسوس کرتا ہوں، میں فریفتہ ہوں اپنی تکلیفوں، اپنے زخم اور اپنی جلن پر کہ وہ میرے قدموں کو اٹھاتی اور مجھے مشکلات کے برداشت کرنے پر ابھارتی ہے۔ وہ میرے احساس و فکر کا تریاق اور میرا شباب ہیں)۔

یہ سخت کوش اور رنج دوست شاعر، ایک اور مقام پر اپنی شاعری اور فن کاری کو غریبوں مسکینوں اور دکھیا لوگوں کے لیے وقف ٹھہراتا اور کوٹھیوں اور محلات میں رہنے والوں کو اپنے خیالات کا مستحق قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک غریب اور مفلس و قلاش لوگ شاعر کے فن سے استفادہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور شاعران کے رنج و غم کو کم کرنے میں ان کی مدد کر سکتا ہے، لیکن دولت مند طبقہ فنی جمال سے بہرہ مند ہونے کی صلاحیتیں نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک سرمایہ داروں کا نظریۂ حیات دنیا کی زیب و زینت اور مال و دولت کی پرستش کے سوا اور کچھ نہیں ہے وہ کہتا ہے:

انا للکوخ وللسر

داب، لا للقصرفنی
ولانات احزانی
اھدم الدنیا وابنی
لابتسام البائس المسکین
اشفاقی وحزنی
انا للبوئس وفی البواس
اعاصیری ومزنی

احمد شوقی مزدوروں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم بڑی محنت اور مشقت سے کام کرتے ہو علی الصبح اٹھ کر رزق تلاش کرتے ہو۔ پھر شاعرانی مزدوروں کو آسائش و راحت کی زندگی کے چند گر بتاتا ہے۔

ایھا الغالون، کالنحل
ارتیاناً ء وطلابا
فی بکور الطیر للرزق
مجیئا و نھابا
اطلبوا الحق برفق
واجعلوا الواجب دابا
واستقیمو یفتح اللّٰہ
لکم باباً فباباً
اھجرو الخمر تطیعوا اللّٰہ
او ترضوا الکتابا

(اے کھجور کے پیڑ کی طرح صبح سویرے اٹھنے اور تلاش رزق کے لیے جانے والو جو پرندوں کی طرح صبح کے تڑکے روزی کے لیے جاتے اور (رات گئے) آتے ہیں۔ اپنا حق (رزق حلال) نرمی کے ساتھ تلاش کرو اور ادائے واجب کو اپنی دت بناؤ اور سیدھے

رہو' اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ایک ایک دروازہ کھولتا چلا جائے گا)۔ شراب کو چھوڑ دو' اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرو اور اپنی تقدیر پر راضی رہو)۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مستقبل کی طرف توجہ دلاتا ہے:

انما العاقل من یجعل
للدھر حسابا"
فانکروایوم مشیب
فیه تبکون الشبابا
ان للسن لهمًا
حین تعلو' وعنابا
فاجعلوا من مالکم للشیب
والضعف نصابا
واذ کروا فی الصحة الدا
اء انا ماالقسم نابا

(عقلمند وہ ہے' جو زمانے کے لیے حساب کتاب رکھتا ہے۔ تم لوگ بڑھاپے کے اس وقت کو یاد کرو جب تم لوگ جوانی کو روؤ گے۔ عمر کی البتہ بڑی اہمیت ہے۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے اور تکلیف دیکھو گے' پس تم لوگ اپنے مال میں سے بڑھاپے اور کمزوری (کے وقت) کے لیے الگ حصہ (نصاب) رکھو اور تم صحت کے دوران میں بیماری کو یاد رکھو' جب بیماری کے آنے کا اندیشہ ہو)۔

استاد محمد عبدالمطلب نے اپنی ایک نظم میں سرمایہ داروں کی سردمہری کی شکایت کی ہے نظم کا عنوان ہے:

"فقیر عزیز یتحدث قسوۃ جارہ الغنی"

ایک غریب مگر شریف انسان کو دیکھ کر شاعر کو ترس آگیا۔ یہ شریف انسان اپنے افلاس کے بارے میں حرف شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ تنگ دستی کا شکوہ کرنا وہ اپنے وقار

کے منافی سمجھتا ہے۔ شاید وہ صبر کرلیتا' لیکن اس کے اردگرد بھوکے اور ننگے بال بچے' ہیں۔ بڑے صبر بھی کرلیں' معصوم بچے صبر کی دولت سے ناآشنا محض' کیا جانیں صبر کیا ہے؟ اس ماحول میں وہ مفلس انسان کہتا ہے:

اے میرے پروردگار! میرا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ کیا میرے پڑوسی کو معلوم ہے کہ میں کن حالات سے دوچار ہوں۔ ہائے افسوس اسے کیسے معلوم ہو' وہ تو دولت کے نشے میں سرشار اور آسائش دوگیتی کا متوالا ہے۔

شاعر نے معاشرے کے خلاف جی بھر کر زہر اگلنے کے بعد مفلس انسان میں جذبہ خودداری بیدار کردیا ہے۔ وہ غیرت مند مسکین و قلاش انسان اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ اس نے غلط انداز اختیار کیا۔ اس نے اپنے دولت مند پڑوسی سے ایک موہوم سی آس رکھی۔ وہ اپنی اس روش پر بڑا نادم ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اتنی سی بات بھی اس کے وقار اور صبر کے خلاف تھی' بالآخر وہ یوں اظہارِ تمنا کرتا ہے:

یا رب انت الرجاء فیهم
یا رازق الطیر فی القفار

(اے میرے پروردگار تو ہی ان کے لیے امید ہے' اے صحراؤں میں پرندوں کو رزق دینے والے)۔

استاذ امجد طرابلسی الشامی نے ایک بچے کو دیکھا کہ وہ ایک چھوٹے سے پرندے کو ستا رہا ہے۔ شاعر کو پرندے کی حالت دیکھ کر ترس آگیا۔ اس نے پرندے کو بچے کے ظلم سے نجات دلائی۔ شاعر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

هو یاطفل حزین
جائع' غیر فطیم
صامت یحمل عب الحزن
والکرب العظیم
جسمه الازغب لاینهض

بالخطب الجسیم

(اے چھوٹے سے بچے غمزدہ' وہ (پرندہ) بھوکا اور پیاسا ہے' خاموش ہے' غم اور بری تکلیف کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے' اس کا نرم بالوں والا جسم' بڑی لکڑی کے ساتھ بھی نہیں اٹھ سکتا)۔

شاعر نے اس پرندے کی ماں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے جو انداز اختیار کیا ہے' وہ ملاحظہ ہو:

امه یاطفل تبکی
فی دجیٰ الیل البهم
تخشی فوق اغصا
ن الربامشی السقیم
لم تنق طعم الکری من
جرحها الدامی الدیم
غاب لاتدری احی
هو ام بعض الرمیم
عد به للوطن الغالی
وللام الرؤم
وارحم الضعف فما
یقسو سوی الباغی اللئیم
کن رحیما انما الانسان
ن و القلب الرحیم

(اے بچے اس کی ماں رات کے اندھیروں میں روتی ہے۔ وہ بڑھی ہوئی ٹہنیوں پر بیمار پرندے کی طرح چلتی ہے۔ اس نے اپنے زخمی بچے کی بنا پر اونگھ کا ذائقہ تک نہیں چکھا۔ جو کہ غائب ہے اسے نہ یہ معلوم ہے کہ وہ (بچہ) زندہ ہے یا مرگیا۔ اسے اس کے

گردان قدر وطن اور اس کی غمزدہ ماں کے پاس لوٹا دے۔ اس کی کمزوری پر رحم کر، ار
مہربان ... سوائے کمینہ خصلت باغی کے، کوئی سخت دل نہیں ہوتا، تو مہربان ہو جا۔ کیونکہ
انسان تو مہربان دل والا ہوتا ہے)۔

شاعر نیل محمد حافظ ابراہیم کی ایک نظم بعنوان "واجبنا نحو الطفل البائس" یعنی
دکھیارے بچے اور ہمارا فرض بھی قابل غور ہے۔ اس نظم میں شاعر نیل کہتا ہے کہ ہمیں
بچوں کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ انہیں مصائب و آلام سے بچانا چاہیئے۔ ان کا دکھ ساری قوم
کا دکھ ہے۔ یہی بچے کل کو قوم بننے والے ہیں۔ یہی بچے مصلح اور بہادر بنیں گے کون جانتا
ہے کہ ان چھیتڑوں میں چلنے والے پہاڑوں سے ٹکرانے والے عزم کے مالک ہوں۔ وہ
کر گزرنے والا ارادہ رکھتے ہوں جو پہاڑوں کی بلند چوٹیوں کو مسخر کرلیں۔

جدید عربی غزل

انیسویں صدی کے آخر تک عربی غزل کا انداز بالکل قدیم تھا۔ البارودی اور
اسمٰعیل صبری وغیرہ نے قدیم انداز اختیار کیا۔ البتہ صبری نے غزل میں دل کو مخاطب کیا:

اقصر فؤادی فما ذکری بنافعة
ولا بشافعة فی رد ما کانا
هلا اخذت لهنا الیوم اهبة
من قبل ان تصبح الاشواق لشجانا
لهفی علیک قضیت العصر مقحما
فی الوصل نارا وفی الهجران نیرانا

(اے دل رک جا۔ اس لیے کہ جو کچھ ہو چکا اس کے ازالے کے لیے نہ تو میرا
اسے یاد کرنا فائدہ مند ہے اور نہ شفا دینے والا ہے۔ تو نے جدائی کے اس دن کے لیے پہلے
سے خود کو تیار کیوں نہ کیا۔ قبل اس کے کہ (تیرے شوق) زخمی ہو جائیں۔ تجھ پر افسوس

تو نے تمام زمانہ اوندھے منہ گرے ہوئے گزار دیا‘ کہ وصل میں ایک آگ ہے اور ہجر میں کئی ہیں)۔

ان اشعار میں جدت صرف اسقدر ہے کہ شاعر نے یہاں خاصی رقت اور موسیقی پیدا کردی ہے اور دل کو خطاب کرتے ہوئے محبت کے تاثرات بیان کیے ہیں۔

خلیل مطران محبت میں وفاداری اور مداومت کا قائل ہے۔ وہ محبت میں "ہرجائی" نہیں:

وکم عرضت لی غانیات فعففتها

وصنت ضمیری واللسان المشببا

(میرے سامنے کتنی ہی حسین و جمیل عورتیں آئیں۔ مگر میں پاک دامن رہا اور میں نے اپنے ضمیر اور اپنی دراز زبان کی حفاظت کی)۔

خلیل مطران نے غزل کو ایک وحدت بنا دیا اور تسلسل پیدا کر کے اس میں ایک نئی طرح ڈالی۔ خلیل کے نزدیک محبت کا تصور ہر لحظہ بڑھتا ہے‘ کم نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے:

کانا شعلتان انا اعتنقتا

علیٰ ظمأً فلم یرو الاوام

وما ان تنطفی نار بنار

فیشفینا التعانق واللزام

(وہ ایسے دو شعلے ہیں جو باہم ایک دوسرے سے پیوست ہیں‘ شدید پیاس پر‘ مگر اس سے پیاس نہیں بجھی اور آگ آگ کے ساتھ نہیں بجھا کرتی کہ ہمیں معانقہ کرنا اور لپٹنا شفا دیتا)۔

دوسرے مقام پر مطران محبت کو گلاب کے پھول سے تشبیہ دیتا ہے‘ جسے توڑنے والا خوش ہوتا ہے اگرچہ اس کے ہاتھ کانٹوں سے زخمی اور خون آلودہ ہی کیوں نہ ہو جائیں:

یا وردۃ یرتاح جانیھا وان

دمیت یداہ بشوکھا المعدوا

(اے پھول' جس کا چننے والا راحت پاتا ہے' خواہ اس کے دونوں ہاتھ' تیز کانٹے سے زخمی ہو جائیں)۔

خلیل مطران نے غزل میں جذبہ صادق اور وفاداری کا پیغام سنایا۔ اس حب صادق میں شاعر کو ایک گونہ تسکین قلب اور مسرت و شادمانی محسوس ہوتی ہے۔

عباس محمود العقاد نے غزل میں خاص قصائد لکھے اور رنگ آمیزیوں سے غزل میں بانکپن پیدا کر دیا۔ العقاد محبت کو لے کر آسمان کی طرف پرواز کرتا ہے اس کی نگاہ دوسرے آفاق پر پڑتی ہے۔ جہاں اس کا دل کسی دوسرے دل کے پڑوس میں پھڑپھڑاتا ہے۔

قلب یرفرف فی جوار قرینہ

لا القلب مبتعہ ولا ھو فان

متفرقین یعطیا فانا التقی

حظا ھما فسرورہ ضعفان

ویلذ بالشمر الجدید کلاھما

کالحور تحت عرائش الرضوان

(وہ ایسا دل ہے جو اپنے ساتھی کے پڑوس میں پھڑپھڑاتا ہے' نہ تو دل دور ہونے والا ہے اور نہ ہی فنا ہونے والا ہے' دونوں کو ایک دوسرے کی جدائی دے دی گئی۔ جب دونوں کے نصیب ملتے ہیں تو ان کی خوشی دو چند ہو جاتی ہے اور وہ دونوں محبت کی خوشبو سے ایسے لذت حاصل کرتے ہیں۔ جیسے کہ حوریں عرش الٰہی کے نیچے)۔

محبت میں عفت و شرافت اور تقدس و پاکیزگی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

وحب القداسۃ لم اعدہ

وحب التصوف لم یعدنی

(اور پاک محبت' میں اس کا عادی نہیں اور تصوف کی محبت نے مجھے عادی نہیں

بنایا)۔

حبیب کا تصور پیش کرتے ہوئے عقاد کہتا ہے:

یا حبیبی! انت ری
لیس فی الماء نظیرہ
یا حبیبی! انت ظل
لیس للروض عبیرہ
انت عندی کل شی
کل شی ماشئت یکون

(اے میرے محبوب تو میری سیرابی ہے۔ مگر پانی اس کی مثال اور نظیر نہیں ہے۔ اے میرے محبوب تو سایہ ہے مگر باغوں میں اس کی مثال نہیں ہے' تو میرے نزدیک ہر ایک شئی سے' تو جو چاہے' وہ ہو جا)۔

ان اشعار کے وزن پر غور فرمایئے' الفاظ کی سادگی' مطالب کی وضاحت اور قوافی میں تبدیلی بھی نظر آتی ہے۔

ابراہیم مازنی محبت کا تاثر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے ایک حسین چہرہ دیکھا تو میں نے چاہا کہ اس کے حسن میں اللہ کی عبادت کروں:

ان وجھا رایتہ لیلۃ السبت
رمانی بحبۃ و تولی
عجب کیف یرتضی اللّٰہ عنا
من عبدہ فی حسنہ اللّٰہ جلّا
ھل ھباک الا لہ بالحسن الا
لنریٰ فیک آیۃ تتجلی

(ہفتے کی شب میں نے ایک چہرہ دیکھا' اس نے مجھے اپنا گرویدہ کرلیا اور وہ چلا گیا۔ مجھے تعجب ہے اللہ تعالیٰ ہم سے کیسے راضی ہوگا۔ جس نے اس شخص کی بندگی کی۔ جس

کے حسن میں اللہ کی ذات جلوہ گر ہو' تجھے اس کی طرف اس کے حسن نے ہی نہیں چلایا' بلکہ اس بات نے کہ ہم نے اس میں روشن نشان دیکھا ہے۔

☆○☆

انت افسدتنی و علمتنی الحب

فهلا اصلحت منی هلا؟

(تو نے ہی مجھے بگاڑا ہے۔ اور مجھے محبت سکھائی ہے۔ سو تو نے مجھے کیوں نہ سنوارا' کیوں نہیں)۔

ڈاکٹر احمد زکی ابو شادی یونانیوں کی طرح حسن و جمال کی پرستش کرتا ہے:

وقدعبدت جمالا فیک مستترا

کفارس الاس یرعی نشاۃ الاسی

یہی نہیں بلکہ وہ تو صوفی بن جاتا ہے اور ایک بچے کی طرح حسن کا شیدائی اور عابد بن جاتا ہے:

من علم القلب الصغیر

عبادة الحسن العجیب

وتبتلا کتبتل الصوفی

ناب علی الصلیب

(کس نے چھوٹے سے دل کو حیران کن حسن کی پرستش کرنا سکھایا اور صوفی کی طرح دنیا سے کنارہ کش' جو صلیب پر پگھلتا رہتا ہے)۔

امریکہ کے دوسرے عرب شعرا کی طرح میخائل نعیمہ پر بھی قنوط و یاس سوار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لذت اور شادکامی سے محروم رہا ہے اسی لیے وہ کسی حسن و جمال کے سامنے سرنگوں نظر نہیں آتا۔

محبت و عشق کے میدان میں فوزی معلوف کے تجربات بھی اس کی ناکامی اور یاس کی غمازی کرتے ہیں۔ اس کی غزل میں حسرت بڑی نمایاں ہے۔ وہ ہوائی جہاز میں سوار

ہوکر آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جس جس سے محبت کی، وہ وفا سے تہی دامن نکلا اور خیانت کی طرف مائل۔

صرف رشید الخوری ایسا دیہاتی شاعر ہے جو محبت سے شاد کام نظر آتا ہے وہ امریکہ میں رہ کر بھی بدوی اور دیہاتی حسن کو پسند کرتا ہے۔ شاعر کو محبوبہ کی سادگی اور بے تکلفی بے حد مرغوب ہے۔

البتہ بشارت الخوری محبت و عشق کا رسیا ہے۔ وہ کہتا ہے محبت میری سرشت میں ہے، "ولد الھوی والخمر لیلة مولدی" (محبت اور شراب، میری ولادت کی رات میرے ساتھ پیدا ہوئیں) پھر کہتا ہے:

قد عشت بینھما علی نغم الصبا

(عون کا شاعر) علی محمد لقمان اپنی نظم بعنوان "الالم والفن" میں ایک محبوس پرندے کا ذکر کرتے ہوئے یہ نظریہ بیان کرتا ہے کہ انسان کو محبت و عشق کا دعویٰ ہے، وہ آزادی و حریت کا علمبردار ہے، لیکن ایک معصوم پرندے کو پنجرے میں قید کر دیتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ پرندے کے گیتوں میں سوز و موسیقی اس پنجرے کی بدولت ہے، یہ درست ہے کہ پرندے کو قید میں تکلیف اور دکھ ہے، لیکن انسانوں کے لیے گیت روح پرور ہیں۔

لو لا عناب فی قیود الدنیا

لم یبتکر الحانه المبدع

(اگر دنیا کی قید میں تکلیف نہ ہوتی تو اس کے خوبصورت راگ بھی نہ ہوتے)۔

OOO

اشعار کا ترجمہ از مرتب

عربی صحافت (ابتداء وارتقاء)

ایک تاریخی و تنقیدی جائزہ

عربی صحافت فنی اعتبار سے دنیا کے کسی متمدن اور مہذب ملک کی صحافت سے کسی لحاظ سے بھی پیچھے نہیں ہے۔ خبروں کے حصول میں وہ تمام ذرائع و وسائل اختیار کیے جاتے ہیں جو کسی ترقی یافتہ ملک کے لوگ کر سکتے ہیں۔ اخبار و حوادث کے علاوہ بہترین شذرات اور اداریئے نیز ماہرین فن اور مفکرین وقت کے قلم سے اقتصادی' سیاسی' اجتماعی' علمی اور ادبی غرضیکہ ہر قسم کے بلند پایہ مقالات زینت صحائف ہوتے ہیں۔ اخبارات و مجلات کے تحریری اداروں کے لیے بہترین دل و دماغ رکھنے والے قلم کاروں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ اخباروں اور ماہ ناموں کی کثیر تعداد عربی ممالک کے شوق اخبار بینی کا پتہ دیتی ہے۔ آج عربی اخبارات اور رسالے اپنے تازہ ترین خبروں' دلفریب تصویروں' بلند پایہ مقالات' وسعت معلومات' طباعت کی نفاست اور عمدہ کاغذ کے لحاظ سے صحافتی دنیا کی صف اول میں نظر آتے ہیں۔

صحافت اور طباعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عربی ممالک اٹھارویں صدی کے آخر تک جدید فن طباعت سے بالکل ناآشنا رہے۔ یہ درست ہے کہ اٹلی میں عربی حروف والا مطبع ۱۵۱۴ء میں قائم ہو چکا تھا' مگر اسلامی ممالک میں سب سے پہلے یہ شرف ترکی کے حصے میں آیا۔ قسطنطنیہ میں ۱۷۲۸ء میں عربی حروف (ٹائپ) میں طباعت شروع ہوئی' لیکن عربی ممالک میں ٹائپ والے مطابع کا رواج انیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ سب سے پہلا مطبع حلب میں قائم ہوا۔ پھر لبنان کی باری آئی۔ لبنان کے بعد بیروت میں مطبع کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۸۲۲ء میں انگریزوں نے مالٹا میں ایک عربی مطبع کی داغ بیل ڈالی اور ۱۸۲۴ء میں اسی مطبع کو مالٹا سے بیروت منتقل کر دیا گیا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ نپولین ۱۷۹۸ء میں ایک مطبع اپنے مصر ساتھ لایا تھا۔ تاکہ سرکاری احکام اور منشورات کو عربی زبان میں شائع کیا جا سکے۔ اس مطبع کو "المطبعۃ الاھلیہ" کے نام سے یاد کیا جاتا

ہے۔

عربی صحافت کا آغاز

ابتدائی دور میں عربی صحافت کو در حقیقت مصری صحافت کہنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے جغرافیائی محل وقوع اور شاندار تاریخی اور ثقافتی روایات کی بنا پر مصر ہی اس بار گراں کا متحمل ہو سکتا تھا اور یہ مصری صحافت غیر ملکی اثر و اقتدار کی رہین منت ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ۱۷۹۸ء سے لے کر ۱۸۰۱ء تک مصر پر فرانس کا تسلط رہا۔ فرانسیسیوں نے اپنے قیام مصر کے دوران میں عربی صحافت کا بیج بویا۔ حکومت فرانس نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر دو اخبار فرانسیسی زبان میں مصر سے جاری کیے۔ ایک کا نام برید مصر (Courrierd Egypt) اور دوسرے کا نام العشارۃ المصریہ (De Cate Egyptienne) رکھا۔

"برید مصر" خالص سیاسی اخبار تھا۔ اور العشارۃ المصریہ دہ روزہ علمی و ادبی صحیفہ جو ہر دس دن کے بعد شائع ہوتا تھا۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ حکومت فرانس نے مہینے کو چار ہفتوں کی بجائے تین دھائیوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اسی نسبت سے یہ اخبار دہ روزہ قرار پایا۔ فرانسیسی اقتدار کے خاتمے کے ساتھ ہی ان دونوں اخباروں کی زندگی بھی ختم ہو گئی۔

اخبارات و جرائد کے اغراض و مقاصد حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ سیاسی غلامی کے زمانے میں اغراض و مقاصد اور ہوتے ہیں اور آزادی و حریت کے زمانے میں کچھ اور۔ زمانۂ غلامی میں عوام کو غیر ملکی حکومت کے خلاف بھڑکایا جاتا ہے۔ جمہور کے دلوں میں حکومت اور حاکم قوم کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات کی پرورش کر کے وطنی شعور اور سیاسی بیداری پیدا کی جاتی ہے۔ ذہنی اور سیاسی تربیت کے ساتھ عوام الناس کو جہاد حریت کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ نیز احساس حقوق کو تیز تر کر دیا جاتا ہے، مگر آزادی کے زمانے میں اسے کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ حقوق کے بجائے

انہیں فرائض یاد دلائے جاتے ہیں اور احساس شہریت کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

پہلا دور

فرانسیسی اقتدار کے شروع ہوتے ہی حکومت نے ضروری سمجھا کہ مصری عوام سے براہ راست تعلقات پیدا کر کے ان کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اس غرض کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت نے محکمہ تعلقات عامہ قائم کیا اور اس محکمے کو کامیاب بنانے کے لیے مصری علما اور ادیبوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس سلسلے کی اہم کڑی مسلمانوں کے لیے "دیوان قضا" کا قیام تھا۔ دیوان قضا کے فیصلوں اور احکام کو جمہور اور بالخصوص فوجی حلقوں تک پہنچانے کے لیے روزنامچہ کے طور پر ایک صحیفہ "التشبیہ" جاری کیا گیا۔ اس اخبار کی ادارت کے فرائض سید اسمٰعیل خشاب کے سپرد ہوئے۔ "التشبیہ" عربی صحافت کا سنگ بنیاد ہے، لیکن یہ حقیقت نظروں سے اوجھل نہ ہونی چاہیئے کہ اس کی اشاعت فوجی حلقوں تک محدود رہی اور اس کی حیثیت قضائی یا عسکری صحیفہ سے زیادہ نہ تھی اور جب فرانسیسی حکومت نے مصر کو خیرباد کہا تو یہ اخبار بھی موت کی آغوش میں "چلا گیا۔

مصر سے فرانسیسی اقتدار کے ختم ہو جانے کے پورے ستائیس برس بعد محمد علی پاشا نے ۱۸۲۸ء میں ایک سرکاری اخبار "الوقائع المصریہ" کے نام سے جاری کیا۔ یہ اخبار حقیقی معنوں میں پہلا عربی جریدہ تھا۔ جس میں جمہور کی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھ کر خبروں اور حوادث و واقعات کی اطلاع بہم پہنچانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اول اول یہ اخبار ترکی زبان میں شائع ہوا۔ اس کے ساتھ پڑھنے والوں کو ذہنی تربیت اور علمی تسکین کے لیے اچھے اچھے مقالوں کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد یہ اخبار ترکی اور عربی دونوں زبانوں میں چھپنے لگا اور بالآخر صرف عربی زبان میں طبع ہوتا رہا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد ہفتہ میں صرف تین بار چھپنے لگا۔ سیاسیات سے کنارہ کشی کر کے معاشرتی برائیوں کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ عمرانی مسائل پر بہت کچھ لکھا گیا۔ جمہور کی بہبود کا خیال رکھتے ہوئے تعلیم کی ضرورت اور بالخصوص علوم مغرب کی تحصیل پر زور دیا گیا۔ بعد ازاں حکومت نے اپنے مفاد اور مصلحت کے پیش نظر اس اخبار کو سرکاری گزٹ کی

حیثیت دے کر سہ روزہ کر دیا۔

اخبار "الوقائع مصریہ" کے ادارۂ تحریر پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زمام ادارت کتنے بڑے بڑے قلم کاروں، صائب الرائے مفکروں، ماہر انشا پردازوں اور تجربہ کار ادیبوں کے ہاتھ میں رہی۔ شیخ حسن عطار (۱۷۶۶۔۱۸۳۵ء)، شیخ ابراہیم الدسوقی، شیخ شہاب الدین محمد بن اسمٰعیل (۱۸۱۲۔۱۸۵۷ء)، احمد فارس الشدیاق (۱۸۰۴۔۱۸۸۷ء)، شیخ رفاعہ بک طہطاوی (۱۸۰۱۔۱۸۷۳ء)، مفتی محمد عبدہؒ اور سعد زغلول پاشا جیسے بلند پایہ لوگ اس اخبار کی ادارت سے وابستہ رہے۔ ان مذکورہ بالا مدیروں میں سے ہر آدمی ایک خاص حیثیت کا مالک ہے۔ مغرب کے اثرات اور سفیروں نے ان لوگوں کے لیے زندگی کے نئے دھارے بہا دیئے تھے۔ ان کے فکر و نظر کے زاویئے بالکل نئے تھے۔ ان کے نزدیک زندگی کی قدریں بالکل مختلف تھیں۔

صحافت کے پہلے دور میں انتظامی امور اور دفتری معاملات کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ انتظامی خامیوں نے غیر تسلی بخش حالات پیدا کر دیئے۔ چنانچہ **الوقائع المصریہ** بھی انہی انتظامی کوتاہیوں کا شکار رہا۔ بعد ازاں اسمٰعیل پاشا نے ذاتی دلچسپی اور محنت سے تمام بدنظمیوں کو دور کر کے بہترین انتظامات کر دیے۔

۱۸۲۷ء میں حکومت فرانس کے زیر اہتمام ایک پندرہ روزہ اخبار "المبشر" کے نام سے الجزائر میں شائع ہونے لگا۔ ابتدا میں اس اخبار کی عبارت بڑی پھسپھسی، الفاظ رکیک اور ضخامت بالکل معمولی ہوا کرتی تھی، مگر بعد میں اس کی ظاہری خوبیوں کے ساتھ ساتھ باطنی خوبیوں کی جانب بھی توجہ دی گئی۔ اچھے اچھے ادیب اور مشہور اہل قلم حضرات کو اس کے ادارۂ تحریر میں شامل کیا گیا۔ اس کا صحافتی معیار خاصا بلند ہو گیا۔ یہ اخبار عربی اور فرانسیسی ہر دو زبانوں میں چھپتا رہا۔

دوسرا دور

عربی صحافت کا دوسرا دور ۱۸۴۹ء سے لے کر ۱۸۶۳ء تک رہا۔ اس دور میں صحافت پر کچھ بے حسی اور جمود طاری رہا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ محمد علی پاشا کے دو

جانشین عباس پاشا اور سعید پاشا صحافت سے بے اعتنائی اور بے رغبتی برتنے لگے۔ ان دونوں جانشینوں میں نہ تو اپنے پیشرو کی سیاسی بصیرت تھی اور نہ حکمت عملی و تدبر۔ انہوں نے صحافت کی سیاسی اہمیت اور جمہوری افادیت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ حکومت کی اس بے رخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو مصر میں ذوق صحافت اتنا کم ہو گیا کہ اس دور میں سر زمین مصر سے کوئی نیا اخبار یا مجلہ شائع نہ ہو سکا۔ دوسری جانب میدان صحافت مصریوں کے ہاتھوں سے نکل کر شامیوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس دور کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ عربی صحافت کے جراثیم غیر عربی ممالک میں پھیلنے شروع ہوئے۔

شامیوں نے ۱۸۵۵ء میں "مرآۃ الاحوال" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ کی حکومتیں ترکی کے مقبوضات کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ "مرآۃ الاحوال" کی سیاسی روش حکومت ترکیہ کے خلاف تھی۔ لب و لہجہ بڑا تلخ تھا اور تنقید بڑی چبھتی ہوئی۔ انجام ظاہر ہے کسی اخبا کے ابتدائی دور میں حکومت وقت پر کڑی نکتہ چینی کر کے اس سے ٹکر لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چنانچہ یہ اخبار کوئی زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ اخبار "مرآۃ الاحوال" کے اجرا اور اشاعت کے سلسلے میں یہ بات بڑی معنی خیز اور سیاسی اعتبار سے بڑی دلچسپ ہے کہ یہ جریدہ لندن میں چھپا کرتا تھا اور اسی مقصد کے لیے رزق اللّٰہ حسون حلبی (۱۸۲۵۔ ۱۸۸۰ء) خود بھی لندن جاتا رہا۔

۱۸۵۷ء میں اسکندریہ آفندی شلهوب نے "اخبار السلطنة" نکالا۔ ۱۸۵۸ء میں جریدہ "حديقة الاخبار" بیروت سے جاری ہوا اور صحیح بات تو یہ ہے کہ شامی اخباروں میں اولیت کا حقیقی شرف' حديقة الاخبار ہی کو حاصل ہے۔ اس کا بانی اور مدیر خلیل الخوری تھا۔ اس اخبار کو جاری ہوئے ابھی دو برس ہی ہوئے تھے کہ شام میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس سلسلے میں فواد پاشا نمائندہ ہو کر شام آیا اور اس کی سفارش پر حکومت ترکیہ نے "حديقة الاخبار" کے مدیر کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس طریق سے دولت عثمانیہ کو اس شامی اخبار کا تعاون حاصل ہو گیا۔ فرانکو پاشا کے عہد میں حکومت

لبنان نے بھی اس جریدے کی سرپرستی قبول کرلی۔ ایک معقول رقم مدیر اخبار کے نام مقرر ہوگئی اور حدیقۃ الاخبار لبنانی حکومت کا نیم سرکاری اخبار بن گیا۔ برابر پچاس برس تک وطن اور ادب کی خدمت کرنے کے بعد ۱۹۰۹ء میں خلیل الخوری کی وفات کے دو برس بعد "حدیقۃ الاخبار" بند ہوگیا۔

۱۸۵۸ء میں مستشرق کرلتی (Carletti) نے جریدہ "عطارد" مارسیل سے جاری کیا، لیکن یہ جریدہ چند اشاعتوں کے بعد بند کردیا گیا۔

۱۸۶۰ء میں رشید لبنانی نے اخبار "البرجیس" پیرس سے جاری کیا۔ وہ اس اخبار کی اشاعت و طباعت کے لیے بڑا اہتمام کیا کرتا تھا، مگر چار سال کے بعد یہ اخبار سلیمان الحرائری تیونسی کے حوالے کردیا گیا۔ پانچویں سال کے بعد یہ اخبار بند ہوگیا۔

اسی سال احمد فارس الشدیاق نے اخبار "الجوائب" آستانہ سے شائع کیا۔ احمد فارس اس دور میں عربی ادب کا بہت بڑا ستون تھا۔ مدیر و مالک کی اہمیت سے اخبار کی اہمیت بھی بہت بڑھ گئی۔ عرب ادیبوں اور قلم کاروں کی نظروں میں "الجوائب" بڑا گراں قدر اور بلند پایہ جریدہ قرار پایا۔ اس کی ادبی اہمیت کے ساتھ ترکی ارباب اختیار کے نزدیک اس اخبار کا سیاسی وقار اور مرتبہ بھی کچھ کم حیثیت نہ رکھتا تھا۔ بڑے بڑے ادیبوں اور مشہور مفکروں کے خیالات اس اخبار کے صفحات کی زینت ہوتے تھے۔ اخبار "الجوائب" ۱۸۸۴ء تک برابر شائع ہوتا رہا۔

۱۸۲۰ء میں تیونس سے ایک اخبار "الرائد التونسی" شائع ہونے لگا۔

تیسرا دور (۱۸۶۳ء۔ ۱۸۸۲ء):

عربی صحافت کا تیسرا دور ۱۸۶۳ء سے شروع ہوکر ۱۸۸۲ء تک رہا۔ اس دور میں مصر سیاسی تحریکوں اور شورشوں کا مرکز بن رہا تھا۔ خفیہ سیاسی جماعتیں اس کی گود میں پرورش پا رہی تھیں۔ سازشیں اور ہنگامے پل کر جوان ہو رہے تھے۔ سیاسی افق پر نئے ستاروں کی روشنی اور تابندگی اہم حوادث کا پتہ دے رہی تھی۔ عربی صحافت نے بھی بہت سی ارتقائی منزلیں طے کیں۔ یورپ کے زیر اثر مصریوں کو مغربی تہذیب و ثقافت اور

جدید انداز فکر سے روشناس ہونے کا موقع مل گیا' مغربی علوم و فنون نے ان کے دل و دماغ کو روشن کر دیا۔ یورپ کی تہذیب اور ثقافت نے مصری ذہن کو نئی جلا دی۔ فکر و عمل نئے سانچے میں ڈھل رہے تھے۔ مصری ادیبوں اور مفکروں نے جمہور کے لیے دین و سیاست پر غور و فکر کی نئی راہیں کھول دیں۔ سیاسی شعور نے آزادی ضمیر اور حریت فکر کے دروازے پر دستک دی۔ علم و اخلاق کی نئی قدریں مقرر ہونے لگیں۔ اجتماعی اور عمرانی گتھیوں کو نئے زاویوں سے سوچا جانے لگا۔ اقتصادی مسائل حل کرنے کے لیے نئے ذرائع اختیار ہونے لگے۔ غرضیکہ پرانی اور نئی تہذیب دوراہے پر کھڑی نظر آتی ہے۔

زیر بحث دور کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ مصر نے پھر صحافت کی جانب توجہ کی اور بہت سے اخبارات اور علمی و ادبی رسالے معرض وجود میں آئے۔ خدیو اسمٰعیل پاشا کے عہد میں محمد علی پاشا الحکیم نے ۱۸۶۵ء "مجلہ الیعسوب" جاری کیا۔ عربی صحافت میں یہ پہلا طبی مجلہ تھا۔ شیخ ابراہیم الدسوقی کو بھی اس کی ادارت میں شامل کر لیا گیا مگر یہ مجلہ کچھ زیادہ عرصے تک نہ چل سکا۔

۱۸۶۲ء میں ابو السعود افندی عبداللہ المصری (۱۸۲۸۔ ۱۸۷۸ء) نے ایک سیاسی ادبی اور علمی سہ روزہ اخبار "وادی النیل" قاہرہ سے جاری کیا۔ آفندی مذکور بڑا مشہور ادیب تھا۔ اس کی اپنی شخصیت اور ہر دلعزیزی نے اس اخبار کو عام بنا دیا۔ کہنہ مشق ادیبوں اور قلمکاروں نے اس اخبار میں مضمون اور مقالے لکھنے شروع کیے اور حقیقت تو یہ ہے کہ وادی النیل پہلا غیر سرکاری اخبار تھا جو مصر سے شائع ہوا۔ اس اخبار کے اجراء کے بعد "الوقائع المصریہ" کی واحد اجارہ داری ختم ہو گئی۔ جریدہ وادی النیل آفندی مذکور کی وفات' یعنی ۱۸۷۸ء تک جاری رہ سکا۔

اب صحافت کی ترقی کے لیے راہیں کھل چکی تھیں۔ صحافت کی آزادی نے فن اخبار نویسی کو چار چاند لگا دیے۔ سوچ اور فکر کے نئے انداز کے ساتھ عبارت کی تحسین و تزئین نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ خبروں کے تفحص و تلاش' تصدیق و تحقیق اور ان کو جلد از جلد قارئین تک پہنچانے کا ذوق ترقی کر رہا تھا۔ قومی اور ملکی سیاست کے ساتھ

بین الاقوامی سیاست بھی عربی صحافت کا موضوع بن گئی۔

۱۸۶۷ء میں جودت پاشا کے ایما سے "الفرات" حلب سے شائع ہوا۔ اسی سال داؤد پاشا حاکم لبنان نے سرکاری اخبار لبنان جاری کیا۔ ۱۸۶۸ء میں مدحت پاشا نے بغداد سے ایک اخبار "الزوراء" کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ ابراہیم المویلحی اور محمد عثمان بلال نے مل کر ایک ہفت روزہ اخبار "نزھۃ الافکار" ۱۸۶۹ء میں قاہرہ سے جاری کیا۔ حکومت کی نگاہ میں اس اخبار کا لب ولہجہ سخت قابل اعتراض تھا۔ حکومت کی مخالفت کے نتیجے میں صرف دو تین شماروں کے بعد اسمٰعیل پاشا نے اس کی اشاعت حکماً بند کردی۔

۱۸۷۰ء میں مجلّہ روضۃ المدارس شائع ہوا۔ اس کے "قلمکاروں" میں رفاعہ بک طہطاوی، علی مبارک پاشا، اسمٰعیل پاشا الفلکی، شیخ حسین المراصفی اور عبداللہ پاشا فکری جیسے صائب الرائے مفکر اور کہنہ مشق انشا پرداز شامل تھے۔ اس رسالے نے مصری نوجوانوں میں ایک نئی ادبی اور سیاسی روح پھونک دی۔ امریکن مشنری نے بیروت سے ۱۸۶۰ء میں ایک مذہبی رسالہ "النشرۃ الشہریہ" جاری کیا تھا۔ ۱۸۷۰ء میں اسے "النشرۃ الاسبوعیہ" میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے مقابلے پر کیتھولک جماعت نے "المجمع الفاتیکانی" کے نام سے ایک مجلّہ نکالا۔ جب امریکنوں کا "النشریۃ الاسبوعیہ" شائع ہوا تو کیتھولک گروہ نے ۱۸۷۰ء میں "البشیر" نکالنا شروع کر دیا۔ سرزمین شام سے اس سال بہت سے علمی اور سیاسی مجلّات شائع ہونے شروع ہوئے۔ ان میں "پطرس البستانی کے "الجنان" اور "الجنہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۸۷۱ء میں امریکنوں نے "کوکب الصبح المنیر" اور صابونجی نے "النجاح" جاری کیا۔ ۱۸۷۴ء میں "التقدیم" نکلنے لگا اور اس کی ادارت کے فرائض ادیب اسحاق (۱۸۵۶۔ ۱۸۸۵ء) کے سپرد ہوئے۔

اس عرصے میں شام پر ترکی کا تسلط جاری رہا۔ وہاں حریت قلم اور آزادی افکار نسبتاً بہت کم تھی۔ جب شامی ادیبوں اور صحافیوں نے دیکھا کہ شام کی سرزمین میں ترکی حکومت کے زیر اثر آزاد صحافت کے پنپنے کے بہت ہی کم مواقع ہیں اور اس کے مقابلے

پر مصر میں اشہب قلم کی ترکتازیوں اور سمند فکر کی جولانیوں کے لیے میدان صحافت زیادہ وسیع اور فراخ ہے تو وہاں کے مفکروں اور قلم کاروں نے مصر کا رخ کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مصر اور اسکندریہ میں شامی ارباب صحافت کی اکثریت ہے۔ اس سلسلے میں سلیم حموی پاشا نے سب سے پہلا اخبار "الکوکب الشرقی" ۱۸۷۳ء میں اسکندریہ سے جاری کیا،مگر یہ اخبار کوئی زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ ۱۸۷۶ء میں دو شامی برادران بشارت تقلا(۱۸۵۲۔ ۱۹۰۱ء) اور سلیم تقلا (۱۸۴۹۔ ۱۸۹۲ء) کی کوششوں سے "الاھرام" جیسا وقیع اور شاندار اخبار اسکندریہ میں ظہور پذیر ہوا۔ تھوڑی ہی مدت میں یہ اخبار بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اخبار مذکور کو قاہرہ میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں پہلے سے بھی زیادہ آب و تاب اور شان و شوکت سے شائع ہونے لگا۔

اب تک مصری صحافت میں قبطیوں نے کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ انہوں نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے ایک اپنا الگ اخبار نکالنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اس ضمن میں مخائیل آفندی نے ۱۸۷۷ء میں اخبار "الوطن" شائع کیا۔ قبطیوں کا دوسرا اہم اور مشہور اخبار "مصر" ہے۔ جسے ادیب اسحاق نے فرانس سے واپسی پر جمال الدین افغانی کے مشورے سے جاری کیا تھا اور افغانی اس اخبار کے لیے مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ اسی سال "لسان الحال" خلیل سرکیس کی ادارت میں شام سے نکلنے لگا۔ مجلّہ المقتطف بھی ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے مقالہ نگاروں میں فارس نمر اور یعقوب مروف کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ مجلّہ اپنے بلند پایہ مضامین اور مقالات میں تنوع کے لحاظ سے دیگر تمام مجلات سے سبقت لے گیا۔

۱۸۸۰ء میں ادیب اسحاق اور سلیم نقاش نے اخبار "المحروسہ" اسکندریہ سے جاری کیا۔ ان دونوں کی موت کے بعد زمام ادارت مختلف لوگوں کے ہاتھوں میں گھومتی رہی۔ مدت مدید تک نکلنے کے بعد پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر یہ جریدہ بھی ختم ہو گیا۔ نقولا نقاش ے ۱۸۸۰ء میں شام سے "الصباح" جاری کیا۔

زیر نظر دور میں علامہ جمال الدین افغانی جیسا مفکر اور مصلح مصر میں مقیم رہا۔

اس کی عقابی نگاہ دنیائے اسلام کا جائزہ لے چکی تھی۔ مسلمانوں کی ضرورت اور وقت کے تقاضے اس کے سامنے تھے۔ اس کی زندگی اسلامی دنیا کے لیے سرشتۂ حیات تھی۔ انقلاب اس کی گود میں پرورش پاتے تھے۔ بغاوتیں اس کے اشاروں پر ناچتی تھیں۔ اس کی شخصیت میں مقناطیسی قوت تھی۔ جہاں بیٹھ گیا وہیں ایک نئی دنیا آباد کرلی۔ اس کی موجودگی نے مصر میں ایک نیا سیاسی اور فکری ماحول پیدا کر دیا۔ افغانی نے مصر کی آزادی اور مصریوں کی خوشحالی پر بڑا زور دیا۔ دینی اصلاح' دستوری نظام اور اسلامی جمہوریت کے حق میں ایک خاصی بڑی جماعت پیدا کرلی۔ ۱۸۸۱ء میں "الوقائع المصریہ" کی عنان ادارت مفتی محمد عبدہٗ کے ہاتھ میں چلی گئی۔ مفتی نے سعد زغلول کو اپنا مدیر معاون مقرر کیا۔ یہ دونوں افغانی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اب انہیں افغانی کے خیالات کو نشر کرنے کا زریں موقع ہاتھ آیا۔ سعد زغلول پاشا نے استبداد اور شوریٰ کے عنوان سے ایک مستقل سلسلہ مضامین لکھنا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے مصری سیاست نے ایک نئی کروٹ لی۔ ۱۸۸۴ء میں افغانی مرحوم نے "العروہ الوثقیٰ" جاری کر کے عربی صحافت میں نئے باب کا اضافہ کیا۔

غرضیکہ عربی صحافت میں وطن دوستی' مکمل آزادی اور جمہوری نظام کے جذبات افغانی مرحوم کے رہین منت ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلیم نقاش نے **المحروسہ** اور **العصر الجدید** بھی افغانی کے مشورے سے جاری کیے تھے۔

اس دور کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ سیاسی صحافت کو ادبی اور فنی صحافت سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اخبارات کے پہلو بہ پہلو رسالوں اور ماہناموں کا وجود بزم صحافت کی رونق کا موجب بنا۔ اس دور میں اخبارات کے لیے جریدہ کا لفظ استعمال ہونے لگا اور علمی و ادبی ماہناموں اور رسالوں کے لیے مجلّہ کا لفظ۔ اس سے پہلے دونوں کے لیے صحیفہ یا نشریہ کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔

چوتھا دور

انگریزوں کے داخلۂ مصر سے عربی صحافت نے نئے دور میں قدم رکھا۔ اس نئے

دور میں قاہرہ علمی و ادبی اور سیاسی تحریکوں کا مرکز قرار پایا۔ جب انگریزوں کے بڑھتے ہوئے حرص و آز نے سرزمین مصر پر ڈورے ڈالنے شروع کیے تو اخبارات کی روش میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی۔ پالیسی اور حکمت عملی کے لحاظ سے عربی صحافت دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ اخبار الزمان نے ۱۸۸۲ء میں قاہرہ سے جاری ہوتے ہی کھلے بندوں انگریزوں کی حمایت کرنا شروع کر دی۔ الزمان کی اس روش کا ردّعمل یہ ہوا کہ مصری محبان وطن نے ایک سیاسی جماعت کی تشکیل دی۔ اس جماعت کا مقصد یہ تھا کہ جمہور میں بیداری پیدا کر کے انہیں آزادی وطن کی جدوجہد کے لیے تیار کیا جائے اور انگریزی اقتدار و تسلط کو ختم کر دیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر شیخ علی یوسف اور شیخ حمد مانی کے زیر اہتمام ۱۸۸۸ء میں اخبار المئوید ملی صحافت کا سنگ میل تھا۔ تمام وطن دوست سیاسی اور مذہبی مفکرین اس اخبار کی پشت پناہی کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ اخبار مصری جمہور کا حقیقی ترجمان بن گیا۔ مفتی محمد عبدہ' سعد زغلول پاشا' قاسم ابن ابراہیم مویلحی' مصطفے کامل اور مصطفے لطفی جیسے بلند مرتبہ مفکر اور صاحب قلم حضرات نے اپنے افکار و خیالات سے المؤید کے صفحات کو زینت بخشی۔ مصر کی سیاسیات ایک عرصہ تک اسی اخبار سے وابستہ رہیں۔ المؤید کے اجرا سے پہلے شیخ علی یوسف نے "مجلہ الآداب" بھی جاری کیا تھا۔ ۱۸۸۴ء میں جمال الدین افغانی "العروۃ الوثقیٰ" جاری کر کے انگریزوں کی استعمار پرستی اور اسلامی دنیا کے خلاف ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کرنے لگا۔ اس کی پالیسی اور انداز بیان کے پیش نظر تمام انگریزی مقبوضات میں اس کا داخلہ بند ہو گیا۔

مجلہ المقطتطف والوں نے مصر پہنچ کر ۱۸۸۸ء میں اخبار "المقطم" بھی جاری کر دیا۔ عربی صحافت کے اس دور میں بے شمار مجلات اور ہفت روزہ اخبارات معرض وجود میں آئے۔ جن میں البرہان' البیان' مرآۃ الشرق اور الھلال بڑی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

مصر میں انگریزی تسلط نے عربی صحافت کو خوب چمکایا۔ عربی اخبارات نے اتنا

سیاسی شعور پیدا کر دیا کہ مصری جمہور ملک کے سیاسی معاملات میں گہری دلچسپی لینے لگے۔ اخبارات کا ایک گروہ تو انگریز کے ساتھ تھا اور اس گروہ میں الزمان اور المقطم پیش پیش تھے۔ دوسرا گروہ انگریز کے مخالف تھا اور اس کی قیادت کا فخر اخبار المئوید کو حاصل تھا۔ جو شیخ علی یوسف کی زیر ادارت شائع ہو رہا تھا۔ المئوید نے تحریک آزادی مصر کے سلسلے میں بڑی خدمات سرانجام دیں اور مستقبل کے وطن دوست اخبارات کے لیے بہترین لائحہ عمل قائم کر دیا۔

۱۸۹۲ء سے لے کر ۱۹۰۲ء تک بے شمار ماہنامے اور اخبارات جاری ہوئے۔ اخبارات کے سامنے طریق کار کے دو ہی راستے تھے۔ المقطم کی پیروی میں انگریزی اقتدار کی حمایت یا المؤید کی رہبری میں انگریز کی مخالفت۔ اس عرصہ میں مصر سے شائع ہونے والے جرائد و رسائل کی تعداد ڈیڑھ سو سے بھی تجاوز کر گئی۔ اس کثرت تعداد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس عہد میں پریس کو "نسبتاً" زیادہ آزادی حاصل تھی اور ہر شخص کسی قسم کی ضمانت داخل کیے بغیر اخبار یا مجلہ جاری کر سکتا تھا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انداز اور لب و لہجہ زیادہ تر علمی اور ادبی ہو گیا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں مفتی عبدہٗ کے شاگرد رشید علامہ رشید رضا نے رسالہ المنار شائع کیا۔ یہ ماہنامہ دینی' اجتماعی اور سیاسی مباحث و مسائل پر جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہ' کے خالص اسلامی زاویہ نگاہ سے بحث کرتا تھا۔ عربی صحافت میں المنار نے دینی و اجتماعی نقطہ نظر سے خاصی خدمات سرانجام دیں اور قرآنی مباحث کو جدید انداز میں پیش کر کے بحث و نظر کے لیے نئے زاویے کھول دیئے۔

مصطفے کامل نے ۱۹۰۰ء میں اخبار اللواء جاری کیا۔ جذبۂ وطنیت سے سرشار ہو کر مصطفے کامل کے سیاسی شعور نے اسے شعلہ جوالہ بنا دیا اور وہ رسالے کا سرورق اور اندرونی مصور صفحات کی طباعت کا اہتمام یورپ میں کرتے تھے اور باقی صفحات مصر میں چھپتے تھے۔ اسی طرح المصور والوں کو اس کی طباعت پر زر کثیر خرچ کرنا پڑتا تھا۔

۱۹۰۷ء میں اخبار الجریدہ کے اجرا سے عربی صحافت نے نئی کروٹ لی۔ اخبارات کے تحریری اداروں کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا گیا۔ مقالہ نگاروں کو معقول

معاوضہ ادا ہونے لگا۔ جدید قسم کے اجتماعی اور فلسفیانہ مقالات نے ممتاز حیثیت اختیار کر لی۔ الجریدہ سید احمد لطفی کی زیر قیادت حزب الامت کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہو رہی تھی۔ آرڈیننس نافذ ہونے لگے۔ صحافت کو پا بجولاں کر دیا گیا۔ کاغذ کی قلت کے ساتھ قیمتوں میں معتدبہ اضافہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے اخبارات بند ہو گئے تھے۔ نئے اخبار نکالنے کی کسی نے جرأت نہ کی۔ جنگ کے اختتام پر کچھ ہفت روزہ مصور اخبار نکلنے لگے۔ ہفت روزہ صحافت کے ضمن میں الھلال کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کی طباعت اور فوٹو گرافی کے ذریعے ہونے لگی۔ رنگین تصویریں اخبارات اور صحافت کی زینت بننے لگیں۔ مزاحیہ اور سیاسی کارٹون بھی شائع ہونے لگے۔ خبروں کی فراہمی ایک خاص فن ہے۔ رپورٹر یا خبر رساں کی اخباری حس بڑی تیز ہوتی ہے۔ وہ خبر کو حاصل کرنے کے لیے جان پر کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ رپورٹر کی مشاقی کو دیکھ کر عرب کہتے ہیں کہ وہ خبریں سونگھ لیتا ہے۔ خبروں کی فراہمی کے سلسلے میں عرب رپورٹروں کی بڑی دلچسپ کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ ادبی اور فنی رسالوں کے علاوہ الھلال کے کارپردازوں نے ایک فکاہی مزاحیہ رسالہ الفکاھۃ کے نام سے دسمبر ۱۹۲۶ء میں جاری کیا۔

اس دور میں تمام علوم و فنون سے متعلق الگ الگ مجلات نکلتے تھے۔ طبی رسائل میں الطبیب اور الشفاء قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا اور مؤخر الذکر ۱۸۸۶ء میں۔ "الحقوق" قانونی رسالہ ہے۔ ادبی رسالوں میں المقتطف اور المشرق زیادہ مشہور ہیں۔ اجتماعی مسائی سے متعلق مجلۃ العلوم الاجتماعیہ اور اقتصادیات پر مجلۃ التعاون قابل ذکر ہیں۔ مذہبی رسائل میں المنار پیش پیش ہے۔ عورتوں کے رسالے اور مجلے الگ ہیں اور ان کی تعداد تیس کے لگ بھگ ہے۔

صحافت اور ادب

آج عربی ادب بالخصوص افسانہ اور کہانی کی ہر دلعزیزی اور مشہور ادیبوں اور شاعروں کی شہرت کا تمام انحصار عربی صحافت پر ہے اور عربی صحافت کی کامیابی کا سہرا انہی

شاعروں اور ادیبوں کے سر ہے' جمیل صدقی الزھاوی عراق کا سب سے بڑا انقلابی اور فلسفی شاعر ہے۔ اس نے ۱۹۲۶ء میں **الاصبابہ** کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا' لیکن اس کے معاشی اور اجتماعی نظریئے بالخصوص عورتوں کی آزادی کے بارے میں اس کی آرا و افکار لوگوں کو پسند نہ تھے۔ اس لیے اس رسالے کے صرف چھ شمارے نکل سکے۔ جب الزھادی کا مضمون آزادی نسواں "المئوید" میں شائع ہوا تھا تو اس کی سخت مخالفت کی گئی۔ جب عراق کا مشہور مجلّہ لغۃ العرب شائع ہوا تو اس کی ادارت کے فرائض رفائیل بطی اور محمد بہجت الاثری کے سپرد کیے گئے۔

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل ۱۹۲۲ء میں "**السیاسۃ**" کا مدیر اعلیٰ مقرر ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں **السیاسۃ الاسبوعیہ** جاری کر دیا۔ عربی ہفت روزہ اخبارات میں اس اخبار کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر موصوف نے الاھرام' الجریدہ' وغیرہ کے اداروں میں بھی کام کیا ہے۔ عباس محمود العقاد پہلے تو الدستور' الجریدہ' المئوید' الھلال' الاھرام' البلاغۃ' الاساس وغیرہ اخبارات میں مقالات لکھتا رہا۔ بعد میں اخبار الیوم اور الاساس کا مدیر مقرر ہوا۔ عبداللہ عنان ایک عرصہ تک السیاستہ اور السیاستہ الاسبوعیہ میں مضمون اور مقالے لکھتا رہا۔ شام کے مشہور ادیب امیر شکیب ارسلان اور علی دمشق کے مشہور و معروف رسالے "**مجلۃ المجمع العالم العربی**" کے لیے مقالے سپرد قلم کرتا رہا۔ ابراہیم عبدالقادر المازنی "السیاستہ" "الاخبار" "الاتحاد اور الکشاف" وغیرہ میں مقالے لکھتا رہا۔ سلامہ موسیٰ نے ۱۹۱۴ء میں ایک رسالہ المستقبل کے نام سے جاری کیا جو سولہ ہفتوں سے زیادہ نہ چل سکا۔ بعد ازاں اس نے الھلال اور البلاغہ میں باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا۔ سات آٹھ برس تک الھلال اور "کل شئی" کے ادارۂ تحریر میں شامل رہا۔ نومبر ۱۹۲۹ء میں الھلال کو چھوڑ کر اپنا الگ رسالہ "**المجلۃ الجدیدہ**" جاری کیا۔ ندیم الملاح نے ۱۹۳۲ء میں عمان سے ماہنامہ "الحکمۃ" جاری کیا۔ اس مجلّہ میں اسلامی' علمی' ادبی اور اجتماعی مقالات مندرج ہوتے تھے۔

بیسویں صدی کی عربی صحافت کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ غیر عربی بالخصوص

جرمنی' انگلستان' جاپان' ہندوستان' پاکستان' امریکہ اور دیگر ممالک نے سیاسی اور ثقافتی اغراض کے پیش نظر عربی صحافت میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ علم دوست افراد اور حکومتوں نے مجلّے اور رسالے جاری کیے۔

عربی صحافت اقصائے عالم میں

انیسویں صدی کے آخر میں شامیوں اور لبنانیوں کی کثیر تعداد امریکہ چلی گئی۔ کچھ لوگ شمالی اور کچھ جنوبی حصوں میں آباد ہو گئے۔ ان لوگوں نے وہاں بھی اپنی زبان اور ثقافت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ ۱۸۹۱ء میں پہلا عربی جریدہ "کوکب امریکہ" کے نام سے نجیب عربلی نے نیویارک سے شائع کیا۔ ۱۹۱۱ء میں نیویارک سے کئی عربی رسالے نکلتے تھے۔ ان میں مرأۃ العرب سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ایلیا ابو ماضی کا مجلّہ "اسیر" جو نیویارک میں چھپتا تھا خاصا مقبول ہوا۔ اسی طرح برازیل میں مقامی امریکی سکول بھی قابل ذکر ہے۔ میکسیکو' کولمبیا' ارجنٹائن وغیرہ علاقوں میں عربی اخبارات اور مجلّے نکلتے ہیں۔

ہندوستان نے عربی رسالوں میں "البضرۃ العرب" اور "الرابطۃ الشرقیہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پاکستان نشریات کے زیر اہتمام ایک سہ ماہی عربی رسالہ "پیشہ" کراچی سے شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں نکلا۔ دوسرا جنوری ۱۹۴۹ء میں۔ اب کراچی سے سہ ماہی رسالہ "الوحی" شائع ہوتا ہے۔ خوبصورت کاغذ' دیدہ زیب طباعت' جاذب نظر تصاویر اور دلچسپ اور متنوع مضامین کے اعتبار سے عربی مجلات کی صف اول میں نظر آتا ہے۔ گزشتہ دس پندرہ برس کے اندر امریکہ اور یورپ سے شائع ہونے والے جرائد و صحائف اور مجلات کی بڑی کثرت ہے اور اس کے لیے الگ فرصت درکار ہے۔

صحافت اور ادب

عربی صحافت زندگی کے مختلف گوشوں پر اثر انداز ہوئی۔ اس نے عربی افکار کو بیداری بخشی۔ ذہنوں کو جلا دی۔ ادب کو وسعت عطا کی۔ جمہور کی ہمتوں کو بلند کیا۔ عوام کے اداروں کو رفعت بخشی اور انہیں سعی و عمل پر اکسایا۔ مشرقی اور مغربی ثقافتوں کو یک

جا جمع کر کے نئی عربی ثقافت کی بنیاد رکھی۔ بالخصوص مصر اور شام میں مغربی تہذیب اور انداز فکر پیدا کیا۔ عربی تہذیب، زبان اور انداز بیان عربی صحافت کے احسان سے کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ مصر میں قدیم عربی تہذیب دوراہے پر کھڑی تھی۔ قدامت پسندوں اور نئے تعلیم یافتہ گروہ میں رسہ کشی ہو رہی تھی۔ ایک طرف پرانی وضع کے حامی قدیم عربی زبان اور انداز بیان سے متاثر اور دوسری طرف روشن خیال لوگ زبان اور قدیم انداز بیان کو سادہ اور عام فہم بنانے کے خواہش مند، بلکہ کوشاں نظر آتے تھے۔ ان دونوں کے طرز بیان اور انداز گفتگو میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ قدامت پسند طبقہ چاہتا تھا کہ عربی زبان پرانے اسلوب اور انداز سے ذرا الگ نہ ہو۔ جدید تعلیم یافتہ لوگ چاہتے تھے کہ نئے خیالات و افکار اور بدلے ہوئے ماحول کے لیے نیا انداز اور نیا اسلوب اختیار کرلیا جائے۔ صحافت نے ان دونوں گروہوں کو کچھ اس طرح سمویا کہ دونوں کے انداز و اسلوب میں آہستہ آہستہ قرب و موانست پیدا ہونے لگی اور بالآخر ایک ایسا اسلوب اختیار کیا گیا جو نئے افکار کی وسعت کا متحمل ہو سکا اور بدلے ہوئے ماحول کی آئینہ داری میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ اس کے ساتھ زبان کی صحت اور حسن بھی برقرار رہا۔

اخبارات کے مخاطب زیادہ تر جمہور ہوتے ہیں۔ بس اسی لیے صحافتی زبان کو زیادہ سے زیادہ آسان اور سہل بنانے کی کوشش کی گئی۔ معانی میں تعمق کو نظر انداز کر کے آسان ترین الفاظ کو اختیار کیا گیا تاکہ معمولی استعداد کا آدمی بھی مقالہ نگار کے خیالات اور اخباری خبروں سے لطف اندوز ہو سکے۔ البتہ رسالوں اور ماہناموں کی زبان، روزمرہ کی زبان سے قدرے سلجھی ہوئی اور ذرا ادیبانہ ہوتی تھی۔ عربی اخبار نویس اپنا فرض سمجھتا تھا کہ وہ اپنا مطلب آسان اور عام فہم زبان میں اخبار پڑھنے والوں تک پہنچائے۔ اس کی غرض و غایت مطلب کی ادائیگی تھی نہ کہ ادبیت۔ مشکل پسندی ذخیرہ الفاظ اور علم و فضل کا اظہار نمائش سمجھی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ عربی صحافت نے عربی ادب ثقافت اور زبان کو نئے سانچوں میں ڈھالنے اور آسان اور عام فہم کو رواج دینے میں بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔

○○○

مفتی عبدہٗ ، مصرِ جدید کا بانی

شخصیت کا جائزہ

مفتی محمد عبدہٗ کی شخصیت پر سرزمین نیل جتنا فخر کرے، کم ہے۔ وہ ایک روشن ضمیر عالم دین اور سیاسی مفکر تھا۔ اس نے دینی علوم اور مذہبی تصورات و عقائد کو نئی جلا دی۔ سیاسی تحریکیں اس کی گود میں پل کر پروان چڑھیں۔ اس نے فکر و عمل کو نئے سانچوں میں ڈھالا۔ اجتماعی اور سیاسی گتھیوں کو سمجھنے اور سلجھانے کی لیے نئے انداز تراشے۔ مذہب اور ادب کو نئی قدروں سے جانچا۔ تعلیمی اور سیاسی مسائل پر نئے طریق سے غور و فکر کیا۔ قدامت پسندی اور جمود کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے مصر کو انقلاب کے دروازے پر لا کھڑا کیا۔ غرضیکہ مفتی محمد عبدہ نے مصر کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ مفتی محمد عبدہ کی علم و فضل کی شہادت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ انیسویں صدی کا مفکر اسلام اور مجدد ملت علامہ جمال الدین افغانی ۱۸۷۹ء میں مصر کو آخری مرتبہ الوداع کہتے ہوئے مصریوں کو یوں مخاطب کرتا ہے:

> "میں شیخ محمد عبدہٗ کو تمہارے لیے چھوڑے جاتا ہوں۔ اس کا علم و فضل مصر کے لیے کافی ہے اور باعث نازش و افتخار بھی۔"

مفتی محمد عبدہٗ بڑی فصیح مگر سلیس عربی بولتا تھا۔ انگلستان اور فرانس کا سفر کرنے کے باوجود نہ تو کبھی انگریزی بولتے سنا گیا نہ فرانسیسی اور نہ کبھی ترکی زبان میں گفتگو کی۔ ہمیشہ عربی زبان بولنے کو ترجیح دی۔ گفتگو میں تواضع اور انکسار کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا۔ تقریر و تحریر بڑی مدلل ہوتی تھی۔ تقریر میں تو غضب کی روانی تھی اور فی البدیہہ بولنے میں خداداد ملکہ حاصل تھا۔ حسن بیان کے ساتھ بلا کا ذہن تھا۔ قوت حافظہ کے عطیہ میں قدرت نے بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔

درمیانہ قد، گندمی رنگ، سیاہ گھنی داڑھی، سڈول جسم، بلند آواز، نگاہیں بڑی تیز اور پیشانی روشن اور نورانی۔

اسلامی علوم، بالخصوص فلسفہ، تفسیرِ قرآن، فقہ و حدیث اور دینی مسائل پر بڑا عبور حاصل تھا۔ عربی ادبیات پر گہری اور وسیع نظر تھی۔ اندازِ تحریر میں جدت اور انفرادیت پائی جاتی۔ انتظامی قابلیت کے علاوہ انتھک کام کرنے والا انسان تھا۔ اس نے اسلامی فلسفہ اور قرآنی تعلیمات کو جدید طرزِ فکر اور نئے اسلوبِ نگارش کے ساتھ دنیا کے سامنے رکھا۔ آفرین ہے مفتی محمد عبدہٗ کو کہ اس نے حالات کی ناسازگاری، اپنوں، مخالفوں اور بیگانوں کی سازشوں کے باوجود اتنا کچھ کر دکھایا۔ یہ کہنا بالکل بے جا نہ ہو گا کہ اس کی جگہ کوئی اور انسان ہوتا تو ان مخالف اور غیر موافق حالات میں بالکل ہتھیار ڈال دیتا۔

علامہ افغانی کی زیر تربیت محمد عبدہٗ نے ۲۵ برس کی عمر میں اپنے ترقی پسند خیالات اخبارات کے ذریعہ لوگوں تک پہنچانے شروع کیے۔ محمد عبدہٗ کے اخلاقی اور اجتماعی مضامین نے مصریوں کو پہلی مرتبہ حُریت فکر اور آزادی خیال کی دعوت دی۔ جب اس نے فلسفۂ تربیت و صناعت پر قلم اٹھایا۔ تو مصری عوام کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایک مصری عالم دین کا مذہبی اور اجتماعی معاملات پر بالکل نئے زاویوں سے سوچنا اور اچھوتے انداز میں اظہار خیال کرنا ایک بہت بڑا عجوبہ تھا۔ جب محمد عبدہٗ نے دیکھا کہ ہوا سازگار ہے اور زمین ہموار تو اس نے اخبار "الاہرام" کے کالموں میں علوم جدیدہ کی طرف توجہ دلانے کے لیے ایسے دل کش انداز اور مؤثر پیرایہ بیان میں لکھنا شروع کیا کہ قدیم ترین درس گاہیں اپنے فرسودہ نظام کو خیر باد کہہ کر اصلاح و تجدید کے استقبال کے لیے آمادہ ہو گئیں۔

خاندان

مصر جدید کا یہ بانی ۱۸۴۶ء کے آخر میں محلّہ نصر میں پیدا ہوا۔ محمد عبدہٗ کا باپ عبدہ خیراللہ مصر کے متوسط طبقہ کا فلاح کسان تھا۔ بڑا خوددار اور باوقار انسان، قدرت نے فربہ جسم کے ساتھ عزیمت اور خوش باشی کی نعمت سے بہرہ ور

کیا تھا۔ تیراندازی اور سیر و شکار کا بڑا شوقین تھا۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود بڑا کم گو تھا۔ نچلے طبقے کے لوگوں سے میل جول پسند نہ کرتا تھا۔ ہیبت اور رعب کا یہ عالم تھا کہ بال بچوں اور بیویوں سے بھی کھچا کھچا رہتا اور اکثر تنہا کھایا کرتا۔ سخی اتنا تھا کہ مسافروں کے لیے اس کے گھر کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا۔ وہ اس درجہ بہادر اور آزاد منش آدمی تھا کہ ظلم کے سامنے کبھی جھکنے نہ پایا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر حکام کے جور و ستم کا تختہ مشق بنتا رہا۔

محمد عبدہٗ کی ماں جنینہ بڑی نرم خو، مگر شرم و حیا والی عورت تھی۔ غریبوں اور مسکینوں کا بڑا خیال رکھتی۔ محمد عبدہٗ نے اس ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ اپنے خاندان پر حکام کے تشدد اور ظلم کی داستانیں سنیں۔ ان سب چیزوں کا مجموعی طور پر اتنا گہرا نفسیاتی اثر ہوا کہ جوان ہو کر محمد عبدہٗ مصر جدید کا بانی قرار پایا۔ ایک طرف تو اس نے اعلان کر دیا کہ حکومت کی اطاعت اور فرمانبرداری اسی صورت میں روا ہے کہ حاکم وقت رعایا سے عدل و انصاف برتے، تو دوسری طرف اس نے اصلاحات کا بیڑا اٹھایا۔

تعلیم و تربیت

جب محمد عبدہٗ مدرسہ جانے کی عمر کو پہنچا تو اس کے والد نے محسوس کیا کہ مصری مکتب اور مدرسے بڑی ابتر حالت میں ہیں۔ بچوں کی صحت اور نشوونما کو قطعاً نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ بچوں کی طبعی ذہانت کو اجاگر کرنے کی بجائے ناقص انتظامات، غلط طریق تدریس اور علم نفسیات سے استادوں کی عدم واقفیت الٹا انہیں زنگ آلود کر دیتی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر محمد عبدہٗ کے باپ نے اپنے بیٹے کو مکتب بھیجنے کی بجائے گھر ہی لکھانا پڑھانا شروع کرا دیا۔ محمد عبدہٗ نے دس برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔

باپ نے دیکھا کہ بچہ ذہین اور ہونہار ہے۔ گھر کے انتظامی معاملات میں بڑی دلچسپی لیتا ہے، طبیعت کا رجحان پاکیزگی، صفائی اور جدت پسندی کی طرف ہے، تو اس نے مناسب سمجھا کہ بچے کو فن تجوید اور قراءت کی تعلیم سے محروم نہ

رکھنا چاہئیے۔ اس مقصد کے پیش نظر محمد عبدہ کو ۱۸۶۲ء میں طنطا کی مسجد احمدی میں بھیج دیا گیا۔ اس زمانے میں مسجد احمدی تعلیم قرآن اور فن تجوید و قراءت میں شہرہ آفاق تھی۔ محمد عبدہٗ دو برس تک تجوید قرآن سیکھتا رہا۔ جب فارغ ہوا تو مصر کے مشہور ترین قاریوں اور حافظوں میں شمار ہوا۔ محمد عبدہٗ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی سریلی اور میٹھی آواز میں بڑا سوز اور ترنم تھا۔ ترتیل و تجوید کا یہ عالم تھا کہ جب وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتا تو سننے والے مسحور ہو جاتے تھے۔

فن قراءت سے فارغ ہونے کے بعد مسجد احمدی میں عربی زبان کے قواعد سیکھنے شروع کیے۔ طریقہ تعلیم یہ تھا کہ طالب علم سمجھے یا نہ سمجھے اسے عبارت ازبر ہونی چاہیے۔ محمد عبدہٗ بغیر سوچ سمجھے کسی چیز کو رٹ لینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ ذہن میں ایک کشمکش پیدا ہونے لگی۔ اگر استادوں سے نحوی عبارتوں کا مطلب پوچھنا چاہتا تو انہیں ناگوار گزرتا' کیونکہ یہ چیز استادوں کے لیے بالکل نئی تھی۔ وہ اس بات کے عادی نہ تھے کہ ایک بچہ اٹھ کر استاد سے سوال پوچھے چنانچہ وہ ایسے بگڑے کہ اس ذہین بچےکو لعنتوں اور ملامتوں کا نشانہ بنانے لگے۔ ایک طرف تو بچے کو ذہنی پریشانی کا سامنا ہے۔ وہ دیانت داری سے یہ سمجھتا ہے کہ جس چیز کی سمجھ نہ آئے اسے کیوں کر پڑھا اور یاد کیا جائے۔ دوسری طرف استاد صاحبان بچے کی نفسیات سے بالکل بے خبر ہیں۔ وہ اس کی مشکلات اور ذہنی کشمکش کا اندازہ کرنے سے یکسر قاصر ہیں۔ اگر بچہ کچھ پوچھتا ہے تو وہ اسے اپنی اور اپنے منصب کی توہین تصور کرتے ہوئے اس معصوم پر غضبناک ہو کر خوب برستے ہیں۔

تعلیمی مشکلات

اسی حالت میں ڈیڑھ برس گزر گیا۔ یہ طالب علم ہر روز مسجد سے نہایت مایوسی کے عالم میں واپس آتا۔ اس کا دامن علم نحو کے مسائل سے بالکل خالی ہے۔ آخر وہ سوچتا ہے کہ عربی علوم میرے لیے کتنے مشکل ہیں۔ ایک بات بھی تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے سارا قرآن مجید حفظ کر لیا۔ میرے دل میں

اس کے لیے بے پناہ شوق ہے۔ قرآن کتنا آسان ہے اور عربی علوم کتنے مشکل۔ محمد عبدہ کے حساس دل میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا کہ آخر وقت کو یوں بے فائدہ ضائع کیا جائے۔ اس کے ضمیر نے مشورہ دیا کہ ایسے سبق کو چھوڑ کر بھاگ جانا بہتر ہے۔ چنانچہ محمد عبدہٗ بھاگ کر اپنے ماموں کے ہاں چلا گیا اور تین مہینے تک وہاں روپوش رہا۔ اس عرصے میں نیزہ بازی، تیر اندازی اور گھڑ سواری کی خوب مشق کی۔

محمد عبدہٗ کے بھائی مجاہد نے جستجو اور تلاش کے بعد اس کا سراغ لگا لیا۔ اس نے ہر چند کوشش کی کہ بھگوڑے طالب علم کو دوبارہ مسجد احمدی میں لے جائے، لیکن اصرار کے باوجود محمد عبدہ نے پڑھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں علم حاصل کرنے میں کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔ اب تو میرے سامنے صرف ایک ہی راہ ہے کہ میں اپنے وطن واپس جا کر دوسرے عزیزوں کی طرح کھیتی باڑی کروں۔

وہ ارادے کا بڑا پکا نکلا۔ طنطا میں جس قدر سامان اور کپڑے تھے۔ اس خیال سے اٹھا لایا کہ اب تحصیل علم کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں اور اسی خیال کے پیش نظر سولہ برس کی عمر میں بیاہ کر لیا۔ بیوی کو گھر لائے ابھی چالیس ہی دن ہوئے تھے کہ ایک دن محمد عبدہٗ کا باپ اسے ملنے آیا۔ باپ کے دل میں اس بات کا بڑا رنج و قلق تھا کہ اس کا لائق ترین بیٹا استعداد و قابلیت اور ذہانت کے باوجود تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ ترک کر بیٹھا ہے۔ اس نے بیٹے کو سمجھا بجھا کر پھر تحصیل علم کے لیے آمادہ کر لیا۔ اب بظاہر محمد عبدہٗ کے لیے مسجد احمدی میں واپس جا کر تعلیم کو جاری رکھنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، مگر وہ دل ہی دل میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

شیخ درویش کے قدموں میں

جب سفر کی تیاری ہو چکی اور گرمی کی شدت کے باوجود اسے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا گیا تو اسے سوائے اس کے اور کوئی راہ فرار نظر نہ آئی کہ بھاگ کر

کنیسہ اورین کے قصبے میں پناہ لے۔ وہاں پہنچ کر رات بسر کی۔ صبح اس کے والد کے ماموں شیخ درویش اسے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ یہ صوفی منش بزرگ بڑے صاحب قلب و نظر انسان تھے۔ ان سے ملاقات محمد عبدہٗ کی زندگی میں سنگ میل ثابت ہوئی۔

شیخ درویش کو قرآن مجید خوب یاد تھا اور وہ قرآن بڑی خوش الحانی اور سوز سے پڑھتے تھے۔ قرآن فہمی میں خاص شہرت تھی۔ موطا امام مالک کے علاوہ دیگر کتب حدیث پر بڑا عبور حاصل تھا۔ صحرائے لیبیا میں کئی مرتبہ سفر کر چکے تھے۔ طرابلس الغرب تک کے علاقے کی سیاحت کر چکے تھے۔ سیر و سیاحت سے فارغ ہو کر شیخ درویش اپنے وطن کنیسہ اورین میں واپس آئے اور کھیتی باڑی میں مشغول ہو گئے۔

شیخ موصوف طرابلس کے مشہور و معروف بزرگ صوفی سید مدنی کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے علاوہ اپنے ساتھ ایک کتاب بھی لائے تھے۔ جس میں سید مدنی کے چند رسائل شامل تھے۔ یہ رسائل انہوں نے اپنے مریدوں کو لکھے تھے۔ ان رسائل میں ریاضت نفس اور مجاہدہ کے بارے میں صوفیا کے اقوال و خیالات درج تھے۔ شیخ درویش نے محمد عبدہٗ کے سامنے وہ کتاب رکھ کر کہا کہ میری خواہش تھی کہ یہ کتاب پڑھوں' لیکن بڑھاپے نے نظر کمزور کر دی ہے اور میں مطالعہ سے محروم ہو گیا ہوں۔ نوجوان محمد عبدہٗ نے کتاب اٹھا کر پرے پھینک دی اور کہا میں پڑھ نہیں سکتا پڑھنے والوں سے مجھے نفرت ہو گئی ہے۔

شیخ درویش نے پوچھا: "بیٹا پھر کیا تو نے قرآن حفظ کر لیا ہے؟"۔

"ہاں میں نے حفظ کر لیا ہے اور خوب شوق اور ترنم سے پڑھتا ہوں' لیکن عربی زبان کے قواعد سے دل اچاٹ ہو گیا ہے اور یہی میری بدبختی کا سبب ہے"

شیخ نے نہایت تلطّف آمیز لہجہ میں سمجھایا کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں یہ کتاب پڑھو۔

محمد عبدہٗ نے کتاب کی چند سطریں پڑھیں۔ شیخ درویش نے اس عبارت کا مفہوم نہایت دل کش انداز میں سمجھایا۔ تھوڑا عرصہ گزرنے پایا تھا کہ بستی کے چند لڑکے حسب عادت آئے۔ بس پھر کیا تھا محمد عبدہٗ نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ سب لڑکے مل کر باہر نکل گئے۔ اور نیزہ بازی اور گھڑ سواری کی مشق کرتے رہے۔

عصر کے وقت شیخ درویش کتاب لے کر پھر آ پہنچا اور محمد عبدہٗ کو کتاب پڑھنے پر آمادہ کر لیا۔ اس نے چند ایک صفحات پڑھ کر سنائے۔ شیخ نے ساری عبارت کی تشریح و توضیح اپنے خاص پیرایہ بیان میں کی۔ یہ سلسلہ کچھ روز تک جاری رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد عبدہٗ کو کتاب میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ شیخ صاحب سے کتاب لے کر خود پڑھنے لگا۔ مشکل اور حل طلب مقامات کو نشان لگاتا جاتا اور بعد میں شیخ صاحب سے پوچھ لیتا۔

ہفتہ عشرہ کی قلیل مدت میں شیخ درویش کی بدولت محمد عبدہٗ کو پھر سے لکھنے پڑھنے کا اتنا شوق ہوا کہ تمام کھیل کود چھوٹ گیا۔ کھیل کے ساتھیوں سے ملنا تک گوارا نہ رہا۔ شیخ درویش کی مختصر صحبت نے محمد عبدہٗ کی زندگی کو یکسر بدل ڈالا۔ اسے زندگی کی نئی شاہراہوں سے روشناس کیا۔ نیک دل صوفی نے بڑے نازک موڑ پر اس نوجوان کی رہنمائی کی ۔ محمد عبدہٗ کی ساری زندگی اس بزرگ انسان کی تعلیمات کا پرتو ہے۔

ایک دن محمد عبدہٗ شیخ درویش کی زیارت کے لیے اس کے گھر حاضر ہوا۔ اثنائے گفتگو میں شیخ سے پوچھا: آپ کا کیا طریقہ ہے؟ اس نے کہا اسلام۔ پھر پوچھا: کیا یہ سب لوگ مسلمان نہیں ہیں؟ شیخ نے جواب دیا کہ اگر یہ مسلمان ہوتے تو آپس میں بات بات پر یوں نہ جھگڑتے اور نہ جھوٹی قسمیں کھاتے۔ محمد عبدہٗ کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے بارے، میں اس قسم کے خیالات سننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ شیخ کے ان الفاظ نے نوجوان کے دل میں ایک ایسی آگ بھڑکا دی جس سے تمام پرانے عقیدے خس و خاشاک کی طرح جل کر خاکستر ہو گئے۔

پھر شیخ سے دریافت کیا کہ آپ خلوت میں اور نمازوں کے بعد کیا ورد و وظیفہ کرتے ہیں؟ اس مرد مومن نے جواب دیا کہ قرآن میرا ورد ہے اور ہر نماز کے بعد ایک پارہ قرآن پورے تدبر اور غور و فکر کے ساتھ تلاوت کرتا ہوں۔ محمد عبدہٗ نے عرض کیا کہ میں نے تو تعلیم مطلقاً حاصل نہیں کی۔ بھلا میں قرآن مجید کیسے سمجھ سکتا ہوں؟ شیخ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ مل کر پڑھوں گا۔ تمہارے لیے اجمالی نکات کافی ہیں اس پاک کتاب کی برکت سے اللہ تعالیٰ تمہیں تفاصیل خود بخود سمجھا دے گا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ خلوت میں اللہ کا ذکر کیا کرو۔

کانوں کی راہ سے بات دل میں اتر گئی۔ محمد عبدہٗ نے شیخ کی نصیحت پر شوق و شدت کے ساتھ عمل کرنا شروع کر دیا۔ چند دن گزرنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو ایک نئی دنیا اور نئے فکری ماحول میں پایا۔ تمام مشکلات آسانیوں میں بدل گئیں۔ دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت اس کی نگاہوں میں حقیر ہو کر رہ گئی۔ اسے صرف علم و عرفان ہی ایک اہم شے نظر آنے لگی۔ معرفت کے فکر و تدبر نے تمام غم اور فکر مٹا دیئے۔ رشد و ہدایت کے لیے، بے پناہ تڑپ پیدا ہو گئی۔ محمد عبدہ نے خود اقرار کیا ہے کہ شیخ درویش کی صحبت نے جہالت کی قید سے نکال کر علم و عرفان کے ناپیدا کنار سمندر کے ساحل پر لا کھڑا کیا اور تقلید و جمود کی بندھنوں کو توڑ کر توحید کی آزاد فضا کے دروازے کھول دیئے۔

طنطا میں واپسی

دامن مراد کو علم و حکمت کے موتیوں سے بھر کر ۱۸۶۵ میں شیخ سے رخصت ہوا اور علم کے چشموں سے مزید سیرابی کی خاطر طنطا کی مسجد احمدی کا پھر رخ کیا۔ اب کی مرتبہ نئے ولولے اور نئے جذبے تھے۔ سبق میں خوب انہماک دکھایا۔ استاد کی ہر بات بڑے دھیان سے سنتا اور خوب یاد رکھتا۔

جامعہ ازہر میں

شوق علم نے ایک اور تازیانہ لگایا۔ محمد عبدہٗ طنطا کو خیرباد کہہ کر قاہرہ

پہنچا۔ قاہرہ کی شاندار درسگاہیں اور عمارتیں دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ جامعہ ازہر میں داخل ہو گیا۔ ابتدا میں نحو، فقہ اور اصول کی تعلیم میں دلچسپی اور شوق کا اظہار کیا۔

جامعہ ازہر کے اساتذہ پرانی وضع کے لوگ تھے۔ ان کی قدامت پسندی ہر جدت پسند شخص کو بے دین اور ملحد قرار دیتی تھی۔ محمد عبدہ تحصیل علم کے شوق میں سب کچھ گوارا کرتا رہا۔ البتہ اسے جن اسباق کی سمجھ نہ آتی یا جن کتابوں میں دلچسپی پیدا نہ ہوتی ان میں شرکت نہ کرتا اور اگر مجبوراً شریک ہونا پڑتا تو دوران درس میں کوئی اور کتاب پڑھتا رہتا۔

ہر سال موسم گرما کی تعطیلات میں اپنے گاؤں محلہ نصر چلا جاتا۔ حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ شیخ درویش بھی ہر سال وہاں پہنچ جاتا اور اس طرح عبدہٗ کو سال بھر کی پڑھائی کا اعادہ کرنے اور علم و حکمت سیکھنے کا بڑا اچھا موقع مل جاتا اسی طرح اس نے تین برس تک جامعۂ ازہر میں قیام کر کے نصاب کے حصہ اول کی تکمیل کر لی۔

طالب علمی کے زمانے میں محمد عبدہٗ کا میلان زیادہ تر تصوف کی طرف رہا۔ وجہ یہ تھی کہ اس طریقے میں مجاہدہ نفس، ریاضت اور خلوت نشینی کی تعلیم تھی۔ وہ دن بھر روزہ رکھتا اور رات نماز پڑھتے گزر جاتی۔ لوگوں سے میل جول قطعاً نہ تھا۔ ہر وقت خدا کی یاد میں بسر ہوتی۔

پورے سات برس اسی طرح گزر گئے۔ ۱۸۷۱ء کی گرمیوں میں ایک دن شیخ درویش نے محمد عبدہٗ کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ خلوت نشینی کب تک؟ آخر اس علم کا کیا فائدہ جو ملت کے کام نہ آ سکے؟ علم تو مشعل ہدایت ہے اور لوگوں کو اس سے محروم رکھنا بڑا ظلم ہے۔ یہ تو خود پرستی کی انتہا ہے کہ انسان اپنی ذات کی خاطر سب کچھ سیکھے اور ملت کو یکسر فراموش کر دے۔ انسانیت کی طرف سے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ تم لوگوں سے میل جول رکھو۔ انہیں سچائی اور نصیحت کی باتیں بتاؤ اور سیدھی راہ پر چلاؤ۔ محمد عبدہٗ نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے

ہر چند آمادہ کیا' لیکن وہ قدم قدم پر رکتا۔ جب شیخ درویش نے دیکھا کہ نوجوان کی طبیعت میں حجاب ہے تو وہ اسے اپنے ساتھ لوگوں کے پاس لے جاتا۔ مختلف موضوع پر گفتگو ہوتی۔ شیخ درویش اسے اظہار خیالات کے لیے اشارہ کرتا۔ آہستہ آہستہ محمد عبدہٗ کو بولنے اور گفتگو کرنے کا ڈھنگ آ گیا۔ بالآخر ۱۸۷۲ء میں شیخ درویش کے انتقال پر ملال کے بعد محمد عبدہ دوبارہ ازہر واپس جا کر اسباق میں شرکت کرنے لگا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب جامعہ ازہر کا طریقہ تعلیم بالکل فرسودہ ہو چکا تھا۔ استاد پڑھا رہا ہے طالب علم بالکل تہی دامن آتے ہیں اور تہی دامن چلے جاتے ہیں۔ استاد کو معلوم نہیں کہ حالات کا تقاضا کیا ہے، اور زمانہ کس رخ پر جا رہا ہے۔ اس کا سرمایہ علم چند کتابوں اور مخصوص جملوں تک محدود تھا۔ اس کی ساری کائنات علم یہ تھی کہ یہ جملہ درست ہے اور وہ غلط۔ اس مؤلف نے بیجا کہا اور اس نے خطا کی ہے۔ اس سے زیادہ نہ وہ جانتا تھا اور بتا سکتا تھا۔ اسے زندگی کی قدریں معلوم ہی نہ تھیں۔ اس عہد کی تعلیم کا حال محمد عبدہ کی زبانی سے سنیے وہ کہتا ہے کہ:

"زمانہ طالب علمی میں ہم بیٹھے سنا کرتے تھے استاد پڑھا رہا ہوتا تھا۔ میں یہ سمجھا کرتا کہ وہ کسی غیر زبان میں گفتگو کر رہا ہے۔"

سید جمال الدین افغانی کی صحبت میں

مصر کی سب سے بڑی اور قدیم ترین درس گاہ کا یہ حال تھا کہ ۱۸۶۹ء میں سید جمال الدین افغانی پہلی مرتبہ تشریف لائے اور انہوں نے اپنے خاص انداز بیان میں تفسیر قرآن اور تصوف اسلامی پر خیالات ظاہر کیے تو لوگ کارواں در کارواں ان کے ہاں آنے جانے لگے۔ محمد عبدہٗ بھی وہاں پہنچا اور افغانی کے افکار و خیالات سن کر حلقہ تلمذ میں داخل ہو گیا۔ افغانی کا طریق یہ تھا کہ علم اجتماع' فلسفہ' تصوف' تاریخ اور سیاست سے متعلق پرانی عربی کتابوں اور مغربی زبانوں کے انتخابات پڑھ کر سناتا۔ مصری طلبا کے لیے یہ طریقہ بالکل نیا اور اچھوتا تھا۔

سفر استانبول کے بعد افغانی دوبارہ ۱۸۷۱ء میں قاہرہ وارد ہوا۔ اس کی جدت پسند طبیعت نے اصلاح و انقلاب کے نئے ڈھنگ سوچ رکھے تھے۔ قاہرہ پہنچتے ہی علمی محفلیں جمنے لگیں۔ ان مجلسوں میں افغانی نے علم کلام، فقہ، فلسفہ، منطق، سیاسیات اور اخلاقیات کو بالکل جدید طریق اور نئے انداز میں بیان کرنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ازہر یونیورسٹی کے ہونہار طلبا اور روشن خیال اساتذہ ان محفلوں کی رونق بن گئے۔ دوران گفتگو میں افغانی اپنے جدید اجتماعی اور فکری نظریئے تعلیم یافتہ گروہ کے سامنے رکھتا اور دینی اصلاح عقل و فکری کی آزادی دستوری نظام اور اسلامی جمہوریت کے اصول پر دل کھول کر بات کرتا۔

محمد عبدہٗ پہلے ہی شخصی حکومت اور فرسودہ نظام تعلیم کے خلاف باغی ہوچکا تھا۔ افغانی کے انقلابی خیالات اور ترقی پسند رجحانات نے اس کے دل میں آتش عشق وطن اور فروزاں کر دی۔ چنانچہ شمع آزادی کا یہ پروانہ وطن کے جذبات سے سرشار مصر کو غیروں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے مردانہ وار میدان میں کود پڑا۔ اس نے مصریوں کے بڑھتے ہوئے افلاس کو دور کرنے کے لیے وسائل اور ذرائع کی تلاش شروع کر دی۔

فرانسیسی اقتدار نے مصر کو سیاسی و اقتصادی لحاظ سے بالکل کھوکھلا تھا۔ انگریزوں کی ملک گیری کی حرص و آز فرانس کی چبائی ہوئی ہڈیوں کی ریزہ کے لیے ہر روز نیا بہانہ تراشتی تھی۔ مصری عوام ایک نیم بسمل گائے کی طرح برطانوی شیر اور فرانسیسی بھیڑیئے کے پنجوں تلے سسکیاں لے رہے تھے۔ ادھر یونانیوں نے مصری تجارت اور اقتصادیات کی اجارہ داری کی وجہ سے منڈیوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ مصری عوام بالکل مفلس اور قلاش ہو کر رہ گئے۔

افغانی کی تربیت کا محمد عبدہٗ پر یہ اثر ہوا کہ وہ عقل و فکر اور علم و دانش میں اپنے اساتذہ ازہر سے بہت آگے نکل گیا۔ نوخیزی کے باوجود اس کی ذہانت اور فہم و فراست شیوخ ازہر کے لیے بھی قابل رشک بن گئے۔ چنانچہ جب ازہر کا آخری امتحان ہوا تو استادوں کی انتہائی مشکل پسندی کے باوجود محمد عبدہٗ کی حاضر

جوابی اور روشن ضمیری نے انہیں ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

استاد جامعۂ ازہر

حالات نے کروٹ لی۔ محمد عبدہ ازہر یونیورسٹی میں علم اخلاق اور منطق پڑھانے کے لیے استاد مقرر کر دیا گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ جامعہ ازہر میں اخلاقیات کو بطور نصاب شامل کیا گیا۔ ایک طرف تو طلبہ کو علم اخلاق پڑھنے کا موقع مل گیا' دوسری طرف شیخ محمد عبدہ کو ازہر کے طالب علموں سے براہ راست میل جول کا بہانہ ہاتھ آیا۔ بس پھر کیا تھا' شیخ نے خوب رنگ جمایا اور طلبہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

ایک تو مضمون بالکل نیا ہونے کی وجہ سے طلبہ کے لیے بہت زیادہ دلچسپی کا موجب بن گیا۔ دوسرے محمد عبدۂ جیسا روشن خیال استاد۔ اس نے تعلیم و تدریس کے پرانے طریقے چھوڑ کر پڑھانے اور سمجھانے کا بالکل نیا طریق اختیار کیا۔ مضمون کو بڑے عمدہ اور دلچسپ طریق سے طالب علموں کے ذہن نشین کرا دیا جاتا۔ طلبہ کے لیے یہ چیز بالکل نئی تھی۔ شیخ محمد عبدۂ نے طلبہ کے لیے علم و حکمت اور طریقہ تدریس کے نئے دروازے کھول دیئے۔ ان کے دلوں میں ذوق علم اس درجہ پیدا کر دیا کہ وہ راتوں کو جاگتے اور سبقوں کی تیاری اور معلومات کی فراہمی میں منہمک رہتے۔ پرانی کتابوں کے ساتھ مغرب کی جدید ترین تصانیف سے بغیر کسی تامل کے استفادہ کیا جاتا۔ اگر ایک طرف ابن مسکویہ کی کتاب ''تہذیب الاخلاق'' پڑھائی جا رہی ہے تو ساتھ ہی تاریخ تمدن ممالک مغرب کا درس بھی دیا جانے لگا ہے۔

۱۸۷۸ء آخر میں شیخ محمد عبدۂ کو مدرسہ دارالعلوم میں تاریخ کا استاد مقرر کردیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی عربی زبان کی تدریس کے فرائض بھی سونپ دیئے گئے۔ تاریخ کے سبقوں کے لیے شیخ محمد عبدۂ نے مقدمہ ابن خلدون پر لیکچر دینا شروع کیے۔ ابن خلدون کا فلسفہ تاریخ' اصول شہریت اور فلسفہ اجتماع پر خوب سیر حاصل بحث ہوتی۔ لطف یہ کہ موضوع کی جدت کے ساتھ طریقہ تعلیم بالکل نیا

تھا۔ پرانے ڈگر سے ہٹ کر نئے زاویہ نگاہ سے ابن خلدون کے خیالات کا جائزہ لیا اور جدید قدروں سے اس کی رائے کا اندازہ لگایا۔ آسان اور عام فہم زبان میں ربط و تسلسل قائم رکھ کر تقریر کے ذریعے طلبا کو سمجھایا جاتا۔

نظر بندی

شیخ موصوف کی بدولت مصر کے طریقہ تعلیم میں تبدیلی کا آغاز ہوا ہی تھا کہ ۱۸۷۹ء میں خدیو اسمٰعیل کو تخت حکومت سے اتار کر عنان سلطنت اس کے بیٹے توفیق پاشا کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ مصر کے حریت پسند طبقے نے توفیق پاشا سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں ۔ بالخصوص سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ' کو تو اس پر بڑا بھروسہ تھا۔ توفیق پاشا بھی افغانی اور شیخ کو اپنے مخلص ترین خیراندیشوں میں شمار کرتا تھا۔ توفیق پاشا کے سریر آرائے سلطنت ہوتے ہی افغانی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ نمائندہ اسمبلی کو معرض وجود میں لانے کے لیے مناسب قدم اٹھائے اور حکومت کی ذمہ داریاں وزارت جمہوریہ کے سپرد کر کے اسے عوام کے سامنے جواب دہ قرار دے۔ خدا کا کرنا دیکھیے کہ ایک طرف تو عوام وخاص بڑی بڑی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں اور دوسری طرح قدرت ہنس رہی ہے ۔ توفیق پاشا کو اصلاحات کے بارے میں یہ عجلت ناگوار محسوس ہوئی ۔ مزید براں قدامت پسندوں اور اصلاحات کے مخالفوں نے مل کر توفیق پاشا کو خوب اکسایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ افغانی کو تو راتوں رات ملک بدر کر دیا گیا اور محمد عبدہٗ کو مدرسہ دارالعلوم سے برطرف کر کے اس کے گاؤں محلہ نصر میں نظر بند کر دیا گیا۔

میدان صحافت میں

۱۸۸۰ء میں وزیراعظم ریاض پاشا کی کوششوں سے محمد عبدہ' سے تمام پابندیاں اٹھا دی گئیں ۔ قدرت کی نیرنگی دیکھیے کہ حکومت کو اپنے سرکاری جریدہ "الوقائع المصریہ" کی ادارت کے لیے ایک، پختہ کار مدیر کی ضرورت پیش آئی۔ نگاہ انتخاب محمد عبدہ' پر پڑی ۔ محمد عبدہ' نے زمام ادارت سنبھالتے ہی اخبار کی

معنوی اور صوری اصلاحات کی طرف توجہ دی۔ حکومت نے اس کی تمام سفارشات کو قبول کرلیا۔ مدیر اعلیٰ کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے مطلب اور ذوق کے قلم کار، نائب مدیر اور معاون بھرتی کرے۔ ان معاونین میں ہونہار سعد زغلول پاشا کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ شیخ محمد عبدہ اور ان کے جدید معاونین نے اخبار میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ اس اخبار کے ذریعے سیاسی، اجتماعی اور تعلیمی اصلاحات کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ شیخ محمد عبدہ نے ایک عامی سے لے کر حکومت کے بڑے سے بڑے افسر تک ہر طبقہ کے لوگوں پر نکتہ چینی کی۔ اس نے عقل اور نفس کی تربیت پر بڑا زور دیا۔ اس کے علاوہ عربی ادب میں نئے اسلوب تحریر کی بنیاد رکھی۔

جلاوطنی

ادھر محمد عبدہ اور اس کے ساتھی برق رفتاری کے ساتھ اصلاحات کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔ ادھر اعرابی پاشا کی تحریک آزادی ناکام ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا مصر میں انگریزوں کے قدم بڑے مضبوط ہو گئے اور تمام اصلاحی اور انقلابی کوششیں کچھ عرصہ کے لیے معرض التوا میں جا پڑیں۔ حب وطن کے جرم کی پاداش میں شیخ محمد عبدہ کو تین برس کے لیے جلاوطن کر کے شام بھیج دیا گیا۔

سرزمین فرانس میں

بیروت میں رہتے ابھی ایک برس ہی گزرا تھا کہ سید جمال الدین افغانی نے خط کے ذریعے محمد عبدہ کو فرانس آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ۱۸۸۴ء میں وہ اپنے استاد کو ملنے کے لیے پیرس جا پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی استاد و شاگرد نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کر کے اخوت اسلامی کی لڑی میں منسلک اور متحد و مضبوط کرنے کے لیے "جمعیۃ العروۃ الوثقیٰ" قائم کی۔ جمعیت کے مقاصد کی اشاعت و حصول کے لیے "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے ایک اخبار بھی جاری

کیا۔ اس کی اشاعت نے قصرا ستبداد وملوکیت میں تہلکہ مچا دیا۔ انگریز نے اس جریدے کو اپنی سیاست کے لیے برق سوزاں سے کم نہ سمجھا۔

لندن کے سیاسی حلقوں میں

۱۸۸۴ء میں مسٹر ول فوزڈبلنٹ کی دعوت پر شیخ محمد عبدہ' پیرس سے لندن پہنچا اور مشرق کی سیاست پر گفتگو شروع ہوئی۔ شیخ کے لندن پہنچنے پر تمام سیاسی حلقوں نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ہاوس آف لارڈز نے تو بڑی آؤ بھگت کی۔ جب بھی مصری سیاسیات کے بارے میں شیخ سے بات چیت ہوئی تو ہر مرتبہ شیخ نے اس بات پر بڑا زور دیا کہ صلح و سلامتی کی اساس و بنیاد یہ ہے کہ انگریز اپنی فوجوں کو مصر سے واپس بلائے' کیونکہ مصر نے انگریزی اقتدار جتنا ظلم' ناانصافی اور استبداد کبھی نہیں دیکھا۔ ہماری صرف ایک ہی آرزو ہے کہ انگریز ہمارے وطن کو فوراً خالی کر دے۔

واپس مصر میں

جب محمد عبدہ' ۱۸۸۸ء میں وطن واپس آیا تو حکومت نے اسے قاضی مقرر کردیا' مگر اسے عہدۂ قضا سے طبعاً" نفرت تھی اور وہ کہا کرتا تھا کہ مجھے قاضی بننے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ میرا طبعی رجحان تعلیم وتدریس کی طرف ہے اور میں نے معلمی کر کے آزما لیا ہے کہ اس فن میں مجھے کتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ شیخ نے ہر چند چاہا کہ حکومت اسے معلم بنا کر مدرسہ دارالعلوم میں واپس بھیج دے' لیکن حکومت اس بات کے لیے آمادہ نہ ہو سکی۔ کیونکہ حکومت کو شیخ محمد عبدہ' کی طرف سے ہر وقت یہ خدشہ رہتا تھا کہ طلبہ پر اس کے سیاسی اور اجتماعی خیالات کا اثر پڑے گا۔

تعلیمی امور میں دلچسپی

شیخ محمد عبدہ' کو یورپ کی زبانیں سیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جب تک کوئی شخص مغربی زبانیں نہیں جانتا وہ یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے

وطن اور قوم کی خدمت سے پورے طور پر عہدہ برآ ہو گیا ہے۔ شیخ موصوف کی یہ رائے تھی کہ عالم اسلامی کی سیاسی اور اجتماعی مصلحتوں کا مغربی اقوام سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب واقعات یہ ہوں تو پھر ان کی زبانیں جانے بغیر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم بروں کی برائی سے بچ سکیں اور اچھوں کی اچھائی سے فائدہ اٹھا سکیں۔ شیخ موصوف مغربی علوم کا بڑا دلدادہ ہو گیا تھااور بذات خود اس نے مغربی فلسفہ علم الاجتماع، علم الاخلاق ' تاریخ اور تعلیم کا گہرا مطالعہ کیا۔ شیخ نے فرانسیسی زبان بڑے شوق اور انہماک سے سیکھی۔ الگزنڈر ڈوما سے ابتدا کی اور محنت کر کے اتنی مہارت پیدا کر لی کہ بے تھکن پڑھتا اور بولتا۔ مغربی فلسفہ کا مطالعہ فرانسیسی زبان میں کیا اور ہربرٹ سپنسر کی کتاب "تعلیم" کا فرانسیسی زبان سے عربی میں "تربیت" کے نام سے ترجمہ کیا۔

شیخ محمد عبدہ' نے ازہر یونیورسٹی کی اسلاحات کی طرف خاص توجہ دی۔ یہ جامعہ ازہر اپنی امتیازی اور افادی حیثیت' سے بڑی نمایاں درس گاہ ہے۔ شیخ موصوف کا خیال تھا کہ اس کے انتظامات' نصاب تعلیم اور طریق تدریس کی اصلاح سے عالم اسلامی کی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ شیخ فرمایا کرتے تھے کہ قرون وسطیٰ کی لکھی ہوئی کتابیں ہمارے جدید ماحول کے لیے بیکار ہیں۔ ہمارے زمانے کے تقاضے نئے ہیں۔ ہماری زندگی کے مسائل بالکل جدا گانہ ہیں۔ ہماری ضرورتیں ہمارے بزرگوں کی ضرورتوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ہمیں زندگی کی دوڑ میں پیچھے نہیں رہ جانا چاہیئے۔ شیخ محمد عبدہ' کا ارادہ محض دینی نصاب کی تبدیلی کا نہ تھا' بلکہ وہ چاہتا تھا کہ اسلامی علوم کے ساتھ مغربی اور دنیوی علوم کی تعلیم وتدریس کا انتظام کر کے طلبہ کو زندگی کی تگ و دو کے لیے تیار کیا جائے اس نے ترقی اور اصلاح کا سنگ بنیاد تو رکھ دیا' لیکن جامعہ ازہر کے معیار تعلیم کو حسب منشا بلند نہ کر سکا کیونکہ قدامت پسند طبقہ اس کے راستے میں سد سکندری بن گیا تھا۔

منصب عدالت

حکومت مصر کے ایک اعلان کے مطابق ۱۸۹۹ء میں شیخ محمد عبدہ کو دیار مصر کا مفتی مقرر کر دیا گیا۔ اس منصب پر فائز ہوتے ہی مفتی محمد عبدہ نے آزادی رائے اور حسن تدبر کا وہ ثبوت دیا کہ مصر کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاہر ہے۔ سوچ اور فکر کی پرانی راہوں سے ہٹ کر ملکی حالات اور عصری تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے مفتی موصوف نے اسلامی روح اور جدید اجتماعی ضرورتوں میں مناسبت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مفتی محمد عبدہٗ بڑا نڈر اور بے لاگ آدمی تھا۔ قدامت پسندوں کے احتجاج کے باوجود اس نے یہ فتوی صادر کر دیا کہ مسلمان کے لیے اہل کتاب کا پکا ہوا کھانا جائز ہے اور ایک مسلمان غیر مسلم قوموں کا لباس پہن سکتا ہے۔

مفتی عبدہٗ کو اہل وطن کی نظروں سے گرانے کے لیے ہر قسم کا حربہ اختیار کیا گیا۔ اسے کافر ٹھیرایا گیا۔ اس کی نسبت یہ بات مشہور کی گئی کہ وہ محرمات کو حلال سمجھتا ہے اور وہابی و زندیق کا فتوی تو سب سے کم تر اور کند ہتھیار تھا جو مفتی کے خلاف استعمال کیا گیا۔

مجلس شوریٰ کی رکنیت

مصر کی مجلس شوریٰ انگریزی پارلیمنٹ کا ایک ناقص چربہ تھی۔ ۱۸۹۹ء میں مفتی محمد عبدہٗ کو اس مجلس کا رکن نامزد کر دیا گیا۔ جب مفتی عبدہٗ مجلس شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کرنے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ مجلس اور حکومت کے درمیان موجودہ اختلافات ملکی مفاد کے لیے سخت مضر ہیں۔ مفتی نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ان اختلافات کو مٹایا۔ چند ہی نشستوں میں ارکان مجلس کو مفتی کی حکمت و فصاحت' تدبر و سیاست' دلائل و براہین' وسعت معلومات اور روشن ضمیری کا یقین ہو گیا۔ اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ مفتی بڑا نیک طینت' صائب الرائے اور سمجھدار آدمی ہے۔ بس پھر کیا تھا ہر معاملے میں مفتی کی رائے کو تسلیم کیا جانے لگا۔ اور کوئی کام مفتی کے مشورے کے بغیر طے نہ ہونے پاتا۔

اس ضمن میں یہ بات کبھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ مفتی کا مقصد استبدادیت نہ تھا' بلکہ اول سے آخر تک اس کی غرض رائے عامہ کی تربیت رہی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ مصری سیاستدان اور جمہور کو اس بات کی عادت ہو جائے کہ وہ ہر معاملے پر پوری طرح سوچ بچار کر کے صحیح نتیجہ تک پہنچ جائے۔

جذبۂ خدمت خلق

مفتی محمد عبدہ ہر اعتبار سے ایک روشن خیال اور جدت پسند واقع ہوا تھا۔ اس نے ۱۸۹۲ء میں "جمعیت خیریہ اسلامیہ" کی بنیاد رکھی۔ اس جمعیت کی غرض و غایت یہ تھی کہ ملت کے افراد میں روح' اجتماع اور جذبہ تعاون پیدا کر کے انہیں خدمت خلق کے لیے تیار کیا جائے۔ مفتی کا یہ خیال تھا کہ غریبوں' بیکسوں اور مصیبت زدہ انسانوں کے لیے زندہ رہنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ چنانچہ وہ خود سرمایہ داروں اور دولت مندوں کے دروازوں پر جاتا اور مصیبت زدگان کے لیے چندہ فراہم کر کے خدمت خلق کا نمونہ پیش کرتا۔ اس جمعیت نے قومی کارکنوں اور رضا کاروں کی تربیت کے لیے مدرسے اور اسکول قائم کیے جہاں ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ان میں اعتماد نفس پیدا کیا جاتا اور انہیں صنعت و حرفت کے ذریعے روزی کمانے کا ڈھب سکھایا جاتا۔ مصر میں اپنی قسم کی یہ پہلی کوشش تھی' جس کے ذریعے دولت مندوں میں احساس تعاون اور غریبوں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا گیا۔ مسکینوں اور غریبوں سے بے پناہ ہمدردی رکھنے کی وجہ سے عوام الناس میں مفتی کو غریبوں کا باپ کہہ کر یاد کیا جاتا تھا۔

مفتی کے بے شمار شاگردوں میں دو تو خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک تو سیاسی مفکر سعد زغلول پاشا اور دوسرا مذہبی رہنما سید رشید رضا۔

مفتی نے بہت سی علمی' ادبی' رفاہی اور سیاسی انجمنوں کی بنیاد رکھی۔ صف اول کے سیاستدان' ادیب عالم اور فقیہ۔ سب اسی کے مدرسہ فکر کے تربیت یافتہ ہیں اور حق تو یہ ہے کہ مصر جدید کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کی اصلاح اور تجدید تاسیس میں مفتی محمد عبدہ کا ہاتھ نہ ہو۔

مادر وطن کا یہ لائق فرزند گیارہ جولائی ۱۹۰۵ء کو پانچ بجے سہ پہر اس دارفانی سے دارجاودانی کو رخصت ہوا۔

○○○

زعیم مصر: سعید زغلول پاشا

"اس کے ارادوں میں جوش' ہمتوں میں بلندی' عمل میں جنوں' خون میں آگ کی گرمی اور سانس میں شعلوں کی تپش تھی۔ اس کے ہونٹوں پر تبسّم تھا۔ اسے ساری دنیا جوان نظر آتی تھی۔ دنیائے امید اپنی پوری وسعتوں اور پہنائیوں سمیت سعد کے ارادوں کے سامنے سربسجود تھی۔"

شخصیت

سعد زغلول عمر کی ساٹھ بہاریں دیکھ چکا تھا۔ اس کا سر ابھرے ہوئے کندھوں کے درمیان جھک کر رہ گیا تھا۔ جسم میں پہلی سی قوت و توانائی باقی نہ رہی تھی' مگر اس کے ساتھ اس کی آنکھیں روشن اور تابناک تھیں۔ اس کے چہرے سے رعب و جلال ٹپکتا تھا' اس کی شخصیت میں ابھی ہیبت باقی تھی۔ ۱۹۱۹ء کی ایک صبح انگریزی فوج کا ایک مسلح دستہ سعد کے گھر آ پہنچا اور سعد کو موٹر میں بٹھا کر قصر نیل میں لے جا کر نظر بند کر دیا۔ سعد کے لیے یہ کوئی نئی جگہ نہ تھی۔ ایک مرتبہ اس سے پہلے ۱۸۸۲ء میں بھی اس علمبردار آزادی کو اسی مقام میں نظر بند کر دیا گیا' لیکن اس وقت سعد عنفوان شباب میں تھا۔ اس کے ارادوں میں جوش' ہمتوں میں بلندی' عمل میں جنون' خون میں آگ کی گرمی اور سانس میں شعلوں کی تپش تھی۔ اس کے ہونٹوں میں تبسم تھا اسے دنیا جوان نظر آتی تھی۔ دنیائے امید اپنی پوری وسعتوں اور پہنائیوں سمیت سعد کے ارادوں کے سامنے سربسجود تھی مگر جب بوڑھا سعد دوسری مرتبہ قصر نیل کے اندر داخل ہوا تو پھر بھی اس کے چہرے پر رونق اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ خوش تھا کہ اس کے وطن میں سیاسی شعور پیدا ہو چکا ہے اور مصر آزادی کی طرف بڑی تیزی سے قدم

اٹھا رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ دن دور نہیں جب مصر لیلائے آزادی سے ہمکنار ہو کر کے رہے گا۔

اس واقعہ کے بعد زعیم مصر سعد زغلول کوئی آٹھ برس زندہ رہا۔ اس کی کامرانیاں اور ہزیمتیں پورے ملک کی کامرانیوں اور ہزیمتوں کی تاریخ ہیں۔ وہ مصر کی آزادی کا علمبردار تھا۔ سارے کا سارا ملک اپنے محبوب رہنما پر کامل اعتماد اور پورا بھروسا رکھتا تھا۔ وہ مصریوں کا آتش بیاں مقرر اور شعلہ مقال خطیب تھا۔ اس کی آواز میں بادل کی سی گرج اور بجلی کی سی کڑک پائی جاتی تھی۔ جب وہ بولتا سننے والوں پر ہو کا عالم طاری ہو جاتا۔ وہ عزم راسخ کی ایک چٹان تھا۔

تعلیم و تربیت

سعد زغلول ۱۳ نومبر ۱۸۵۹ء کو مصر کے ایک چھوٹے سے قصبہ "ابیانہ" میں پیدا ہوا۔ خالص مصری گھرانے میں پرورش پا کر مصری روایات کا حامل ہوا۔ اس کی شکل و صورت مصری خدوخال کا آئینہ دار ہے۔ سعد نے ایک موقع پر کہا تھا:

> "نہ میں کوئی رئیس زادہ ہوں' نہ کسی بڑے گھرانے کا چشم و چراغ۔ میں تو ایک کسان ہوں' ایک کسان کا بیٹا۔ ایک چھوٹے اور بقول مخالفوں کے ایک حقیر سے گھرانے کا معمولی فرد۔"

سعد نے ابتدائی تعلیم اپنے قصبہ میں حاصل کی اور پانچ برس کی مدت میں لکھنا پڑھنا سیکھنے کے علاوہ قرآن مجید بھی حفظ کر لیا۔
ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد ہونہار سعد نے قاہرہ کا رخ کیا۔ تعلیم جاری رکھنے کے لیے ازہر یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ ازہر کے دوران قیام میں سعد کو مفتی محمد عبدہٗ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ سلسلہ ملاقات بڑے گہرے مراسم میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے افکار و رجحانات کو سمجھنے لگے۔ دونوں کے خیالات میں پرانی روایات اور قدامت پسندی کے خلاف بغاوت کے جراثیم

پرورش پا رہے تھے۔ دونوں کے سینے آتش انقلاب کے دفینے تھے۔ دونوں وطن کی ترقی و بہبودی کے دلدادہ۔ دونوں حب وطن کے پاکیزہ جذبات سے سرشار' الغرض دونوں شمع آزادی کے پروانے تھے۔

جمال الدین افغانی کا اثر

مصر ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ کے درمیانی عرصہ میں سیاسی تحریکوں اور شورشوں کا مرکز بن رہا تھا۔ خفیہ انجمنیں اس کی گود میں پرورش پا رہی تھی۔ سازشیں اور ہنگامے پل کر جوان ہو رہے تھے۔ حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ ۱۸۷۱ء میں جمال الدین افغانی جیسا روشن ضمیر عالم اور مدبر بھی مصر آپہنچا۔ اس نے جوں ہی قاہرہ میں سکونت اختیار کی' لوگوں کے ہجوم اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ افغانی کی جدت پسند طبیعت نے اصلاح و انقلاب کے نئے نئے ڈھنگ سوچ رکھے تھے۔ قاہرہ پہنچتے ہی علمی مجلسیں منعقد ہونے لگیں۔ ان مجلسوں میں افغانی نے علم کلام' فقہ' فلسفہ اور منطق کو بالکل جدید اور نئے انداز میں بیان کرنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ازہر یونیورسٹی کے ہونہار طلبا اور روشن خیال اساتذہ اس کی محفلوں کی رونق بن گئے۔ ان مجلسوں میں بہت سے مسائل پر بحث ہوتی اور افغانی اپنے جدید اجتماعی اور فکری نظریئے تعلیم یافتہ گروہ کے سامنے پیش کرتا۔ عام طور پر اس کی گفتگو کا موضوع دینی اصلاح' عقل و فکر کی آزادی' دستوری نظام اور اسلامی جمہوریت کے اصول ہوا کرتے تھے۔ سعد زغلول اور محمد عبدہؒ بھی اس کے ہاں آتے جاتے اور اس کے انقلابی خیالات اور ترقی پسند رجحانات سے بہرہ مند ہوتے۔ افغانی نے اہل مصر کو یہ پیغام بھی دیا کہ مصر کو غیروں کے تسلط و اقتدار سے آزاد کرایا جائے۔ مصریوں کے بڑھتے ہوئے افلاس اور فاقہ مستی کو روکا جائے۔ استبداد اور جور و ظلم کی حکومت کو ختم کر کے جمہوری نظام کے ذریعے عدل و انصاف قائم کیا جائے۔ ان مقاصد کو کامیاب بنانے کے لیے ترکیبیں سوچی جانے لگیں۔ ذرائع و وسائل کی تلاش و جستجو شروع ہوئی اور بعض لوگوں کے قتل کی سازشیں بھی ہونے لگیں۔

سعد نے اس سیاسی اور فکری ماحول میں تربیت پائی۔ یہی وجہ ہے کہ سعد زندگی کے ہر دور میں سرگرم عمل رہا۔ اس نے ہمیشہ سوچ اور فکر کی نئی نئی راہیں تلاش کیں۔

سیاسی موڑ پر

مصر کی تاریخ میں ۱۸۸۱ء کا سال کئی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مختلف سیاسی تحریکیں پروان چڑھ رہی تھیں۔ فکر و عمل نئے سانچوں میں ڈھل رہے تھے۔ اجتماعی اور اقتصادی گتھیوں کو سمجھنے اور سلجھانے کے لیے نئے وسائل کی طرف میلان ہو رہا تھا۔ ایک طرف ملک نئے دستور کا مطالبہ کر رہا تھا اور دوسری طرف نمائندہ اسمبلی کے قیام کی تحریک زوروں پر تھی۔ قدامت پسند خدیوی حکمران بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لینے اور مصری ذہن کو سمجھنے کی بجائے کبھی ترکوں سے ساز باز کرتا اور کبھی انگریزوں سے جوڑ توڑ اور عہدو پیمان باندھتا تھا۔

صحافی کی حیثیت میں

انہی دنوں مصر کے سرکاری روزنامہ "الوقائع المصریہ" کی عنان ادارت مفتی محمد عبدہٗ کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے سعد کو بھی ادارہ تحریر میں شامل کر لیا۔ سعد کے لیے یہ موقع بڑا غنیمت تھا۔ اس نے اپنے آتش نگار اور شعلہ فشاں قلم کے وہ جوہر دکھائے کہ سیاسی اور ادبی حلقوں میں شور مچ گیا۔

سید جمال الدین افغانی کی صحبت نے ایک طرف تو سعد کو آتش بیان مقرر اور نکتہ رس مدبر بنا دیا تھا اور دوسری طرف وطن کا شیدائی اور شمع آزادی کا پروانہ۔ اسی طرح محمد عبدہٗ کے حلقہ ارادت و ادارت میں شامل ہو کر سعد نے بہت کچھ سیکھا۔ مفتی نے اسے اپنے بچوں کی طرح تعلیم و تربیت دی۔ مذہبی، ادبی اور سیاسی معاملات میں بڑی محبت اور شفقت سے رہنمائی کی۔ عبدہ کی رفاقت اور نگرانی میں سعد کو اپنے ملک کے اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی مسائل کو سمجھنے اور

حل کرنے کا بہترین موقع مل گیا۔ سعد کو بھی مفتی سے کچھ کم عقیدت نہ تھی۔ وہ مفتی کا مرید باصفا تھا۔ جب افغانی کو ۱۸۷۹ء میں مصر چھوڑ جانے پر مجبور کیا گیا تو سعد کے لیے مفتی کا وجود بڑا غنیمت تھا۔ مفتی اس کا روحانی اور سیاسی سہارا تھا' لیکن جب چار برس بعد مفتی کو بھی مصر چھوڑنا پڑا تو سعد کو بڑا رنج و قلق ہوا اور وہ اپنے آپ کو بالکل بے یارو مددگار سمجھنے لگا۔

فرانسیسی تسلط نے مصر کو سیاسی اعتبار سے بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔ انگریزوں کی ہوسناکیاں' فرانس کی چبائی ہوئی ہڈیوں کی ریزہ چینی کے لیے ہر روز نیا بہانہ تراشتی تھیں۔ اور یونانیوں نے مصری تجارت اور اقتصادیات کی پوری اجارہ داری لے رکھی تھی۔ سعد سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے دو راہیں تھیں۔ حکومت کی خوشنودی یا وطن کی خدمت۔ حکومت کی رضاجوئی آسان اور فائدہ مند تھی' وطن کی خدمت مہنگی اور نقصان رساں۔ سعد بڑا دوراندیش اور بلا کا ذہین تھا۔ افغانی کی صحبت نے اس میں سیاسی بصیرت اور فکری رفعت پیدا کر دی تھی۔ اس کی عقابی نگاہ تاڑ گئی کہ ایک طرف حکومت کے غیر اسلامی تقاضے اور چند عارضی فائدے ہیں۔ دوسری جانب خدمت وطن اور مفادات ملت دعوت جہاد دے رہے ہیں۔ نگاہ مرد مومن یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ مصر ایک نیم لبسمل گائے کی طرح ہے جو برطانوی شیر اور فرانسیسی بھیڑیے کے پنجے تلے دم توڑ رہی ہے۔ دونوں اس سسکتی ہوئی گائے کو کھا جانے کی فکر میں ایک دوسرے سے الجھنے کو ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ یونانی گیدڑ بھی اس کے بے حس و حرکت جسم کو بڑی تیزی سے نوچ رہا ہے۔

ذہنی انقلاب

سعد کی غیرت ملی جوش میں آئی۔ وہ مرد حق بین تھا' حق گوئی سے کس طرح باز رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اخبار **الوقائع المصریہ** میں شوری اور استبداد کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ لکھنا شروع کیا اور اس طرح جمہوری نظام حکومت کی داغ بیل ڈالنے کے لیے میدان ہموار کرنے لگا۔ اس ضمن میں اس

نے اسلامی جمہوریت کے اصول بڑی وضاحت اور جرات سے بیان کیے اور حکمران گروہ کو بے باکی سے سمجھایا کہ حاکم وقت کے لیے ملت کے ارادوں اور منشا کو ماننا نہایت ضروری ہے اور ملت کے ارادوں کو جاننے کا واحد طریق نمائندہ اسمبلی کا قیام ہے۔ یہ تھا وہ طریق کار جسے سعد نے مادی انقلاب سے پہلے ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیے اختیار کیا تا کہ کسی آنے والے بڑے حادثے کے لیے طبیعتیں پہلے سے ہی تیار اور آمادہ رہیں۔

مصر میں انگریزی فوجوں کا داخلہ

تاریخ مصر نے ایک اور ورق الٹا: اعرابی پاشا کی تحریک انقلاب ناکام ہو گئی۔ توفیق خدیوی بڑا ہوشیار حکمران تھا۔ اس نے نزاکت وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں کا سہارا ڈھونڈھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ادھر انگریز کا نصیب جاگ اٹھا۔ اس کی پرانی آرزو بر آئی۔ انگریزی فوجوں کو مصر میں داخل ہونے کا بہانہ مل گیا۔

منصب عدالت

۱۸۸۲ء میں سعد کو جیرہ کی عدالت میں ناظر کا عہدہ تفویض ہو چکا تھا۔ ادھر ملک میں اعرابی پاشا کی سیاسی ہزیمت کا انتقامی جذبہ جنون کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ نوجوانان مصر اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ جن غداران وطن کی وجہ سے تحریک اعرابی ناکام ہوئی ہے ان سے انتقام لیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک خفیہ انجمن بنائی گئی جس کا نام "جمعیۃ انتقام" تجویز ہوا۔ اس جمعیت سے وابستگی کے الزام میں سعد زغلول کو قصر نیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو سعد کو بری قرار دے کر رہا کر دیا گیا' مگر اس کے باوجود توفیق پاشا کی حکومت کو یہ گوارا نہ تھا کہ سعد جیسا آزادی پسند انسان اس عہدے پر مامور رہے۔ چنانچہ اسے ۱۸۸۳ء میں عہدۂ نظارت سے سبکدوش کر دیا گیا۔

وکالت کا پیشہ

سعد چوبیس برس کا نوجوان تھا۔ اس کے ارادے بلند تھے۔ جسم میں توانائی اور ذہن میں صفائی تھی۔ ملازمت سے سبکدوش ہوتے ہی وکالت کا پیشہ اختیار کر کے مصر کی تاریخ میں اپنے لیے ایک بلند مقام حاصل کر لیا۔ اس زمانے میں وکالت چنداں منفعت بخش، جاذب نظر اور معزز پیشہ نہ سمجھا جاتا تھا۔ وکیلوں کا کام محض کج بحثی اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا تھا۔ عدالتیں اپنے آپ کو کسی قانون کا پابند سمجھنے کے لیے قطعاً تیار نہ تھیں۔ سعد نے اپنی محنت، قانونی قابلیت اور زور بیان سے وکالت کو چار چاند لگا دیئے۔ اپنے لیے شہرت دوام اور قبول عام حاصل کر لیا۔ دوسری جانب عدالتوں کے غرور و نخوت کو توڑا اور قانون کے سامنے ان کا سر جھکا کر چھوڑا۔ سعد کے الفاظ میں ایک جادو تھا۔ قانونی موشگافیوں اور فن بحث میں مہارت کی داد اپنے پرائے سب دینے لگے۔ سعد کی حاضر جوابی، قوت فیصلہ، آزادی ضمیر اور گفتگو کی اصابت رائے نے تھوڑے ہی عرصہ میں وکالت کو ایک معزز اور قابل قدر پیشہ بنا دیا۔

مصر کا قاضی

اب سعد کی سالانہ آمدنی چھ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ نڈر اور بے باک تو تھا ہی ججوں اور قاضیوں کے لیے مصیبت بن گیا۔ بعض دفعہ عدالتوں سے اتنی سخت نوک جھونک ہوتی کہ سننے والے دنگ رہ جاتے۔ سعد بھی ہٹ کا اتنا پکا اور قانون کا اتنا ماہر تھا کہ عدالتوں کو مانے بغیر نہ بنتی۔ اس کی قانونی قابلیت کا اتنا چرچا ہوا کہ حکومت نے ۱۸۹۲ء میں سعد کو مصر کا قاضی مقرر کر دیا۔ اب جج کی حیثیت میں بھی سعد کی محنت اور لیاقت مخالفوں سے بھی خراج تحسین وصول کرنے لگی۔ اس کے فیصلے بطور سند پیش ہوتے۔ اس کے قانونی نکات اور توضیحات کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ سعد کا قانونی ذوق ملاحظہ ہو کہ چالیس برس کی عمر میں جدید آئین اور بین الاقوامی قانون سیکھنے کا شوق چرایا۔ پیرس جا کر

فرانسیسی زبان سیکھی اور ازسرنو قانون پڑھ کر امتیازی درجہ حاصل کیا۔

وزیر تعلیم

سعد زغلول کی انقلاب پسند طبیعت ایوان وزارت میں بھی کارفرما نظر آتی ہے۔ جب ۱۹۰۷ء میں سعد زغلول وزیر تعلیم مقرر ہوا تو وزارتی روایات کو جمہوریت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وزیروں کو یہ جرأت کہاں کہ خدیو مصر سے کوئی حق بات کہہ سکیں۔ سعد نے قلمدان وزارت سنبھالتے ہی دوسرے وزیروں پر جمہوری رنگ چڑھانا شروع کیا۔ انہیں آزادی ضمیر اور حریت رائے کا درس دیا۔ اس کی بلند آواز اور زور خطابت سے ایوان وزارت گونجنے لگا۔ اس کے جدید افکار اور ترقی پسند خیالات نے وزیروں کی آنکھوں سے قدامت پسندی کے پردے اٹھا دیئے اور ان کے لیے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دیں۔

جب سعد نے وزارت تعلیم کی باگ، ڈور ہاتھ میں لی' تو مصطفیٰ کامل پاشا کی تحریک زوروں پر تھی۔ شوریدہ سری اور بے راہ روی طلبا پر سوار تھی۔ سکولوں اور کالجوں کا نظم و نسق درہم برہم ہو چکا تھا۔ سعد نے اپنی ہر دلعزیزی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طلبا پر اثر ڈالنا شروع کیا اور حکمت عملی سے کام لے کر تعلیمی اداروں کے نظم و نسق کو پھر سے قائم کر دیا۔

وزیر تعلیم کو ایک اور اہم مسئلہ در پیش تھا۔ سعد کے عہد وزارت سے پہلے مصر میں بہت سے مضامین انگریزی زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔ بالخصوص اعلیٰ فنی علوم۔ یہ حالات اور عربی زبان کی کسمپرسی دیکھ کر سعد کی رگ حمیت پھڑک اٹھی اور اس کا مصری خون جوش میں آگیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ عربی زبان کے دامن کو تمام علوم و فنون سے اس طرح مالا مال کر دیا جائے کہ پھر کسی استاد اور طالب علم کو عربی زبان کی تنگی داماں کا گلہ کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ اس سلسلے میں سعد کا شاندار کارنامہ یہ ہے، کہ اس نے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے ترجموں اور تصنیفات و تالیفات، کے انبار لگا دیے اور عربی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا۔

سعد کا ایک عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے عہد وزارت میں مصری طلبا کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں بھیجنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند برسوں میں مصر کے تعلیمی اداروں اور ذمہ دار عہدوں اور محکموں میں مغرب کے فارغ التحصیل لوگ برسر اقتدار نظر آنے لگے۔ اس جدید تعلیم یافتہ گروہ نے مصریوں کے عادات و اخلاق اور مزاج و میلان کو نئے سانچوں میں کچھ اس طرح ڈھالا کہ مصری تعلیم ثقافت اور معاشرت کے اعتبار سے دنیا کے مہذب ممالک کی صف اول میں شامل ہو گیا۔

جمعیت تشریعی کی رکنیت

"جمعیت تشریعی" پارلیمنٹ کا ایک ناقص تجربہ تھی۔ اس جمعیت کو بہت سے حقوق حاصل تھے۔ اور بالخصوص ٹیکسوں کے معاملے میں رائے دینے کا حق بہت ہی اہم تھا۔ لیکن حکومت کے طرز عمل اور ارکان جمعیت کی سرد مہری اور جمود نے ان تمام حقوق کو گلدستۂ طاق نسیان بنا رکھا تھا۔ سعد نے جمعیت کا رکن منتخب ہوتے ہی اس کے حقوق و فرائض کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ارکان کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا حکومت کی غفلت شعاریوں اور جمعیت کی کوتاہیوں کا پردہ چاک کر دیا۔ سعد کی کوششوں سے جمعیت میں ایک حرکت پیدا ہو گئی۔ اب سعد کی قانونی قابلیت کے اعتراف میں اسے وزیر قانون و عدالت مقرر کیا جاچکا تھا۔ اب ۱۹۱۳ء میں نئی مجلس آئین ساز معرض وجود میں آئی تو سعد اس کا نائب صدر منتخب ہوا۔

نظر بندی

پہلی جنگ عظیم اپنی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کے ساتھ نمودار ہوئی۔ مصری عوام اور بالخصوص کسان اس کے بوجھ تلے بری طرح دب گئے۔ عسکری قانون کی سختیوں کے پیش نظر تمام قومی تحریکیں ملتوی کر دی گئیں۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں اس مصری قائد کی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ حریت وطن کے جذبات

سے سرشار سعد مصر کی ایک تحریک آزادی کا علمبردار بن گیا۔ مصر سے انگریزوں کے نکل جانے کا مطالبہ کرنا ہی تھا کہ ایوان حکومت میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ تحریک آزادی کو کچلنے کے مشورے ہونے لگے۔ ۲۷ برس تک بے لوث خدمت کرنے کے بعد وطن دوستی اور انگریز دشمنی کی پاداش میں بوڑھے سعد کو ۱۹۱۹ء میں پھر ایک مرتبہ ساحل نیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہاں سے مالٹا جانے کا حکم ملا۔ مصریوں نے زبردست احتجاج اور مظاہرے کیے تو نظربندوں کو اجازت مل گئی کہ وہ مالٹا سے پیرس پہنچیں اور حلیف حکومتوں کی مجلس کے سامنے اپنا دفتر شکایت کھولیں۔ سعد اپنے ساتھیوں سمیت پیرس پہنچا تو سیاسی حالات بالکل ناسازگار ہو چکے تھے۔

آزادی اور جلاوطنی

انگریز دیکھ چکا تھا کہ مصری عوام کے جذبات سے کھیلنا آگ اور خون سے کھیلنا ہے۔ انگریز مدبروں نے ہر چند منصوبہ بازی کی، لیکن کوئی صورت بنتی نظر نہ آئی۔ بالآخر وہ وطن دوستوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ سعد اپنے رفیقوں سمیت وطن پہنچا۔ تحریک حریت پہلے سے بھی زیادہ زوروں پر تھی۔ آزادی کا مطالبہ پیش کرنے کے لیے سعد کی قیادت میں "وفد پارٹی" بنائی گئی۔ ادھر مصر کے عوام کی آواز کے سامنے انگریز کو جھکنا پڑا۔ مصری حکومت کے نمائندوں کے درمیان اختلاف کم ہونے کی بجائے اور زیادہ ہو گئے۔ انگریز نے از سر نو جبر واستبداد کی روش اختیار کی۔ سعد اور اس کے چند ساتھیوں کو جلا وطن کر دیا گیا۔ ملک میں بے چینی اور بڑھ گئی۔ مجبوراً جلا وطنوں کو واپس مصر بھیجنا پڑا۔ اس وقت مصری کی وزارت کی قیادت ثروت پاشا کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے ایک مجلس دستور ساز قائم کر دی تاکہ ملکی دستور کا مسودہ تیار کیا جائے۔

سعد مصر واپس آیا تو نئے دستور کی بنا پر انتخابات شروع ہونے والے تھے۔ وفد پارٹی کو انتخابات میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ سعد کو ملکی دستور کی اصلاح کا موقع مل گیا۔ ۱۹۲۴ء میں سعد نے انگریزوں سے سمجھوتے کی گفتگو کے

لیے تیاری شروع کی۔ جب سعد لندن پہنچا تو مسٹر میکڈانلڈ کی وزارت نئے انتخابات کی تیاریوں میں مصروف تھی اس لیے یہ گفتگو نہ ہو سکی۔ جب سعد واپس آیا تو کئی ایک ناخوشگوار سیاسی واقعات پیش آ گئے جن کی وجہ سے مصری تحریک آزادی کو زبردست دھکا لگا۔

مصر کا یہ ہردلعزیز رہنما ۲۴ اگست ۱۹۲۷ء کو اس جہان فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوا۔

سعد خوبیوں کا مرقع تھا۔ اقلیم سیاست کا تاجدار' میدان صحافت کا شہسوار اور فن خطابت میں نازش روزگار تھا۔ تدبر و حکمت اس کے غلام تھے۔ خلیق اور متواضع اتنا کہ سخت ترین مخالف بھی سعد سے مل کر ہمیشہ کے لیے اس کے اخلاق کا گرویدہ ہوجاتا تھا۔ پرانی وضع کے لوگ اس پر ناز کیا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ قدیم تعلیم نے سعد جیسا بلند ہمت اور بالغ نظر محب وطن پیدا کیا ہے۔ بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود سعد کو انگریزی اور جرمن زبان سیکھنے اور پڑھنے کا بہت شوق تھا اور ان کے مطالعہ کے لیے وقت ضرور نکالتا تھا۔

سعد کی زندگی کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ وطن کے مفاد کی خاطر وہ ہر قوم کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھانے کے لیے ہر وقت تیار نظر آتا ہے۔ جب تک ملکی اور قومی مفاد وابستہ ہے۔ وہ دشمنوں کا بھی دوست ہے' لیکن جونہی ملک کا مفاد خطرے میں نظر آیا۔ سعد کی دوستی اور تعاون سب ختم۔ لارڈ کرومر جیسا انگریز مدبر ۱۹۰۶ میں اپنے ایک سیاسی مکتوب، میں سعد کے تعاون اور دوستی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں اسے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں' لیکن بعد میں یہی سعد انگریز مدبروں کی نظر میں خار بن کر کھٹکنے لگا۔

اسے عورتوں کی عزت و حرمت اور قدرو منزلت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ ایک دفعہ سعد ایک طالب علم کو تحصیل علم کے لیے یورپ بھیجنا چاہتا تھا۔ اسے ملاقات کے لیے بلا بھیجا۔ دوران گفتگو میں اسے معلوم ہوا کہ طالب علم شادی شدہ ہے۔ پوچھا میاں خود تو یورپ جا رہے ہو۔ بیوی کا کیا انتظام کیا ہے؟ اس نے

نہایت سادگی سے جواب دیا کہ اسے طلاق دے دی ہے۔ سعد کو اس بے ہودگی اور غیر ذمہ داری پر بڑا غصہ آیا۔ صنف نازک کے ساتھ یہ سلوک اتنا ناگوارا گزرا کہ اس کا سفر یورپ منسوخ کر دیا۔

ازدواجی زندگی اور بیوی سے متعلق سعد کا ایک خاص زاویہ نگاہ تھا۔ اس نے خود عمر بھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کیا۔ مشہور مصری وزیر مصطفیٰ فہمی پاشا کی بیٹی سے شادی کی، جو صفیہ زغلول کہلائی اور مصریوں کی محترمہ "بی اماں" کے لقب سے مشہور ہوئی اور مرتے دم تک اس وفاداری کو بڑی استواری سے نبھایا۔

○○○

قاسم بک امین: آزادئ خواتینِ مصر کا پیغامبر

انیسویں صدی عیسوی کی مصری عورت اپنی جہالت اور توہم پرستی کی وجہ سے انسانیت کے حسین چہرے پر ایک بدنما داغ تھی، لیکن قاسم امین کی کوششوں سے آج مصری خاتون انسانی شرافت و تابندگی کی حامل ہے۔ دنیا کے متمدن اور مہذّب ترین ملکوں کے مقابلے پر مصری عورت آج کسی اعتبار سے پیچھے نہیں ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں وہ مردوں کے برابر کی شریک اور ساتھی ہے۔ اس کا علم و ہنر، عقل و دانش، زندگی کی تگ و دو، دین و سیاست میں ذوق و دلچسپی، انسانی معاشرے کی اصلاح کا جذبہ، خدمت خلق کا شوق، غرضیکہ خاتون مصر ہر اعتبار سے قابل رشک اور لائق تعریف ہے۔ مصری صنف نازک کی آزادی اور بیداری کا تمام سہرا قاسم امین کے سر ہے۔

قاسم کا خاندان

قاسم امین آستانہ کے اونچے طبقے کے ایک خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کا باپ امین بک کردوں کے معزز اور مشہور سرداروں میں شمار ہوتا تھا۔ جب حکومت ترکیہ اور کردوں میں اختلاف رونما ہوا تو قاسم امین کے والد کو نظربند کر دیا گیا۔ بعد ازاں وہ اسمٰعیل پاشا کے عہد حکومت میں مصر آ پہنچا اور مصری فوج میں شامل ہو کر اوج ترقی پر جا پہنچا۔ امین بک نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد ابراہیم پاشا خطاب کے بھائی احمد بک خطاب کی لڑکی سے نکاح کر لیا۔ مصری خواتین میں بیداری پیدا کرنے والا قاسم امین ان کا بڑا لڑکا ہے جو ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوا۔

بچپن اور تحصیل علم

قاسم امین کی زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ معزز طبقے کے بڑے بڑے رئیسوں کے بچوں کی طرح قاسم کا بچپن شروع ہوا اور اس کی تعلیم و تربیت مصر کے سرکاری مدارس میں ہوئی۔ ابتدا ہی سے قاسم بڑا ذہین' سمجھ دار اور ہونہار طالب علم تھا۔ جب تعلیم سے فارغ ہوا تو حکومت مصر نے وظیفہ دے کر علم کے لیے فرانس بھیج دیا۔ وہاں قاسم نے قانون میں اعلیٰ سند حاصل کی۔ جب ۱۸۸۵ء میں فرانس سے وطن واپس آیا تو حکومت نے قاضی مقرر کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے وہ حکومت کا قانونی مشیر اعلیٰ بن گیا۔ دوران ملازمت قاسم نے بڑی تندہی اور محنت سے کام کیا۔ اپنے پرائے سب اس کی دیانتداری' حریت فکر اور آزادی رائے کا اعتراف کرنے لگے۔

زمانۂ طالب علمی سے قاسم شرم و حیا کا پیکر ہونے کی وجہ سے بڑا ممتاز تھا۔ جب پروان چڑھا تو یہ وصف عزت نفس پیدا کرنے میں بڑا ممد و معاون ثابت ہوا۔ پس پھر کیا تھا عزت و آبرو کا جنون ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتا۔ زندگی بھر اس نے رائے کی آزادی کو نہیں کھویا اور حسن اتفاق کی کرشمہ سازی کہئے' کہ کبھی اسے ذلت و توہین سے دوچار نہ ہونا پڑا۔ اس کردار کا لازمی اور نفسیاتی نتیجہ یہ ہوا کہ قاسم نے ضمیر کی آزادی اور فکر و خیال کی حریت کو ہر قیمت پر قائم رکھا۔

تحریک آزادی کا پس منظر

۱۸۹۲ء میں "دوق دارکور" نے ایک کتاب بعنوان "المصریون" فرانس سے شائع کی۔ اس کتاب میں مصری عورتوں' مردوں' بچوں اور بوڑھوں کو خوب ہی رگیدا اور ہر قسم کی اخلاقی اور اجتماعی برائیاں ان کی طرف منسوب کیں۔ مصر کے لوگ اس کتاب کی وجہ سے بڑے آتش زیرپا ہوئے۔ قاسم امین بھی ملکی تعصب کی بنا پر اپنے دوسرے معاصرین کی طرح بہت برفروختہ ہوا۔ چونکہ بڑا حساس تھا' اس لیے اس نے فوراً" جواب لکھنا شروع کر دیا چنانچہ چند مہینوں میں قاسم نے فرانسیسی زبان میں دوق دارکور کی کتاب کی

تردید لکھ کر اپنی ذہنی تسکین کا سامان مہیا کر لیا' مگر وہ فرانس میں رہ چکا تھا اور انقلابات کی وجہ سے فرانس کے لوگوں میں نمایاں تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ ان لوگوں کے ذہن و دماغ بہت زیادہ ترقی یافتہ ہو چکے تھے۔ اس فرانسیسی ماحول کا یہ اثر ہوا کہ قاسم کو فرانسیسی کی تلخ نوائی میں کچھ حقیقتیں مضمر نظر آنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاسم اپنی اس تردیدی کتاب میں ایک مقام پر مصری عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہو گیا:

"یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ مصری عورتیں تعلیم سے بالکل کوری ہیں۔ تربیت اولاد اور مفاد وطن کے پیش نظر تعلیم نہایت لازمی ہے۔ ہماری خواتین کو زیور تعلیم سے آراستہ ہونا چاہئے' کیونکہ اس کے بغیر حقیقی تربیت کے اہم فرض سے عہدہ برا ہونا قطعاً" غیر ممکن ہے اور صحیح تربیت کی عدم موجودگی میں وطن کا مستقبل روشن نہیں ہو سکتا۔"

ساتھ ہی اس نے یہ اعتراف بھی کیا کہ مشرقی عورت مغربی عورت کی نسبت بہت پس ماندہ ہے' لیکن اس کی ذمہ داری مذہب اسلام یا مصری رسم و رواج پر عائد نہیں کی جا سکتی۔ اس انحطاط کا باعث محض جہالت ہے اور تہذیب کا فقدان۔

تحریک بیداری کا پہلا دور

بعد میں قاسم امین کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ تردید لکھ کر اس نے ایک دفاعی کاروائی تو کر دی ہے' لیکن مصری خواتین کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ ابھی تک بالکل تشنۂ تکمیل ہے' چنانچہ دو برسوں تک وہ اس پہلو پر غور و فکر کرتا رہا اور جو کچھ مختلف اہل فکر نے عورتوں کی تعلیم' اصلاح اور آزادی کے بارے میں لکھا تھا اسے پڑھتا رہا۔

چنانچہ ۱۸۹۹ء میں قاسم نے آزادی نسواں کے موضوع پر "تحریر المرأۃ" کے نام سے ایک معرکہ آرا کتاب لکھی۔ یہ کتاب مصر کی اجتماعی اور سماجی تاریخ میں سنگ میل کا حکم رکھتی ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں مصنف نے صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی امیدوں اور آرزوؤں کو بہت جلد پورا ہوتے دیکھنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ میرا نظریہ تو یہ ہے کہ تحریکیں

آہستہ آہستہ بنتی ہیں۔ تبدیلی اور انقلاب امتوں اور قوموں میں یکایک پیدا نہیں ہوا کرتا۔ اس کے لیے بہت انتظار کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اصلاح اور بیداری کے دروازے پر دستک دے دی ہے اور میں یقین رکھتا ہوں کہ مجموعی حیثیت سے امت پر اس آواز کا گہرا اثر پڑے گا۔ میں نے یہ کام اصلاح اور بھلائی کی خاطر شروع کیا ہے۔ اگر نیک نیتی کے باوجود مجھ سے غلطی سرزد ہوئی ہے تو میں معافی کا خواستگار ہوں اور اگر میں اپنی رائے میں راستی اور سچائی پر ہوں' جیسا کہ مجھے یقین ہے تو پھر طلبا اور حق پرستوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے قول و عمل سے میرے خیالات کی تائید کریں۔"

قاسم امین نے کتاب کا ایک چوتھائی حصہ پردہ کے رواج کی نذر کردیا ہے۔ خواتین مصر میں پردہ کے موضوع پر بڑی شرح وبسط سے بحث کرتے ہوئے ایک مقام پر وہ رقمطراز ہے: "اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ عورت کی تعلیم و تربیت اور درس و تدریس کی تکمیل گھر کی چار دیواری کے اندر ہو سکتی ہے' حالانکہ یہ خیال بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ عورت اپنا پردہ اور برقع برقرار رکھ کر مردوں کے مقابلے پر تعلیم و تحقیق کے میدان میں پوری کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ پردہ عورت کو ایک تنگ دائرے میں قید کر دیتا ہے اور کائنات کو دیکھنے' سننے اور جاننے سے یکسر محروم رکھتا ہے۔ عالم حیات میں فکر و عمل اور دیگر علمی تحریکات تک براہ راست اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی چیز اس بیچاری تک پہنچتی بھی ہے تو محرّف اور مسخ شدہ صورت میں۔ جب تک وہ زندگی کے تمام کاروبار میں برابر کی شریک ہو کر ذاتی میل جول اور مشاہدہ و تجربہ سے کائنات کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ نہ کرے اور کانوں سے نہ سنے' اس وقت تک وہ علوم و معارف سے پوری آگاہی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔"

اس طرح قاسم امین نے نکاح اور طلاق کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے حکومت مصر کو مشورہ دیا کہ وہ اس ضمن میں بھی کچھ پابندیاں عائد کردے تاکہ ایک مرد بہت سی بیویاں کر کے ان کی زندگی اجیرن نہ کردے اور طلاق اتنی آسان اور

ی نہ رہ جائے۔

تحریک کا ردعمل

قاسم امین کی کتاب "تحریر المرأۃ" نے ملک میں اتنی زبردست ہلچل پیدا کر دی کہ کم و بیش ایک برس تک مصری عوام اور علما تمام سیاسی اور اجتماعی مسائل کو فراموش کر کے اسی کتاب پیچھے پڑ گئے اور یہ وقت کا اہم ترین مسئلہ بن گیا۔ روزناموں اور ماہناموں میں قاسم امین پر خوب لے دے ہونے لگی۔ اس کے خیالات و افکار کی پرزور تردید کی گئی۔ اس کے اخلاق کو معرض بحث میں لایا گیا۔ اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا گیا۔ بعض انتہا پسند حامیان پردہ نے اس کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کر کے پردہ کی حمایت و ترویج کے لئے خاص ماہنامے جاری کیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ارباب، اختیار اور ارکان حکومت نے بھی قاسم امین سے بیزاری کا اظہار کیا اور خدیو عباس نے اسے دینی' ادبی اور اخلاقی مجرم قرار دے کر اس سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔

اس تمام شور و غل اور احتجاج و مخالفت کے باوجود ہوا وہی کچھ جو قاسم امین نے کہا اور جس کی طرف اس نے جمہور کو دعوت دی تھی' بلکہ بقول ڈاکٹر محمد حسین ہیکل اگر آج قاسم امین دنیا میں واپس آ کر خواتین مصر کو دیکھے تو وہ اپنی دعوت سے دست بردار ہو جائے۔ ڈاکٹر ہیکل کا یہ کہنا ہے کہ قاسم کا وہ مقصد نہ تھا جو کچھ کہ ہو رہا ہے۔ وہ تو عورتوں کو گھر کی چاردیواری سے نکال کر ملک و ملت کے لیے مفید بنانے کی خاطر انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتا تھا اور بس۔

بہر حال قاسم امین اپنی دعوت میں بالآخر کامیاب ہو گیا۔ اس کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ ہر معاملے میں بڑی چھان بین کرتا۔ ہر چیز کا مخالف اور موافق پہلو دیکھتا۔ رائے قائم کرنے سے پہلے اچھی طرح غور و فکر کر لیتا تھا۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ یہ طریق کار درست ہے اور وطن و قوم کی نجات اسی طریق پر کاربند ہونے میں مضمر ہے تو پھر اس چیز کو یقین محکم کے ساتھ جمہور کے سامنے رکھتا۔ چنانچہ اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی کتاب "تحریر المراۃ" کے دیباچے میں لکھتا ہے:

"میں جس حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھا رہا ہوں' میں اس پر ایک مدت سے غور و فکر کر رہا تھا۔ میں نے اس کے ہر پہلو اور گوشے پر سوچ بچار کیا۔ مختلف زاویوں سے اس کی خوبیوں اور برائیوں کا ناقدانہ نظر سے جائزہ لیا۔ اب میرا یقین محکم بلکہ ایمان کامل بن گیا ہے۔ میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اس سوچ اور فکر کے نتیجے کو جمہور کے سامنے لایا جائے۔"

قاسم امین اس وصف کی وجہ سے مصر بھر میں ممتاز ہو گیا۔

تحریک کا دوسرا دور

ادھر شور و شر کا یہ عالم ہے اور ادھر مصری عورتوں کی آزادی و حرمت کا علمبردار بڑے سکون اور اطمینان سے اپنی منزل کی طرف قدم اٹھائے چلا جا رہا ہے۔ اس کی تگ و دو میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ وہ اپنی کوششوں میں پہلے سے زیادہ انہماک اور محنت کے ساتھ مصروف ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء میں قاسم امین نے دوسری کتاب جدید عورت کے موضوع پر "المرأۃ الجدیدۃ" کے عنوان سے شائع کر دی۔ اس کتاب کو اپنے دوست زعیم مصر سعد زغلول کے نام سے منسوب کیا' انتساب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"اپنے دوست سعد زغلول کے نام

"میں نے تیرے پہلو میں چاہنے والا دل' سوچنے والی عقل اور کر گزرنے والا عزم و ارادہ پایا۔

"تو نے مودت کا پیکر بن کر میری جانب محبت کا ہاتھ بڑھایا۔ میں نے محسوس کیا کہ ساری زندگی محرومی و بدبختی کی زندگی نہیں ہے' بلکہ زندگی میں کچھ شیریں لمحات اور میٹھی رسیلی گھڑیاں بھی ہیں' مگر اس شخص کے لیے جو ان کی قدر و قیمت پہچانے۔

جب یہی محبت و الفت میاں بیوی میں ہو تو اس سے زیادہ شیریں اور پر لطف وقت میسر نہیں آ سکتا۔

"خوش بختی اور سعادت و مسرت کا یہی وہ بھید ہے جو میں اپنے ہم وطن مردوں

اور عورتوں کو بتانا چاہتا ہوں۔"

قاسم امین نے "المراۃ الجدیدۃ" میں مخالفوں کے تمام اعتراضات کو پیش نظر رکھ کر اپنے دلائل و براہین زیادہ وضاحت اور بے باکی سے قلبند کیے۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ پردہ علوم و معارف کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اب کی مرتبہ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور صاف صاف کہہ دیا کہ پردہ بربریت اور وحشت کے زمانے کی یادگار ہے۔ اس نے بتایا کہ جس طرح سیاہ فام آدمی گورے چٹے انسانوں کا غلام نہیں رہ سکتا۔ بالکل اسی طرح عورت حجاب اور پردے کے اندر نہیں رہ سکتی۔ ایک اور مقام پر وہ لکھتا کہ محض پڑھنا لکھنا سیکھ لینے اور اجنبی زبانیں جان لینے سے عورت کی عقلی تربیت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ عورت علم طبعیات، علم تاریخ اور علم الاجتماع سے بھی بہرہ ور ہو۔"

اس سلسلے میں قاسم امین نے خواتین مصر کو دعوت دی کہ وہ مغربی تہذیب و تمدن کو اپنا کر اہل مغرب کے طریق پر گامزن ہوں، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ مغربی اقوام تمدن میں دوسری قوموں سے بہت آگے ہیں۔ قاسم امین کی یہ بھی رائے تھی کہ جب عورت عقلی تربیت میں پختہ کار ہو جائے تو پھر اسے فکر و عمل کی پوری آزادی دینی چاہیے۔

قاسم امین کو اس بات کا یقین کامل تھا کہ مصریوں کی نجات اور ترقی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت مغربی انداز پر کریں۔

قاسم امین کی دوسری کتاب کا بھی وہ وہی حشر ہوا جو پہلی کا ہوا تھا۔ مصر کے ہر گوشے سے اس کی مخالفت میں آواز بلند کی گئی۔ پرانی وضع کے حامیوں نے دل کھول کر تعلیم نسواں کی مخالفت کی۔ طلاق، کثرت ازدواج اور پردے کے موضوع پر خوب مضامین لکھے، لیکن قاسم امین ٹس سے مس نہ ہوا۔

اصلاحی کوششوں کا دائرہ عمل

قاسم امین کا اجتماعی و اصلاحی پروگرام عورت کو جہالت اور پردے سے نجات دلانے تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ یہ تو ایک معمولی سی کڑی تھی اس بڑے سلسلے کی جو سماجی

اصلاح سے متعلق قاسم امین کے ذہن میں موجود تھا۔ ۱۹۰۶ء میں قاسم امین اور سعد زغلول نے مل کر ایک جدید یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالنے کی تیاری کی۔ اس کی خواہش تھی کہ اس نئی جامعہ کو مغربی یونیورسٹیوں کے انداز پر چلایا جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ یونیورسٹی ملک کے علم و ادب' اخلاق و اطوار اور عام زندگی میں انقلاب عظیم کا پیش خیمہ ثابت ہو' مگر افسوس کہ موت نے اسے مہلت نہ دی اور جامعہ مصریہ کے قیام سے صرف چند ماہ بیشتر اسے دنیا کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑا۔

نئی یونیورسٹی کا مقصد

جب قاسم امین جامعہ مصریہ کی تاسیس و تعمیر کے تمام انتظامات مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تو ایک تقریب میں حسن پاشا زاید کے مکان پر یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے دوران تقریر کہا:

"ہمارے آباؤ اجداد نے مقدور بھر وطن کی خدمت سرانجام دی۔ وہ قوموں سے نبرد آزما ہوئے۔ انہوں نے ملکوں کی تسخیر کی' لیکن ہم نے کبھی نہیں سنا کہ ان بزرگوں نے حب وطن پر غرور نخوت کا اظہار کیا۔ ہمیں بھی چاہئے کہ ان کے نقش قدم پر چل کر باتوں سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے حب وطن کا ثبوت دیں۔"

"ہمیں ایسے علم کی ضرورت ہے نہیں جسے سرکاری ملازمتوں کا ذریعہ سمجھا جائے۔ ہمیں ایسے طالب علموں کی ضرورت ہے جو علم و فن کی تحصیل محض علم و فن کی خاطر کریں۔ ان کے دلوں میں علم کی حقیقی محبت جاگزیں ہو۔ انہیں ایجاد اور اکتشاف کا شوق بے چین رکھے۔ مغربی ممالک کی طرح وہ علوم و فنون اور فلسفۂ و سائنس میں یکتائے روزگار قرار دیئے جائیں۔ ہماری یہ آرزو ہے کہ علم کے ہر شعبے میں ہمارے ہاں کم از کم ایک دو ایسے بلند پایہ فاضل اور عالم ہوں جن کے الفاظ قطعی سمجھے جائیں۔۔ جن کی بات اپنے خاص شعبے میں آخری فیصلہ کی حیثیت رکھتی ہو۔ تمام دنیا کی نگاہیں ان کی جنبش لب کی منتظر

رہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس نئی یونیورسٹی کے ذریعے اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ایک عمدہ نمونہ پیش کر کے اپنے ملک کے وقار و عزت اور شہرت و نیک نامی کو چار چاند لگا دیں۔"

ترقی پسند رجحانات

قاسم امین اس بات کا بڑا خواہش مند تھا کہ عربی زبان کو اور زیادہ ہر دلعزیز بنانے کے لیے اس میں آسانی اور سہولت پیدا کر دی جائے۔ اس بارے میں اس کی رائے یہ تھی کہ عربی زبان پر صدیاں گزر چکی ہیں، مگر اس میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ یہ اپنی جگہ پر جامد ہے۔ اس نے ترقی کی جانب ایک قدم بھی تو نہیں اٹھایا۔ اس کے مقابلے پر یورپ کی زبانوں نے بڑی تبدیلیاں قبول ہیں اور جوں جوں مغربی زبانوں کے ادیب اور عالم ترقی کرتے چلے گئے ہیں، وہ زبانیں بھی آگے کی جانب قدم اٹھاتی چلی گئیں۔ آج وہ زبانیں سہولت، وضاحت، بانکپن اور تیزی و پھرتی کے اعتبار سے بہترین نمونہ تصور کی جاتی ہیں۔ آج ان زبانوں کو تمدن حاضر کے تاج کا سب سے زیادہ گرانقدر موتی شمار کیا جاتا ہے۔ قاسم امین کی آرزو تھی کہ عربی زبان کو آسان بنا دیا جائے۔ اس ضمن میں اس کی تجویز یہ تھی کہ الفاظ کے اعراب یعنی آخری آوازیں نظر انداز کر دی جائیں اور فقرے کا آخری حرف ساکن قرار دے کر بغیر کسی زبر، زیر، پیش کے پڑھا جائے، جیسا کہ دوسری زبانوں میں رواج ہے۔

وہ ادب میں بھی تبدیلی اور انقلاب پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ادیب عمدہ خیالات، جدید تعبیریں، نئی قدریں اور نئے اسلوب نگارش تلاش کریں۔

نیا فکر و ادب

حقیقت یہ ہے کہ قاسم امین کی دونوں کتابیں صرف عورتوں کی تعلیم و تربیت اور آزادی و حریت تک ہی محدود نہ تھیں، بلکہ ان میں ایک ایسے فکر و ادب کی طرف دعوت موجود ہے۔ جس سے مصری لوگ پہلے بالکل نا آشنا تھے۔ ان کتابوں میں سرزمین نیل کے

باشندوں کو مغربی رومانیت سے پہلی مرتبہ روشناس کرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی طبیعت کے نازک تریں احساسات' میلانات اور خیالات کی تحلیل پیش کی گئی ہے اور قلب انسانی کی وارداتوں کا نئے علوم کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔

قاسم امین نے اپنی کتابوں میں زندگی کو محبت و رحمت اور صلح و سلامتی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے نزدیک حیات انسانی میں محبت سے زیادہ حسین و جمیل اور کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان زندگی کے حسن و جمال' خوبصورتی اور رعنائی سے پوری طرح بہرہ مند ہو۔

قاسم امین کا خیال ہے کہ حسن و جمال اپنی رعنائیوں سمیت عورت کی ذات میں مجسمہ بن کر سمایا گیا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ موسیقی' مصوری' بت تراشی اور فنون جمیلہ کے دوسرے شعبے سب کے سب اسے بڑے محبوب ہیں اور اس کے نزدیک ان تمام فنون کا سرچشمہ عورت کی ذات ہے۔

قاسم امین کے نزدیک مال زندگی کی زینت ہے اور محبت زندگی۔ وہ محبت کو انسانی زندگی کی روحانی غذا قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان زندگی کے کسی دور میں بھی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ عشق و محبت انسان کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیتا ہے۔

وہ کہا کرتا تھا کہ صنفی اختلاف اور تقاضوں سے قطع نظر مرد اور عورت میں کوئی دوجاتی فرق اور فضیلت نہیں۔ وہ دیانت داری سے محسوس کرتا ہے کہ عورت کا حسن و جمال انسانی سعادت اور بھلائی کا موجب ہے۔ اس کے خیال میں محبت اس گہرے احساس کا نام ہے جو ایک نفس انسانی پر غالب آکر دوسرے نفس سے میل جول پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ محبت ایسی آگ ہے جو انسان کے دل میں فروزاں ہو جاتی ہے۔ نہ تو کوئی فاصلہ اور بعد اسے بجھا سکتا ہے اور نہ قرب و نزدیکی اس کو ٹھنڈا کر سکتی ہے' بلکہ آتش عشق ہر آن زیادہ بھڑکتی ہے۔ محبوبہ کی آنکھوں پر ایک نگاہ غلط انداز دل کو خوشی و مسرت سے بھر دیتی ہے اور اسے یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ اس کی راہ میں پھول بچھے ہوئے ہیں۔

یا یہ کہ وہ بادلوں یا پرندوں پر سوار ہو کر آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر رہا ہے۔ قاسم امین سمجھتا تھا کہ عورت کو جہالت اور پردے سے نجات دلا کر انسانیت کی سعادت و خوش نصیبی اور بھلائی کا صحیح طور پر موجب بنا دیا جائے' کیونکہ اس کی رائے میں عورت انسانیت کا دل ہے۔ یہ درست ہو جائے تو ساری انسانیت درست ہو جاتی ہے اور مہذب و شائستہ اور تعلیم یافتہ عورت ہی ملت کی بیداری اور تبدیلی میں ممد معاون ہو سکتی ہے۔

کرسئ عدالت پر

چھوٹا قد' چوڑا چکلا جسم' گندمی رنگ' قاسم امین بڑا کم گو' راست گفتار' نڈر اور بے باک آدمی تھا۔ ہر وقت سوچ و بچار میں منہمک رہتا۔ قانون پر بڑی وسیع نظر تھی۔ فلسفۂ اجتماع کا خوب مطالعہ کر چکا تھا۔ وہ اپنے غور و فکر کی وجہ سے محکمہ عدالت میں بھی خاص شہرت رکھتا تھا۔ فیصلہ سنانے سے پہلے ہر معاملے کا قانونی پہلو دیکھتا۔ حالات کا پورا جائزہ لیتا۔ قاسم امین کہا کرتا تھا کہ گناہ اور جرم کی اصلاح کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے کہ مجرم کو معاف کر دیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ برائی کی سزا نہیں ہونی چاہئے' کیونکہ اس طرح برائی کم نہیں ہوتی' بلکہ بڑھتی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ سزا سے مراد انتقام نہیں' بلکہ سزا کا مقصد اصلاح ہے۔ وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتا کہ دونوں فریق عدالت کا فیصلہ سننے کے بجائے آپس میں انصاف اور عدل کا ترازو ہاتھ میں لے کر صلح کر لیں۔

طلبائے رومانیہ کا وفد

اپریل ۱۹۰۸ء میں رومانیہ کے طالب علموں کا ایک وفد مصر پہنچا۔ اس وفد میں کچھ لڑکے تھے اور کچھ لڑکیاں۔ قاسم نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ۲۱ اپریل ۱۹۰۸ء کو ایک تقریر کے دوران میں رومانیہ کے طلبا کے علمی سفر کو بڑا سراہا۔ انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے اس بات کی آرزو ظاہر کی خوش نصیبی کا یہ دن ہمارے ملک کے حصہ میں بھی بہت جلد آئے۔ جب کہ نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکیاں ایک ساتھ بیٹھ کر علم کی تحصیل کریں۔" آج جس طرح آپ دوش بدوش بیٹھے اس اجتماع کی رونق بنے ہوئے ہیں۔ خدا

کرے کہ اسی طرح مصری طالبات بھی مصری طلبا کے ساتھ بیٹھ کر علمی و ادبی محفلوں میں شرکت کریں۔

وفات

مصر کا یہ ہونہار محنتی فرزند چوالیس برس کی عمر میں ۲۳ اپریل ۱۹۰۸ء کو یکایک حرکت قلب بند ہو جانے سے راہی ملک بقا ہوا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قاسم امین بڑا مخلص، وطن دوست اور قوم پرست تھا۔ مصر کی اجتماعی اصلاح کے لیے اس کی کوششیں کبھی نظر انداز نہیں کی جائیں گی۔ (تاہم اس حقیقت کو فراموش کرنا بھی ناانصافی ہوگی، کہ اس کے خیالات پر مغرب اور اس کی آزادی کا بڑا اثر تھا۔ اگر وہ مصری عورت کو محض تعلیم، جدید تہذیب و تمدن اپنانے کی دعوت دیتا، تو اس میں کوئی حرج نہ تھا۔ اس نے اپنی کتابوں میں مصری عورتوں کو گھر سے نکلنے، کھلے بندوں پھرنے اور حجاب و پردے کو مکمل طور پر چھوڑنے کی جو دعوت دی، اس نے اس کی ذات کو متنازع فیہ بنا دیا ہے۔ مصری عورت کی موجودہ آزاد روی میں قاسم امین بک نے جو کردار ادا کیا، وہ ہمیشہ محل نظر رہا ہے اور رہے گا...... مرتب)

مصطفیٰ کامل پاشا: تحریکِ آزادی کا علمبردار

ملکوں اور قوموں کے زمانہ غلامی اور بالخصوص تحریک حریت کے دوران میں عوامی لیڈروں کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ مخلص اور نیک دل لیڈر قوموں کی قسمت بنا دیتے ہیں۔ ان کے کارنامے تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جاتے ہیں۔ مصر کی اس سے بڑھ کر اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے کہ اسے مصطفیٰ کامل جیسا مخلص اور پرجوش سیاسی رہنما اور عوامی لیڈر میسر آیا' جس نے اپنی زندگی استخلاص وطن کے لیے وقف کر دی۔ جس کی زندگی کا مقصد وحید صرف یہ تھا کہ مادر وطن کو دشمنوں کے پنجے سے نجات دلائے۔

مصر پر انگریزی تسلط قائم ہوتے ہی غیر ملکی اقتدار کے خلاف اضطراب و ہیجان کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ جس نے وطن دوست عناصر کو یکجا کرنا شروع کر دیا۔ اس جماعت نے مفاد وطن کی حفاظت کا ذمہ لیا' مگر ایک وقت آیا کہ یہ تحریک مدہم پڑ گئی اور مفکرین کی سرگرمیاں وطنیت کی شاہراہ سے ہٹ کر اور پگڈنڈیوں پر مرکوز ہو گئیں۔ مصطفیٰ کامل نے اس تحریک کو دوبارہ زندہ کیا۔ مصر کی تحریک، آزادی میں عوامی لیڈر کی حیثیت سے مصطفیٰ کامل پاشا کو جو بلند مقام حاصل ہوا وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔ اگر وہ عالم شباب میں اس دنیا کو خیرباد نہ کہہ جاتا تو اسے دنیا کی عظیم ترین شخصیتوں میں شمار کیا جاتا۔

تعلیم و تربیت

مصطفیٰ کامل ۱۴ اگست ۱۸۷۴ء کو بمقام قاہرہ ایک خالص مصری گھرانے میں پیدا ہوا۔ چھ برس کی عمر میں مدرسے بھیج دیا گیا۔ ابھی بارہ برس کی عمر کو پہنچا تھا کہ والد کا سایہ

سر سے اٹھ گیا۔ بچپن ہی سے ذہانت اور ہوشمندی کے آثار ہویدا تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ امتحانات میں اول رہ کر انعامات پائے۔ حریت فکر اور قوت بیان کی وجہ سے بڑا نام پیدا کیا۔ اس زمانے میں علی مبارک پاشا وزیر تعلیم تھا۔ جب اس نے ہونہار مصطفیٰ کامل کی فصاحت و بلاغت' طلاقت' لسان' قوت بیان اور آزادی افکار دیکھی تو کہہ اٹھا کہ یہ بچہ اپنے عہد کا امرؤ القیس ہو گا۔ اور وقت کا بہت بڑا انسان ٹھہرے گا۔

۱۸۸۹ء میں کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر مدرسۂ حقوق یعنی لاء کالج میں قانون کی تحصیل کے لیے داخل ہو گیا۔ قانون پڑھنے اور سیکھنے کا اتنا شوق دامنگیر ہوا کہ ساتھ ہی ایک فرانسیسی قانونی ادارے کے سبقوں میں شامل ہونے لگا۔ بعد ازاں فرانس کے شہر طولوز میں جا کر قانون میں اعلیٰ سند حاصل کی۔ اس وقت مصطفیٰ کامل کی عمر انیس برس کی تھی۔

آزادی کی پہلی مہم

حسن اتفاق کہیئے کہ مصطفیٰ کامل کو فرانسیسی اساتذہ سے قانون پڑھنے کا موقع ملا۔ ان دونوں فرانسیسیوں کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت و حقارت اور غیظ و غضب کا ایک طوفان موجزن تھا۔ مصطفیٰ ہر وقت انگریزوں کی برائی اور مذمت سنتا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جب فرانس سے امتحان پاس کر کے وطن واپس آیا تو اس نے مصر کو انگریزی اقتدار سے نجات دلانے کی مہم شروع کر دی۔ وطن دوست اخبارات میں مضامین کے ذریعے عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا۔ مختلف کتابیں لکھ کر آزادی و حریت کا پیغام مصریوں کے کانوں تک پہنچایا اور غیر ملکی تسلط و اقتدار کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کیا۔ ان کتابوں میں ڈرامہ فتح اندلس' حیات الامم اور المسئلۃ الشرقیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مصطفیٰ کامل کا یہ طریقہ بڑا مؤثر ثابت ہوا۔ مصر کا پڑھا لکھا طبقہ' بالخصوص سکولوں اور کالجوں کے طالب علم اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ جب مصطفیٰ نے دیکھا کہ اس کی آواز خاطر خواہ نتائج پیدا کر رہی ہے' تو اس نے تحریک کو اور زیادہ کامیاب اور

ہر دلعزیز بنانے کے لیے ایک ماہنامہ "مدرسہ" کے نام سے جاری کیا۔ اب مصطفیٰ کامل کو اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کے لیے بڑا اچھا موقع مل گیا۔

آزادی کا مطالبہ

۱۸۹۳ء کے اوائل میں مصطفیٰ نے پہلی مرتبہ مصری حکومت کی بداعمالیوں اور کوتاہیوں پر کڑی تنقید کرتے ہوئے انگریزوں سے مصر خالی کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ مطالبہ انگریزی سیاست کے لیے برق سوزاں تصور کیا گیا۔ یہ مطالبہ سن کر انگلستان کے سیاسی حلقوں میں کہرام مچ گیا۔

انہی دنوں فرانسیسی مبصر دنوکل (DENOKELE) مصر میں وارد ہوا۔ مصطفیٰ کامل کو اس سے ملنے کا اتفاق ہوا اس کی دعوت پر مصطفیٰ کامل ۱۸۹۳ء کے آخر میں پیرس پہنچا۔ وہاں سیاست دانوں اور صحافیوں سے ملاقات ہوئی۔ فرانس کی آزادی پسند فضا مصطفیٰ کو بڑی پسند آئی۔ چندے وہیں قیام رہا۔ ۱۸۹۴ء کے شروع میں پیرس یونیورسٹی میں مقیم مصری طلبا کے ایک اجتماع میں مصطفیٰ کامل نے دل کھول کر آزادی مصر کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا اور پھر ایک مرتبہ اس مطالبہ کو دہرایا کہ انگریز مصر کو خالی کر دیں۔

پہلا عوامی لیڈر

پیرس سے واپسی کے بعد مصطفیٰ کامل کے لیے پیشہ وکالت کی کشش ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک شعلہ مقال خطیب اور آتش بیان مقرر بن کر میدان سیاست میں اترا۔ عام جلسوں میں بڑی دھواں دھار تقریریں کرنے لگا۔ گھر گھر اس کے چرچے ہونے لگے۔ مصری عوام بڑی بھاری تعداد میں مصطفیٰ کامل کے ساتھ ہو لیے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ خالص وطنیت کے نام پر جمہور اتنی کثرت کے ساتھ ایک جھنڈے تلے جمع ہوئے ہوں۔ بعض لوگوں نے مصطفیٰ کے خیالات کو دیوانے کی بڑ قرار دیا، لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ شمع آزادی کا یہ پروانہ استخلاص وطن کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے چکا تھا۔

فرانس سے سازباز

مصطفیٰ کامل کی جرات و ہمت کی داد دیں، چاہیئے کہ ابھی عمر کی اکیس منزلیں بھی طے نہ ہونے پائی تھیں کہ اس نے اپنی سیاسی مجبوریوں کے پیش نظر پھر ایک مرتبہ پیرس کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر فرانسیسی پارلیمان سے تحریری التجا کی کہ وہ مصر کی آزادی کے معاملے میں وطن دوست عناصر کی اعانت کر کے انگریزوں کو نکالنے میں معین و مددگار ہو۔ فرانس اس بارے میں کیا امداد دے سکتا تھا۔ وہاں اخلاص تو تھا نہیں۔ فرانس کو مصر سے کوئی ہمدردی اور دوستی نہ تھی۔ وہاں تو بغض انگریز کا جذبہ کارفرما تھا اور وہ بھی اس حد تک کہ مصر سے انگریز نکل جائے تاکہ پھر فرانس کو وہاں سیاسی اقتدار حاصل ہو سکے۔
مصطفیٰ کامل کے اس سفر پیرس کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ آزادی مصر کا مسئلہ بین الاقوامی صورت اختیار کرنے لگا۔ آزادی مصر کی آواز فرانسیسی اخبارات کے ذریعے یورپ اور امریکہ تک پہنچی۔ انگلستان کے مدبروں کو ہوش آیا۔ اور گلیڈسٹون جیسے لوگ بھی مصر کے مطالبہ آزادی اور اخراج انگریز کو درست تسلیم کرنے لگے۔

اخبار اللّواء کا اجرا

اب مصطفیٰ کامل اس مقام پر پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنے سیاسی افکار کی ترجمانی اور نشرو اشاعت کے لیے ایک مستقل روزنامہ جاری کرے۔ چنانچہ ۱۸۹۹ء میں اس نے روزنامۂ اللّواء شائع کر دیا۔

بساطِ سیاست

قدرت کی کرشمہ سازیاں ملاحظہ ہوں کہ فرانس، انگلستان اور آسٹریا کے سیاستدانوں نے اپنے مفاد کی خاطر مراکش، تیونس، طرابلس اور مصر کے بارے میں سمجھوتہ کر لیا۔ مصطفیٰ کامل کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس کی پانچ چھ سال کی جدوجہد خاک میں مل گئی۔ مصطفیٰ کامل کو فرانس سے یا کسی اور حکومت سے کچھ توقع تھی تو اس کا مقصد محض اسی قدر تھا کہ یورپ کی کوئی حکومت بالخصوص فرانس اس کے

وطن عزیز کو انگریزوں کے چنگل سے چھٹکارا دلا سکے۔ جب فرانس سے امیدیں منقطع ہو گئیں تو مصطفےٰ کامل نے ترکی کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا' مگر وہاں بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

ادھر بساط سیاست کے مہرے اتنی تیزی سے بدل رہے تھے' ادھر لارڈ کروٗمر جیسا گرگ باراں دیدہ مصطفےٰ کامل کی تحریک آزادی کو بدنام کرنے کے درپے تھا۔ اس نے یورپ میں دوگنا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ ایک جانب تو اس نے یہ کہہ کر مصطفےٰ کامل کی تحریک کو غیر دلعزیز بنانے' بلکہ بدنام کرنے کی کوشش کی کہ تحریک آزادی مصر خالص اسلامی تعصب کی بنا پر جاری کی گئی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ عیسائیت کو پھر اسلام سے ٹکرا کر مصر کے مفادات کو نقصان پہنچایا جائے اور دوسری جانب یہ مشہور کر دیا کہ مصطفےٰ کامل کی تحریک آزادی دراصل غیر ملکیوں کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ درپردہ مقصود یہ تھا کہ ممالک یورپ کی ہمدردیاں حاصل کر کے آزادی مصر کو معرض التوا میں ڈال دیا جائے' حالانکہ مصطفےٰ کامل کا ذریعہ نگاہ خالص وطنی تھا اور یہی وجہ اختلاف تھی اس کے اور مفتی محمد عبدہٗ کے گروہ کے درمیان۔ مفتی موصوف کا نقطہ نظر دینی تھا۔ اس کے برخلاف مصطفےٰ کامل کو وطنیت کے علاوہ اور کسی چیز سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اگرچہ بعض واقعات سے گمان ہوتا ہے کہ مصطفےٰ کامل بھی مذہبی ریاست یا دینی تفوق کا حامی تھا' مثلاً" فرنس سے مایوس ہو کر ترکی سے تعاون اور میل جول یا بالفاظ دیگر اسلامی بلاک بنا کر اسلامزم کا تخیل' مگر اس سلسلے میں ڈاکٹر حسین ہیکل مدیر "السیاسۃ" کی رائے بڑی وقیع معلوم ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ محض اس لیے تھا کہ کسی نہ کسی صورت بیرونی دباؤ اور امداد کے ذریعے مصر کو انگریزوں کے اقتدار سے نجات دلائی جائے۔

حالات کے پیش نظر کامل نے مناسب سمجھا کہ اپنے خیالات اور مطالبۂ آزادی مصر کی معقولیت کو یورپ کے باشندوں تک براہ راست پہنچایا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اخبار "اللواء" کو بیک وقت تین زبانوں عربی' انگریزی اور فرانسیسی میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ یورپ اپنی سیاسی چالوں کے باوجود عوام کو مصری رہنما کے

افکار اور جمہور کے مطالبہ آزادی سے بے خبر نہ رکھ سکا۔ مصطفیٰ کامل کی آتشیں تحریروں کی یورپ میں دھوم مچ گئی اور مغربی ممالک میں مطالبہ آزادی مصر اور مصطفیٰ کامل دونوں ہم معنے اور مترادف قرار پائے۔

اس کے علاوہ مصطفیٰ نے ایک جماعت "حزب وطنی" کے نام سے قائم کی اس جماعت نے اخبارات جاری کیے۔ اخبارات کے استحکام کی خاطر امداد باہمی کے طریق پر کاروباری ادارے بنا کر وطنی اخبارات کی پشت پناہی کی گئی۔

سیرت و کردار

درمیانہ قد' گندمی رنگ' مضبوط جسم' مصطفیٰ کامل مغربی لباس کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنا کرتا تھا۔ لمبی لمبی مونچھیں بڑی زیب دیتی تھی۔ مصطفیٰ بڑا دلیر اور نڈر انسان تھا۔ خود اعتمادی کے ساتھ دیانت داری بدرجہ غایت پائی جاتی تھی۔ بڑا تیز مزاج آدمی تھا۔ ہر وقت سیماب کی طرح بے چین و مضطرب رہتا۔ قوت بیان کے علاوہ حافظہ بھی بے نظیر پایا تھا۔ ارادے کا بڑا پکا' دشمنوں کے خلاف بڑا سخت اور شدت پسند واقع ہوا تھا۔ بلند ہمتی نے اس کی کئی کمزوریوں پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ تقریر کرتا تو ایسے معلوم ہوتا کہ بجلی کڑک رہی ہے یا سیلاب کا پانی بلندی سے پستی کی طرف بہہ رہا ہے۔ آزادی وطن کے مقابلے پر تمام دنیا اس کے سامنے ہیچ تھی۔ آزادی کی جدوجہد نے اسے اتنی فرصت بھی نہ دی تھی کہ وہ کوئی رفیقہ حیات تلاش کر سکے۔ وہ عمر بھر تنہا رہا۔

فرانس کی حریت پسندی سے متاثر ہو کر وطن آزادی کے لیے مسلسل تیرہ برس کوشاں رہا۔ اور اس عرصے میں انفرادی جدوجہد سے وہ کچھ کر دکھایا کہ قومیں اور جماعتیں بھی اتنی قلیل مدت میں اتنا عظیم الشان کام سرانجام نہ دے سکیں۔ اس نے مصری نوجوانوں کے دلوں میں حب وطن آزادی مصر کی ایسی آگ سلگا دی' جسے دنیا کی کوئی طاقت بجھا نہ سکی۔

وفات

۱۰ فروری ۱۹۰۸ء کو طویل علالت کے بعد مصطفیٰ کامل کی روح قفس عنصری سے ملائے اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔ اس عوامی لیڈر کی موت کی خبر اطراف و جوانب میں آن واحد میں پھیل گئی بس پھر کیا تھا تمام ملک میں صف ماتم بچھ گئی۔ ہر شخص مغموم اور مصیبت زدہ نظر آنے لگا۔ ہزاروں انسانوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔

مصطفیٰ کامل کے اخلاص' شرافت' امانت اور نیک دلی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ جب اس مرد حق پرست نے آخرت کے لیے رخت سفر باندھا تو گھر میں اتنی رقم بھی نہ تھی کہ کفن خریدا جا سکے۔

○○○

ڈاکٹر طٰہٰ حسین: مصر کا مشہور ادیب و نقّاد

شخصیت

زعیم المجددین ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو مصر میں ترقی پسند ادب کا بانی اور تنقید جدید کا قائد کہنا چاہیے۔ اس نے عربی ادب میں نئے انداز فکر و نظر کی داغ بیل ڈالی۔ عربوں کو ایسے نئے خیالات سے روشناس کیا۔ جو پرانی طرز کے ادیبوں کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتے تھے۔ اس نے مغربی طرز کے ڈرامے لکھ کر عربی ادب کو مالا مال کر دیا۔ اگر وہ تاریخ پر قلم اٹھاتا ہے تو واقعات و حالات کا جائزہ لینے کے لیے مغربی پیمانے استعمال کرتا ہے اور تنقید نگاری میں نقادان مغرب کی قدروں سے جانچ پڑتال کر کے اپنی زبان کو ترقی کے زینوں پر لے جانے کا خواہشمند نظر آتا ہے۔ وہ جمہور کی زبان میں اس عمدگی اور خوبصورتی سے لکھتا ہے کہ خواص اور علما بھی چٹخارے لے لے کر پڑھتے اور سر دھنتے ہیں۔

طٰہٰ حسین ادیب بھی ہے اور عالم بھی۔ جس طرح دنیا کے لیے ادیب کا وجود ضروری ہے۔ اسی طرح ادیب کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے دامن کو علم کے جواہر ریزوں سے بھر لے۔ پھر علم و ادب کو اس طرح سموئے کہ پڑھنے والے ایک ہی وقت میں علم و ادب کی دولت سے بہرہ ور ہو سکیں۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی معلومات کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ جامعہ ازہر اور جامعۂ مصریہ کی تعلیم و تربیت نے عربی علوم و آداب میں بڑا رسوخ پیدا کر دیا تھا۔ فرانسیسی زبان نے تنقید جدید' نازک خیالی اور جدت فکر و نظر بخشی۔ اس کے ساتھ لاطینی اور یونانی زبانوں نے تہذیب و ثقافت کے چہرے سے کچھ اس طرح پردے اٹھا دیئے کہ مغرب کا جدید و قدیم فلسفہ اور ثقافت اپنے پھیلاؤ اور وسعت کے باوجود اس کی نظروں

میں سما گئے۔

کلیت

طٰہٰ حسین ۱۸۸۹ء میں مصر کے شہر مغاغہ میں پیدا ہوا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ اس کی پیدائش ۱۸۹۱ء میں ہوئی۔ بہرحال ابھی عمر کی دو ہی بہاریں دیکھنی نصیب ہوئی تھیں کہ بیماری نے آنکھوں سے محروم کر دیا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو قرآن حفظ کرنے کے لیے اپنے علاقہ کے مکتب میں بھیج دیا گیا۔ چنانچہ چند برسوں میں حفظ قرآن سے فارغ ہو گیا۔

بچپن

اس کا بچپن بھی عجیب طرح گزرا۔ گھر کے ماحول پر توہم پرستی غالب تھی، جس نے بھوت پریت اور جنات کی دنیا آباد کر رکھی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ یہ نابینا لڑکا جنّ بھوت کے خوف کا شکار ہو کر رہ گیا۔ بعض اوقات رات کے وقت اتنا خوفناک ہول طاری ہو جاتا کہ بے چارہ نیند تک سے محروم ہو جاتا[۱]

ایک دفعہ لڑکپن میں دستر خوان پر بیٹھا باپ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ والد نے آداب طعام کے بارے میں ٹوک دیا۔ بس پھر کیا تھا' طٰہٰ حسین بگڑ گیا۔ چند دنوں کے بعد والد نے سمجھا بجھا کر منا لیا' لیکن طبیعت میں حجاب سا پیدا ہو گیا اور برابر پچیس برس کی عمر تک کھانا الگ کمرے میں اکیلا کھاتا رہا۔ اس ٹوکنے کا نفسیاتی اثر اتنا گہرا ہوا کہ جب پہلی مرتبہ سفر یورپ اختیار کیا تو حجاب و شرم کے مارے جہاز کے کھانے والے کمرے کی طرف جانا تک گوارا نہ تھا۔ کھانا اپنے کمرے میں منگوا کر کھاتا رہا۔ جب بیاہ ہوا تو بیگم صاحبہ کے طفیل اس تنہائی سے رہائی ملی۔

بچپن میں قصے کہانیاں سننے کا بڑا شوق تھا۔ لڑائیوں اور جنگوں کے حالات' انبیا اور صالحین کے قصے' نیز پند و نصیحت کی باتیں بڑے شوق اور دل جمعی سے سنتا[۲]

گھر کا ماحول

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں مصری عورت کی یہ

خصوصیت تھی کہ اسے چپ بیٹھنا نہ آتا تھا۔ جب وہ تنہا ہوتی اور باتیں کرنے کے لیے اسے کوئی شخص نظر نہ آتا تو پھر راگ چھیڑ دیتی۔ خوشی و مسرت کے عالم میں خوب ہی گاتی اور اگر کبیدہ خاطر اور غم زدہ ہوتی تو مرثیہ گوئی کرتی۔ ویسے تو مشرقی ممالک میں عورتوں کے لیے غم کی حالت طاری کر لینا بالکل معمولی بات ہے' لیکن مصری صنف نازک کو اس بارے میں بالخصوص ید طولیٰ حاصل تھا۔ وہ خلوت میں اپنے مردوں اور غم و اندوہ کو یاد کر کے خوب روتی اور مرثیے پڑھتی۔ طٰہٰ حسین کی خوش قسمتی ملاحظہ ہو کہ اس ضمن میں اسے اپنی بہنوں کے پاس بیٹھ کر راگ گانے سننے کا بہت موقع ملا۔ اگرچہ بعض اوقات راگ بے معنی ہونے کی وجہ الٹا بگڑ جاتا' البتہ ماں کی زبان سے مرثیے سن کر بڑا متاثر ہوتا۔ اس طرح طٰہٰ حسین کو بچپن میں بہت سے گانے اور مرثیے زبانی یاد ہو گئے تھے۔

سماج کے خلاف بغاوت

مصر میں یہ رواج تھا کہ جب بچہ قرآن حفظ کر لیتا تو اسے احترام کے طور پر شیخ کے لقب سے پکارا جاتا۔ طٰہٰ حسین نے قرآن مجید تو نو برس کی عمر سے پہلے ہی حفظ کر لیا تھا۔ جب اسے بھی شیخ کہہ کر پکارا جانے لگا تو اسے یہ خیال ہوا کہ میں تو ایک معصوم بچہ ہوں۔ اور اپنے پرائے سب لوگ مجھے شیخ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس پر ستم یہ ہے کہ میرے والدین بھی اس جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اس ننھے دل میں دنیا کے خلاف نفرت و بغاوت کے جذبات کا تلاطم پیدا ہونے لگا۔ اس نے کہا کہ دنیا دھوکہ اور فریب کا گھر ہے۔ جھوٹ' نمائش ریاکاری اور دغابازی لوگوں کا شیوہ ہے۔ بچہ تھا بڑا ذہین اور حساس اور ماحول بڑا قدیم طرز کا ہونے کے علاوہ تکلفات سے لبریز تھا۔ نفسیاتی نتیجہ یہ ہوا کہ طٰہٰ حسین کو دنیا والوں سے سخت نفرت ہونے لگی اور والدین بھی اس تیر کا ہدف بننے سے بچ نہ سکے۔ اپنے ماحول کے خلاف یہ جذبہ بغاوت اتنا مستحکم اور مضبوط ہو تا گیا کہ علم و ادب بھی اس کا شکار ہو گئے۔ اس گوشے میں کلبیت اور باغیانہ جذبات تنقید جدید کی صورت میں رونما ہو کر ہر حسین و جمیل اور قدیم و متبرک چیز کو تخریب و بربادی کے ہاتھوں مسمار کر دینے پر تلے نظر آنے لگے۔ وہ نفسیاتی اثرات کے ماتحت مجبور ہو گیا کہ ہر پرانی

روایت کو جھوٹ کا پلندا قرار دے۔ اس کے نزدیک ہر قدیم فلسفہ اور ہر پرانا عقیدہ خرافات سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا۔

باپ کی سخت گیری اور سنگدلی نے طٰہٰ حسین کے دل میں والدین کے خلاف غیر شعوری طور پر نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کر دیئے۔ اس کے ساتھ استادوں کے طرز عمل نے مصری مدرسوں اور مکتبوں نیز طریق تعلیم کے خلاف بغض و عناد کی زبردست لہر پیدا کر دی۔ مکتب اور استاد کے خلاف غیظ و غضب کے وفور کا یہ عالم تھا کہ طٰہٰ حسین لڑکوں کی بھری محفل میں استادوں کو بے نقط سنایا کرتا تھا۔

خدا کا کرنا ملاحظہ ہو کہ ان حالات کے ہوتے ہوئے پھر ایک مرتبہ طٰہٰ حسین کو تجوید اور قراءت قرآن کو شوق دامن گیر ہوا اور چند ماہ تک قرآن مجید کی تجوید سیکھتا رہا۔

تحصیل علم

بارہ تیرہ برس تک مقامی مکتب میں استادوں کے سامنے زانوئے تلمذ کرنے کے بعد جامعۂ ازہر قاہرہ میں داخل ہو گیا اور ۱۹۱۲ء تک دنیا کی اس قدیم یونیورسٹی میں تحصیل علم کرتا رہا۔ اس عرصے ابو تمام کا حماسہ، مبرد کی الکامل اور ابو علی القالی کی امالی پر خوب عبور حاصل کر لیا۔ زمانۂ قیام ازہر میں شیخ سید علی مرصفی کی صحبت میں علمی و ادبی ذوق نے بڑا نمو پایا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۹۰۸ء سے جامعۂ مصریہ کے سبقوں میں شرکت کرنے لگا۔ جامعہ ازہر سے فراغت کے بعد تمام وقت جامعۂ مصریہ میں تحصیل علم کی نذر ہوتا رہا۔ اس دوران عربی ادب، لغت، فقہ منطق، اصول صرف و نحو اور بلاغت کی تحصیل و تکمیل کر لی۔

اساتذہ مغرب کا اثر

ایک طرف طٰہٰ حسین طبعی ذہانت اور نفسیاتی اثرات کے ماتحت پرانے انداز و اسلوب کے خلاف باغی ہو چکا تھا۔ دوسری طرف جامعۂ ازہر قدیم مدرسہ فکر کی ترجمان تھی۔ اور اس کے مقابلے پر جامعہ مصریہ جدید افکار و خیالات کی حامل۔ جامعہ مصریہ میں مغرب کے فاضل علما کے ایک طبقہ کی موجودگی طلبہ کے لیے نئی ادبی قدریں اور فنی اور

علمی راہیں کھول رہی تھی یہ سب چیزیں طٰہٰ حسین پر کچھ اس طرح اثر انداز ہو رہی تھیں۔ کہ وہ زمانہ طالب علمی سے اپنے وقت اور ماحول سے بہت آگے نکل گیا۔ قدرت کے کھیل بھی کیا خوب ہیں۔ اگر اس نے بینائی سے محروم کر دیا تو بصارت کی کمی کو پورا کرنے کے لیے شوخی اور حاضر جوابی کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ ایسے تیز طراز طالب علم سے قدیم وضع کے اساتذہ کب خوش رہ سکتے تھے۔ جامعۂ ازہر کے معلمین اس کے الٹے سیدھے سوالوں اور اعتراضات سے تنگ آ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے بیک بنی و دوگوش پکڑ کر جامعہ ازہر سے باہر نکال دیا۔ یہ حریت فکر کی پاداش میں کوئی بہت بڑی سزا نہ تھی۔ ازہر یونیورسٹی سے تعلقات منقطع ہو جانے کے بعد طٰہٰ حسین کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ حکومت کی بنا کردہ جامعہ مصریہ میں مستقل طور پر منتقل ہو جائے۔ اس یونیورسٹی میں مشہور مستشرقین مغرب کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ اطالوی پروفیسر نیلینیو، الانوی، فاضل پروفیسر لٹ من اور پروفیسر سٹیلینہ کی زیر نگرانی علمی تحقیقات کے میدان میں کمال کر دکھایا اور ۱۹۱۴ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند امتیازی شان سے حاصل کی۔ طٰہٰ حسین پہلا طالب علم تھا جس نے جامعۂ مصریہ سے ڈگری حاصل کی۔ اس ڈگری کے لیے طٰہٰ حسین کے تحقیقی مقالے کا عنوان "ابو العلا" المعری کی شاعری تھی۔ بعد ازاں اس مقالہ کو ۱۹۱۵ء میں زیور طباعت سے آراستہ کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ اس میں پانچ باب ہیں۔ پہلے اور دوسرے باب میں ابو العلا معری کا زمانہ اس کا عہد، علم و ادب اور ذاتی حالات سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرے میں اس کی ادبی خدمات، چوتھے میں اس کے علمی کارنامے اور پانچویں میں اس کا فلسفہ قلم بند کیا گیا ہے۔

فرانس میں

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی علمی قابلیت اور ذہنی استعداد کے پیش نظر حکومت مصر نے اسے ۱۹۰۴ء میں وظیفہ دے کر تکمیل علم کی خاطر فرانس بھیج دیا۔ پیرس پہنچ کر اس ہونہار طالب علم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ فرانسیسی زبان سیکھی۔ ساتھ ہی یونانی اور لاطینی زبانوں میں بھی خوب دسترس حاصل کر لی۔ بعد ازاں ساربون یونیورسٹی میں داخل ہو کر

فلسفہ اور تاریخ قدیم کا مطالعہ شروع کر دیا اور ابن خلدون کے فلسفۂ اجتماع پر فرانسیسی زبان میں ایک تحقیقی اور تنقیدی مقالہ سپرد قلم کر کے پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کر لی۔ قیام پیرس کے زمانہ میں ایک فرانسیسی لڑکی سے بیاہ کر لیا۔ جس کے بطن سے اولاد بھی ہوئی۔

پروفیسری

جب ڈاکٹر طٰہٰ حسین ۱۹۱۹ء میں مصر واپس آیا تو قدیم مصری یونیورسٹی میں تاریخ قدیم کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ اس حیثیت میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو جامعۂ مصر میں عربی ادب کا پروفیسر بنا دیا گیا اور مدت تک اس یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتا رہا۔ پھر حالات غیر موافق ہونے کی وجہ سے استعفا دینے پر مجبور ہو گیا۔

بحیثیت صحافی

وطن واپس آنے کے بعد ڈاکٹر موصوف کے سامنے علم و ادب کا ایک وسیع میدان تھا۔ شروع شروع میں اس نے اشہب قلم کی ترکتازیوں اور سمند فکر کی جولانیوں کے لیے ڈاکٹر محمد حسین ہیکل کے "جریدۃ السیاسۃ" کو منتخب کیا اور اس میں ادبی و سیاسی مقالات لکھنے شروع کیے۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان مقالات کی دھوم مچ گئی۔

ادب و نقد

فنی اعتبار سے طٰہٰ حسین میں کئی خوبیاں ہیں۔ وہ صنعت کی نسبت فن کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک۔ ادبی قدر و قیمت اور افادی زاویہ نگاہ سے موضوع کو شرف اولیت حاصل ہے اور عبارت کو ثانوی حیثیت۔ ہمارا یہ نابینا ترقی پسند ادیب پرانی طرز کے عربی ادیبوں سے بہت ممتاز اور بلند ہے۔ پرانے ادیب قدیم عربی ادب کے تنگ دائرے سے باہر قدم نہ رکھ سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں نے شاندار قصیدے لکھے۔ ان کے الفاظ میں شان و شکوہ اور جملوں میں بانکپن بھی موجود ہے، لیکن

ان کی معلومات محدود، ان کا انداز فرسودہ اور ان کے خیالات و افکار میں جدت و ندرت کا فقدان ہے۔ جب وہ اجتماعی مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں تو جمہور کے جذبات کی ترجمانی کرنے سے یکسر قاصر نظر آتے ہیں۔

ان کے مقابلے پر طٰہٰ حسین مغربی زبانوں کو اسی سہولت اور آسانی سے سمجھتا ہے جس طرح عربی کو۔ وہ فرانس کے جدید شاعروں پر اسی روانی اور سلاست سے لکھتا ہے جس طرح عربی شاعروں پر۔ یونانی فلسفیوں کے نظریے اور ان کی علمی کاوشیں اس کے سامنے ہیں اور مغرب کے تنقیدی معیارات اس کے پیش نظر۔ یہ درست ہے کہ پرانے ادیبوں جیسے پر شوکت الفاظ اس کے ہاں ناپید ہیں۔ وہ شعر و شاعری بھی نہیں کرتا۔ اس کے باوجود وہ عربی علوم و فنون سے پوری طرح آگاہ ہے۔ جدید تقاضوں اور اجتماعی و سیاسی گتھیوں کو خوب سمجھتا ہے۔ اسے تنقید جدید میں پوری مہارت حاصل ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اب ادب اور ادبی قدریں مقامی نہیں رہیں، بلکہ جغرافیائی اور ملکی حدود کو توڑ کر عالمگیر ہو گئی ہیں۔ طائر فکر کی پرواز سے تمام قیود اور پابندیاں اٹھا دی گئی ہیں۔ اب مشرق و مغرب کی وسعتیں اس کے پر پرواز کے لیے ہیں۔

طٰہٰ حسین جمہور کی زبان میں لکھتا ہے اور انسانوں کو سمجھنے کے لیے بولتا ہے۔ اس کے الفاظ کی قدر و قیمت یہی ہے کہ لوگ بآسانی سمجھ سکیں، نہ یہ کہ تقریر و تحریر ایک معمہ بن کر رہ جائے۔ اس کے ہاں خیالات کی جدت کے ساتھ نئے مضامین کی فراوانی موجود ہے۔ وہ مسائل حاضرہ پر لکھتے وقت اجتماعی تقاضوں کو نہیں بھولتا۔ طٰہٰ حسین کی تحریر میں ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے ہاں پرانے ادیبوں کا حسن و جمال اور جدید انشا پردازوں کی سلاست موجود ہے۔

اس کا مطمح نظر یہ ہے کہ علم و ادب کو مغربی زاویوں سے دیکھا جائے۔ زندگی اور ادب کے درمیان ایک تعلق اور لگاؤ پیدا کر دیا جائے۔ جدید تنقیدی معیاروں سے عربی ادب اور تاریخ کو جانچا جائے۔ اس کے علاوہ صفائی اور پاکیزگی کا جذبہ اور خیالات کی آزادی طٰہٰ حسین کے ادبی انداز کو بلند کر دیتی ہے۔

بے باکی

مصر کے مشہور ادیب اور نقاد سلامہ موسیٰ کا خیال ہے کہ طٰہ حسین کا اخلاص اسے دوسرے ادیبوں سے بہت ممتاز بنا دیتا ہے۔ مصری ادیبوں میں طٰہ حسین رندانہ جرات کا مالک ہے۔ جو کچھ سوچتا ہے بڑی بے باکی سے کہہ دیتا ہے اور لکھتا وہی بات ہے جو اس کے ذہن میں درست ہوتی ہے۔ وہ مطلق پروا نہیں کرتا کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کے نزدیک حق گوئی میں علم و ادب کی روح برقرار ہے۔ وہ اس طریق کار کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل تصور کرتا ہے۔

تاریخ عالم میں ڈاکٹر طٰہ حسین نے پھر ایک مرتبہ یہ ثابت کر دیا کہ آنکھوں کی محرومی کے باوجود ہر قسم کے علم و فن کی تحصیل عین ممکن ہے۔ یہ درست ہے کہ آنکھیں بڑی نعمت ہیں اور خود ڈاکٹر موصوف نے بھی اس چیز کو محسوس کیا۔ وہ تاریخ پڑھاتے ہوئے کبھی کبھی یہ کہا کرتا تھا: کاش میں اس قابل ہوتا کہ آثار قدیمہ کو جا کر دیکھوں اور عمارتوں اور کھنڈرات سے اپنی تاریخی معلومات میں اضافہ کروں، مگر اس کے باوجود اس نے عملی طور پر دکھا دیا کہ بصارت کی محرومی عزم و ارادہ کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔

خطابت

ڈاکٹر طٰہ حسین مصر میں بہترین مقرر اور خطیب خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی شعلہ مقالی اور جادو بیانی کی اتنی دھوم ہے کہ اس کی تقریر سننے کے لیے لوگ کارواں در کارواں آتے تھے اور بڑے سے بڑا بھی ہال کچھا کچھ بھرا ہوا ہوتا تھا۔ ہجوم اور بھیڑ کی کثرت کے سبب پولیس کو اکثر مداخلت کرنا پڑتی تھی۔

نظریئے

ڈاکٹر طٰہ حسین کا خیال ہے کہ سائنس اور جدید تحقیق و تفحص کے میدان میں ہمیں مغرب کو اپنا استاد بنانا چاہیئے، مگر فن، ادب اور اجتماعی اور معاشرتی مسائل میں ہمیں اپنی آزادی اور انفرادیت نمایاں طور پر قائم رکھنی چاہیئے، کیونکہ ہم ایک مستقل

ادب، فن اور معاشرہ کے مالک ہیں۔

اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ مذہب اور سیاست کی حدود الگ الگ ہیں۔ اس کے نزدیک مذہب ایک ذاتی اور انفرادی معاملہ ہے، لیکن سیاست ایک اجتماعی مسئلہ ہے۔ مذہب کو سیاست اور سائنس کے معاملات اور حدود میں دخل نہیں دینا چاہیے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے ادبی رجحانات اور تنقیدی میلانات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس اصلاحی اور سیاسی ماحول کو نظرانداز نہ کیا جائے جو مفتی محمد عبدہٗ اور ان کے رفقائے کار کی بدولت مصر میں پیدا ہو چکا تھا۔ ان کا لائحہ عمل دینی اور اجتماعی اصلاح تھا لیکن ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا ادبی اور تنقیدی۔ دونوں اپنے ملک اور زبان کے معیار کو بلند کرنا چاہتے تھے، لیکن طریقے دونوں کے مختلف تھے۔ البتہ ایک چیز بڑی اہم ہے کہ مفتی محمد عبدہٗ اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین دونوں مغربی زبانوں کے جاننے پر بہت زور دیتے ہیں۔ اگرچہ دونوں کا زاویہ نگاہ الگ الگ ہے۔ مفتی اور ان کا مدرسہ فکر تو اقوام مغرب سے رابطہ قائم کرنے کے لیے مغربی زبانوں کی اہلیت کو سیکھنا ضروری خیال کرتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے بہت سی کتابیں اور بے شمار علمی و ادبی مقالات شائع کیے ہیں اس کی ایک کتاب یعنی اسلام سے پہلے کی عربی شاعری کی اشاعت پر بڑا شور و غل ہوا۔ کفر کے فتوے صادر کیے گئے۔ حکومت سے رابطہ کیا گیا کہ اس کتاب کے مصنف کو یونیورسٹی کی ملازمت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اس کی مشہور کتابوں میں شعرالجاہلی، ذکری ابی العلاء، الایام، قادۃ الفکر، حدیث الاربعاء، قصص تمثیلیہ، فصول فی الادب النقد مع المتنبی اور الفتنۃ الکبری قابل ذکر ہیں۔

وزارت تعلیم

۱۹۵۰ء کے نصف اول میں نحاس پاشا کی وزارت میں قلمدان وزارت تعلیم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو سونپا گیا۔ اس مختصر عہد وزارت میں طٰہٰ حسین نے یورپ اور امریکہ کے کئی سفر کیے اور وہاں کی علمی و سیاسی مجلسوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔

☆ (طٰہٰ حسین کے محاسن علمی میں جامعہ اسکندریہ (۱۹۴۲ء) اور جامعہ عین شمس

کی تاسیس بھی شامل ہے۔ اول الذکر یونیورسٹی کا وہ ڈائریکٹر بھی رہا۔ اسے اس کی علمی مہارت کے اعتراف میں ۱۹۵۰ء میں "وزیر معارف" بھی تعینات کیا گیا۔ اس کا انتقال ۱۹۷۳ء میں ہوا (مرتب)

مقالات

پروفیسر عبدالقیوم رحمۃ اللہ علیہ

جلد اوّل

علمی و تحقیقی

ترتیب

ڈاکٹر محمود الحسن عارف ✿ میجر (ر) زبیر قیوم

ناشر

المکتبۃ السلفیۃ

شیش محل روڈ، لاہور ۵۴۰۰۰